نیرنگ خیال

ستمبر ۱۹۳۲ء اکتوبر

اقبال نمبر

قیمت عہ دو روپے علاوہ محصول —— مستقل خریداروں سے عہ علاوہ محصول

(مطبوعہ کریمی پریس لاہور بیرون دروازہ شیرانوالہ سرکلر روڈ باہتمام حکیم محمد یوسف حسن پرنٹر پبلشر دفتر رسالہ نیرنگ خیال شاہی محلہ لاہور سے شائع ہوا) [illegible]

نیرنگ خیال

۶۰۰۰

ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۱۲ — بابتہ ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء — نمبر ۹۹ / ۱۰۰

ایڈیٹرز:۔ بدر الدین حسن ۔ حکیم محمد یوسف حسن

فہرست

اقبال نمبر قیمت دو روپے محصول ڈاک وفیس رجسٹری ۶؍ مستقل خریداروں سے ۱؍ محصول ڈاک ۶؍
چندہ سالانہ تین روپے چھ آنہ۔ مع اقبال نمبر ۱۲؍ بذریعہ وی پی ۱؍ اللعہ

بقیۂ فہرست

شذرات

نیرنگِ خیال کا اقبال نمبر

ہمارے صفحہ اول کا یہ اعلان کہ "ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا" محض اس لئے روک دیا گیا ہے۔ کہ اس سے ہمارے بعض معاصرین کے قلوب پر ٹھیس لگتی تھی۔ ہمارا مسلک صلح کل ہے۔ اور ہم اپنے معاصرین کا احترام کرنا اور انکی علمی ادبی سرگرمیوں کی قدر کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر آج زیر مطالعہ نیرنگ خیال "اقبال نمبر" اس حقیقت کو دہرائے تو اسے معذور رکھا جائے!

نیرنگِ خیال ہندوستان کا واحد مجلۂ علمیہ ادبیہ ہے۔ جسنے رسائل کے لئے ایک جدید شاہراہِ عمل پیش کر کے کامیابی کی منزل پر پہونچنے کی کوشش کی ہے۔ اس جدید شاہراہ عمل میں خاص نمبروں کی ایجاد بھی اسی کا حصہ ہے۔ ہمارے دوست اور دشمن دونوں کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ نیرنگ خیال کے خاص نمبر واقعی لاجواب اور بے مثل ہوتے ہیں۔ ان خاص نمبروں کی اشاعت سے نیرنگ خیال کے ناظرین کی ذہنی تربیت کا سامان بہم پہونچایا جاتا ہے۔ اور ملک کے لئے ایک ایسا لٹریچر فراہم کیا جاتا ہے۔ جو آئیندہ نسلوں کے درس و تدریس کے سلسلہ میں شمع ہدایت کا کام دے گا۔

اقبال نمبر کا اعلان بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ جو ہم ناظرین کے سامنے ڈیڑھ دو سال سے برابر پیش کر رہے تھے۔ ابتدا میں یہ خیال تھا کہ کسی ایک مہینہ کا پرچہ چند کاپیوں کے اضافہ کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ لیکن پبلک نے اس اعلان کے بعد جس دلچسپی کا اظہار کیا وہ محتاج بیان نہیں۔ دفتر میں

اس قسم کے خطوط بکثرت موصول ہوتے رہے - جن میں اقبال نمبر کو دو ماہ یا تین ماہ کا مشترکہ نمبر بنا کر ممدوح کے شایان شان بنانے پر اصرار کیا جاتا تھا - اس لئے ہم اپنے ناظرین کو وعدہ فردا پر ٹالتے رہے - اور پورے تفکر اور تدبر سے اقبال نمبر کو کامیاب بنانے میں کوشاں رہے!

اگر نیرنگ خیال دو ماہ کا یکجا شائع کیا جاتا تو اس کا حجم ۲۰۰ صفحات ہوتا - تین ماہ کا حجم ۳۰۰ صفحوں تک ہو سکتا تھا - لیکن اس حجم میں بھی اقبال کی شاعری کی مختلف اشکال بے نقاب نہ ہو سکتیں - اندازہ کیا گیا تھا کہ اس عنوان پر نیرنگ خیال کم از کم چار سو صفحات کا مواد پیش کر سکتا ہے - گو اس کے بعد بھی اقبال کا کلام ہر پہلو سے تشنہ رہ جائے گا۔

حجم کا سوال طے ہو جانے کے بعد سائز کا سوال پیش ہوتا ہے - ہم ہمیشہ بڑے سائز کے دلدادہ اور شائق رہے ہیں - نیرنگ خیال کے سالنامے اور خاص نمبر اس کے شاہد ہیں - لیکن ہمیں اس حقیقت کا بھی علم تھا کہ وہ بالآخر رسالہ کی حیثیت ہی رکھتا ہے - اقبال نمبر کو بالکل جداگانہ حیثیت حاصل ہے - یہ تو ایک مستقل تصنیف ہے جو صرف ایک ہی موضوع کے مختلف پہلوؤں کی تشریح کرتی ہے - اس لئے اس تصنیف کو علامہ سر اقبال کی دیگر تصنیفات ہی کے سائز پر پیش کیا جائے!

علامہ موصوف کی بیشتر تصنیفات $\frac{20 \times 26}{8}$ سائز پر شائع ہوتی ہیں - اس لئے یہی سائز ہم نے اقبال نمبر کیلئے پسند کیا - اور آج ہم آپ کی خدمت میں ایک نہایت خوبصورت کتاب پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہے ہیں - جو آپ کی لائبریری کی زینت ہو گی اور جسے آپ کی آئندہ نسلیں بھی حرز جاں بنائیں گی۔

نیرنگ خیال کا یہ خاص نمبر کتابی صورت میں شائع کرنے پر ہمیں زیادہ اخراجات برداشت کرنے پڑے ہیں - اور ہزار قسم کی تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا ہے - اس لئے اگر اس میں کسی قسم کی کمی نظر آئے تو ہمیں معذور سمجھا جائے۔

اقبال نمبر کے مضامین - اقبال نمبر کے اعلان اور اس کے لئے دو ماہ کی قلیل مدت کو کافی سمجھنا ہمارے

اندازے کی غلطی تھی - جس کا ہمیں اعتراف ہے - اگرچہ ہم اس نمبر کی تیاری ایک ماہ قبل شروع کر چکے تھے مگر یہ تین ماہ بھی اس علمی پرچہ کے لئے قطعاً ناکافی تھے - اقبال نمبر کے لئے مضامین حاصل کرنے کے لئے ہم نے بہم صبح کی ڈاک میں متعدد خطوط لکھنا اپنا وظیفۂ عمل قرار دے لیا تھا - ہندوستان کے ہر گوشہ میں ہماری صدا گونجی - لیکن تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ ایسے پرچہ کے لئے کم از کم ایک سال قبل سلسلۂ "گفت و شنید" شروع کرنے کی ضرورت تھی - بڑے بڑے متبحر عالم اور مستشرق - جو ایسے ٹھوس عنوان پر مضامین لکھا کرتے ہیں ان کیلئے ایک دو ماہ کی مدت کوئی معنی نہیں رکھتی ؛

ادبی مضامین لکھنے والوں اور علمی محققین میں زمین و آسمان کا فرق ہے - ہندوستان کے مشہور ادیب تو اقبال کا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھنے لگتے ہیں - اقبال پر لکھنا گویا اقبال کی تمام ضخیم تصنیفات کو از سر نو مطالعہ کرنا اور پھر غور و فکر کے میدان میں ہفتوں اور مہینوں سرگرم کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا کرتا ہے - کوئی تخیلی عنوان نہ تھا جس پر کسی ادیب کا قلم رف رف چلتا اور چند گھنٹوں میں ایک موثر اور دلکش مضمون تیار کر دیتا ہے - لیکن یہاں تو ہر مضمون کے لئے ایک نئی جوئے شیر کا لانا ہوتا ہے - ہر لفظ پر غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے - ہر اصول ہر نظریہ کو فلسفہ کی کسوٹی پر پرکھنا پڑتا ہے ؛

ہندوستان میں اقبال کو "بانگ درا" کی حیثیت سے جاننے والوں کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہوگی لیکن اقبال کو صحیح معنوں میں سمجھنے والوں کی تعداد سیکڑوں سے زیادہ نہیں - اور یہ حال دنیا کے ہر شاعر کا ہوتا ہے - لیکن اقبال نمبر کی اشاعت کے بعد توقع ہے کہ ہندوستان کا تمام تعلیم یافتہ طبقہ جوان مضامین کو غور و فکر سے پڑھے گا - اقبال کے پیغام کو سمجھے گا - اور ان میں اس امر کی تحریک پیدا ہوگی کہ وہ اسرارِ خودی - رموزِ بیخودی - پیامِ مشرق - زبورِ عجم اور جاوید نامہ کو سبقاً پڑھیں! اسلامی مدارس اور مسلم یونیورسٹی میں ان تصنیفات کو کورسوں میں شامل کرلیا جائے گا - تاکہ ہندوستان کی آئندہ نسلیں اپنے مشرقی مفکر کے فلسفہ سے بخوبی واقف و ماہر ہو جائیں - جو قوم کی حیات و جاوید کا واحد اور حقیقی نسخہ ہے!

اقبال نمبر کے تمام مضامین پر نظر ڈالنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ فرصت۔ اگر ہم ایسا اقدام کریں تو اس کے لئے مزید دو سو صفحے کے دیباچہ کی ضرورت محسوس ہوگی۔ لیکن بایں ہمہ ہمیں اپنی ناکامی کا اعتراف ہے اور ہم جانتے ہیں۔ کہ یہ جو کچھ ہے اس سمندر کا ایک قطرہ ہے۔ جو اقبال کے کلام میں موجود ہے!

ہم اُن اہلِ قلم کے ممنون ہیں جنہوں نے اس دشوار گذار منزل کو طے کرنے میں ہماری امداد کی اور ہماری ہمت بڑھائی۔ لیکن ہمیں ان احباب اور اہلِ قلم پر افسوس ہے۔ جو لکھ سکنے کے باوجود محض اس لئے نہ لکھ سکے کہ انہیں ایسے اہم عنوان پر لکھنے کے لئے کچھ محنت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ "مصروفیت" کا بوجھ کسی شخص پر مسلط نہیں ہے؟! لیکن جو کام کرنا ہوتا ہے وہ کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ تعلقات کی بنا پر ہو۔ یا معاوضہ کے خیال سے ہو۔ یا عقیدت کے جذبہ کے تحت میں!

مجھے اقبال نمبر کے سلسلہ میں اس تلخ حقیقت کا خوب تجربہ ہوا۔ کہ ہمارے بعض اہلِ قلم کس قدر سہل انگار اور کاہل الوجود ہیں!۔ جو کسی اعلیٰ جذبہ کے ماتحت بھی جنبش پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اور بعض نے تو ہماری پیہم درخواستوں کا جواب تک دینا گوارا نہ کیا۔ اور اپنے اخلاق کی نہایت اچھی مثال پیش کی۔ یہ لوگ نہیں جانتے تھے۔ کہ وہ نیرنگِ خیال پر کوئی احسان نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ اپنے سب سے بڑے مفکر فلسفی کے کلام کی پیچیدگیوں کا حل پیش کر کے ملک کو منزلِ مقصود کی طرف ایک قریب تر راستہ سے لانے میں امداد و اعانت دے رہے تھے!

اقبال نمبر کے مضامین کا حجم ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور ابھی ہمارے پاس قریباً ایک سو صفحات کے قریب مضامین موجود ہیں۔ جو جگہ کی تنگی اور وقت کی قلت کی وجہ سے درج نہیں ہو سکے۔ ان میں سے بعض ہم سالانہ یا معمولی نمبروں میں پیش کر سکیں گے۔ بعض ایسے اصحاب نے بھی مضامین بھیجے ہیں جنہیں مضامین لکھنے کی مشق تو نہیں مگر عقیدت کی بنا پر بہترین خیالات قلمبند کئے ہیں۔ ان میں بہرام خاں صاحب کا نام خاص طور پر ممتاز ہے۔

علامہ سر اقبال جب یورپ سے واپس آئے تھے۔ تو میر نیرنگ نے ایک ترانہ پڑھا تھا جسے ہم آج اقبال نمبر سالنامہ میں بطور تبرک درج کرتے ہیں؛

فصلِ بہار آئی پھر گلشنِ سخن میں　　اب جشن ہو رہا ہے مرغانِ نغمہ زن میں
وہ مژدۂ مسرت لائی صبا چمن میں　　پھولے نہیں سماتے پھول اپنے پیرہن میں
گلشن کے سبز پوشو جھٹ پٹ سنگار کر لو　　عطرِ عروس مَل دو پھولوں کے پیرہن میں
ہاں ہو نئی ادا سے سنبل کی کنگھی چوٹی　　نرگس لگائے سرمہ چشمانِ سحر فن میں
غنچوں کو حکم دیدو دیں دادِ کجکلاہی　　تیکھی ادائیں نکلیں نسرین و نسترن میں
ہر غنچہ مسکرائے ہر پھول کھلکھلائے　　ہر برگ لہلہائے رونق رہے چمن میں
ہو اہتمام ایسا آرائشِ چمن کا　　باقی رہے دقیقہ کوئی نہ بانکپن میں
سروِ سہی سے کہہ دو ناچے ذرا لبِ جُو　　قمری ترانہ گائے جلسہ اڑے چمن میں
یورپ کی سیر کر کے اقبال واپس آئے　　خوشیاں منائیں مل کر اہلِ وطن وطن میں
ہے آمدِ مسرت اقبال تیری آمد　　خوشیاں ہیں اہلِ دل میں عیدیں ہیں اہلِ فن میں
سر آنکھوں پر بٹھایا یورپ میں تجھ کو سب نے　　غربت میں بھی رہا تو گویا سدا وطن میں
پھر تیرے دم سے ہوں گے تازہ سخن کے چرچے　　پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں

اقبال نمبر کی قیمت

اقبال نمبر کی قیمت دو روپے اور محصول ڈاک ۸ مقرر ہے۔ ساڑھے چار سو صفحوں کی باتصویر کتاب اور قیمت میں بہت ارزاں دستیاب ہو رہی ہے۔ لیکن مستقل خریداروں کے ساتھ ہماری کچھ اور رعایت بھی ہے۔ اور ہم یہ نایاب تحفہ انہیں صرف آٹھ آنہ قیمت اور ساڑھے آٹھ آنے دو ماہ کا چندہ یعنی ایک روپیہ دو پیسہ علاوہ محصول ڈاک میں پیش کر رہے ہیں۔ جو ارزانی کی حد ہے۔ اسی ارزانی کی وجہ سے دفتر کو چھ ہزار اقبال نمبر کی اشاعت پر قریباً دو ہزار روپیہ خسارہ اٹھانا پڑے گا۔ یہ خسارہ صرف اس صورت میں پورا ہو سکتا ہے۔ جب نیرنگ خیال کے ناظرین ایک ایک نیا خریدار بھجوائیں جو اقبال نمبر سے چار روپے ایک آنہ کا وی پی وصول کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس طرح سے وہ رعایت بھی حاصل کر سکیں گے۔ اور سال بھر رسالہ کا لطف بھی اٹھا سکیں گے۔ اور دفتر بھی نئے خریداروں کے بڑھنے سے نقصان کی کسی حد تک تلافی کر سکے گا۔

بعض خریدار چونکہ "حساب داں" نہیں ہوتے یا دیدہ و دانستہ کم نفسی سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے وہ اقبال نمبر کا وی پی شاید وصول نہ کریں اور اس ۸ کے وی پی اور ۵ محصول کو ایک زیادتی تصور کریں اس لئے ان کی تسلی کے لئے ہم اعلان کرتے ہیں۔ کہ ان کے چندہ میں دو ماہ کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ تاکہ ان کی رقم میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہو۔ رہا یہ کہ دفتر کو جو ۵ کا نقصان وی پی کی واپسی کی صورت میں ہوا ہے۔ اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ کہ جہاں اقبال نمبر کی تیاری میں دو ہزار کا خسارہ ہوا ہے۔ وہاں اس میں چند سو روپے کا ایسے کرم فرماؤں کی وجہ سے اور اضافہ کر لیا جائے گا۔

سالنامہ کی تیاری

جس وقت ہم ستمبر و اکتوبر (اقبال نمبر) کی تیاری میں مصروف تھے۔ اور چار کاتب اس پرچہ کو لکھ رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت پانچواں کاتب سالنامہ لکھ رہا تھا۔ شاید ہندوستان بھر میں اس وقت دسمبر میں شائع ہونے والے سالناموں میں سے کسی پرچہ کی بھی کتابت اس وقت شروع نہیں ہوئی۔ ہم اپنے خاص نمبروں کی تیاری بہت عرصہ پیشتر

شروع کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عدیم النظیر کامیابی اور ہر حلقہ سے خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔ امسال ہم نے سالنامہ کا سائز اور بڑھا دیا ہے۔ اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ مضامین کی کثرت کے ساتھ وہ آرٹ کی جملہ خوبیوں کا مظہر ہو۔ اس وقت تک سحبان الہند علامہ کیفی چڑیاکوٹی۔ جناب جلیل احمد صاحب قدوائی صفوۃ اللہ بیگ صوفی۔ حضرت اختر شیرانی۔ علامہ ظفر علیخاں۔ پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر۔ ایم اے محترمہ مس حجاب اسمٰعیل صاحبہ۔ حضرت حنیف ہاشمی مرحوم۔ (غیر مطبوعہ افسانہ) حضرت عزیز لکھنوی۔ حضرت آغا حشر کاشمیری۔ حضرت آزر لکھنوی۔ سید عابد علی صاحب عابد بی اے۔ لالہ مالک رام صاحب ایم اے۔ حضرت احسن مارہروی پروفیسر مسلم یونیورسٹی۔ حضرت ابوالعلا عطا چشتی از بغداد۔ شیخ افتخار الرسول بیرسٹرایٹ لا۔ حضرت محمود نظامی۔ حضرت مشیر احمد علوی بی اے جیسے ماہرین اہل قلم کے مضامین دفتر میں موصول ہو چکے ہیں ؛

اس کے علاوہ۔ حضرت سید احمد شاہ بخاری ایم اے۔ مولانا عبدالمجید صاحب سالک بی اے۔ سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے۔ حضرت ملا رموزی۔ حضرت شوکت تھانوی۔ حضرت ادیب ملت آبادی۔ منشی پریم چند۔ جناب سدرشن۔ حضرت رشید احمد صدیقی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب۔ جیسے اہل قلم کے مضامین بھی موصول ہونے کی توقع ہے ؛

تازہ ترین ڈاک میں ابھی ابھی قاضی عبدالغفار کے معرکتہ الآرا لیلےٰ کے خطوط کی قسط موصول ہوئی ہے جو سالنامہ میں شائع کی جا رہی ہے۔ الغرض اس سال کا سالنامہ بہترین اور لاجواب تیار ہونے کا یقین کامل ہے ؛

جن اصحاب نے گذشتہ سال سالنامہ وی پی منگوایا تھا۔ انہیں ہم بلا اجازت وی پی بھیج دیں گے البتہ جن اصحاب نے گذشتہ سال وی پی وصول نہیں کیا تھا۔ یا انہیں وی پی نہیں بھیجا گیا تھا وہ اپنا نام فی الفور درج کرا دیں۔ تاکہ شائع ہوتے ہی ان کی خدمت میں وہ بھیج دیا جائے ؛

اکتوبر کے بعد آئندہ پرچہ نومبر نمبر ہے۔ جو بہترین مضامین اور تصاویر کا مرقع ہوگا! دسمبر میں سالنامہ کے علاوہ دسمبر نمبر بر تقویم نمبر کی صورت میں پیش کریں گے۔ جس کے ساتھ آئندہ سال کا کیلنڈر بھی تمام مستقل خریداروں کی نذر ہوگا۔ امید ہے کہ ناظرین ہماری کوششوں کی داد دیتے ہوئے ہماری ہر طرح سے اعانت کرنا اپنا فرض سمجھیں گے۔

اس کے بعد نیا سال نیا کام اور نئے ارادوں کا اظہار دسمبر کے پرچہ میں ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا!

(ایڈیٹر)

سر تیج بہادر سپرو کا پیغام

آپ کا خط مورخہ ۹ ستمبر ملا۔ آپ نے نیرنگ خیال کے اقبال نمبر کے لئے مجھ سے پیغام مانگا ہے۔ افسوس! کہ میں آجکل اتنا مصروف ہوں کہ اقبال کے متعلق کماحقہٗ نہیں لکھ سکتا۔ اس وقت فقط یہی کہنا کافی ہوگا۔ میں کئی سالوں سے اقبال کی فارسی اور اردو شاعری دونوں کا مخلص مداح ہوں۔ اس سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اقبال ایک عدیم النظیر شاعر ہے ایسی شگفتگی کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے فن کے اعتبار سے اور تخیل کے اعتبار سے بھی وہ اپنے ہم عصروں میں تنہا آپ اپنی مثال ہے اور معاصروں کا کیا ذکر ہے میرے خیال میں دنیا کے تمام شاعروں کی صف میں خواہ وہ کسی وقت کے یا کسی ملک کے ہوں اقبال کا درجہ بہت بلند ہے۔ بہت ہی بلند ہے۔

سپرو

لالہ گوکل چند صاحب نارنگ وزیر بلدیات پنجاب نے بھی ایک مضمون اقبال نمبر کے لئے بھیجا تھا جو افسوس ہے کہ دیر میں ملنے کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ ہم کسی آئندہ نمبر میں اسے شائع کریں گے۔

ایڈیٹر

اقبال

از جناب حامد علی خاں بی۔ اے مدیر ہمایوں۔ لاہور

سنہیں رفعت سے آنکھیں تک ملانے کا نہ تھا یارا
انہیں پھر لے اُڑی یہ کس کی تخیل سپہر آرا

گئے میراثِ آبا کھو گئے یوں ہم خاکِ حسرت پر
کہ تھا دنیا کی آنکھوں کے لئے عبرت یہ نظارا

کبھی اے نوجوانِ مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟
ترے دل کو بنایا قلبِ مسلم کس نے دوبارا

گداؤں کو جہانبانی سکھانے کے لئے کس نے
خزانہ حکمتِ گم گشتہ کا پھر پا لیا سارا

ہوئے افراد پھر احیائے ملت کے لئے قرباں
حق آگاہی تجھے بخشی خود آگاہی نے دوبارا

در آیا پھر قشونِ عشق یغمائے دل و جاں کو
ہوس کے قافلے کو لے کے بھاگا نفسِ امّارا

نقیبِ آفتابِ تازہ و تابندہ تر آیا
کہ ابھرا ہے افق سے پھر ترا ڈوبا ہوا تارا

فلک سے جا ملا پھر طاقِ قصرِ سطوتِ کبریٰ
ترا اقبال ہے اور ملتِ بیضا کا نقارا

بنایا اپنے دل کو گنجِ اسرارِ بقا جس نے
اور اس کو امتِ مرحوم کی تقدیر پر وارا

سرورِ سینۂ ملت، فروغِ دیدۂ دنیا
خدائے پاک کا پیارا، نبی کی آنکھ کا تارا

نواسازِ خودی! تیری نوا کی گونج اٹھنی ہی تھی
کہ نکھارنے لگے پھر بینوا تاجِ سر دارا

ترے ذوقِ یقیں نے کارِ سرہائے جہاں اپنے
وہی دل دیدۂ حکمت نے پایا جن کو ناکارا

ریاضِ ہند کو تو نے لہو دے دے کے سینچا ہے
ادا تو نے کیا ملت کی تقصیروں کا کفارا

گیا ہر باغِ ملت میں شمیمِ جاں فزا لے کر
ترا جوشِ اخوت اور صبا کا خیلِ آوارا

ترے سوزِ محبت کی فسوں سازی نے پگھلائے
وہ سب جس دل کہ تھے قرنوں سے تنگ سینۂ خارا

تحسینِ خراج

(از مسٹر مجید ملک بی اے ایل ایل بی ایڈیٹر سن رائز)

اے نوا سنجِ ازل اے شاعرِ والا تبار ॥ تیری خوشگوئی ہے رشکِ بلبل و دراج و سار
تیرے نغمے رقص کرتے ہیں فضائے دہر میں ॥ تیری موسیقی پہ لہراتے ہیں نخل و برگ و بار
اسقدر گرمی بیانک دو۔ اتنا سوز و ساز ॥ اک جہاں تیری بدولت ہے خرمنِ آتش سوار
تیرا ہر اک نقطہ ہے تفسیرِ رازِ زندگی ॥ معنی و مفہوم میں جوں بحرِ ناپیدا کنار

خانۂ مزدور میں افلاس و نکبت کا اندھیر **ق** عیش و عشرت سے منور محفلِ سرمایہ دار
سلطنت والوں کا استبداد و جورِ بےحجاب ॥ اور محکوموں کی غفلت باوجود حالِ زار
زہدِ مے آشام کا وہ آخرِ شب انفعال ॥ نخوت و کبر و غرورِ زاہدِ پرہیزگار
وہ سرِ بازار حسن و عشق کی رسوائیاں ॥ جنکے نظارے سے جلتے ہیں دلِ عفت شعار

الغرض جو کچھ بھی ہوتا ہے تہِ سقفِ کہن
تو نے چند الفاظ میں سب پر کیا ہے آشکار

(مجید ملک)

فریاد رسا!

(از جناب خان محمد کبیر خاں صاحب رہنما۔ جالندھر)

حیف رفت از خانۂ ما شاہد طرار ما — درس عبرت می دہد پیہم در و دیوار ما
آنکہ اکثر کرد اسرار حقیقت بے نقاب — آنکہ اکثر گشت غمخوار دل بیمار ما
قطع کرد از ما تعلق با حریفاں عہد بست — برد در بازار ایشاں رونق بازار ما
ما خموش و دم بخود در محفل امید و یاس — بیخود و بدمست در بزم رقیباں یار ما
ما غریباں گشتہ ایم سرگشتہ در صحرائے ہند — رہنمائے اہل ایراں کارواں سالار ما
اردوے بیچارہ ماند از نامرادی تشنہ کام — فارسی سیراب گشت از ابر گوہربار ما

کیست؟ کو اقبال را در بزم ما باز آورد
ہست محتاج نگاہش زخم وامندار ما

رباعی

(از جناب غلام قادر صاحب اشتر جالندھری)

خاور باشد و یا بود فانی
یا جود و نشاط و دانش ایرانی
در معنی نازکی و خوش الحانی
اینہا اقبال بود لاثانی

اقبال اکاڈیمی لاہور

(از جناب راغب حسن صاحب ایم اے ۔ کلکتہ)

"ہندوستان میں حرکت تجدید نے اپنا ممتاز ترین ظہور سر محمد اقبال کی شاعری میں حاصل کیا ہے۔ جو مغربی فلسفہ و زندگی کے ایک متین و عمیق محقق ہیں ۔ وہ تازہ سے تازہ فلسفیانہ تفکر کے ترقیات سے آگاہ ہیں۔ اور انہوں نے برگسن اور نیٹشے کے کچھ خیال کو اپنے ذاتی افکار کی دنیا میں منتقل کیا ہے۔ لیکن سر محمد اقبال اپنے زبردست علم و فضل اور وسیع مطالعہ و تحقیق کے باوجود ہرگز دوسروں کے خیالات کی آواز بازگشت نہیں ہیں۔ بلکہ امتیازی طور پر ایک اصلی (اوریجنل) مفکر و مجتہد ہیں۔ یہاں ہمیں آپکے فلسفیانہ تفکر سے تعلق نہیں۔ بلکہ مذہب اسلام کی طرف آپ کے عنان طبع سے بحث ہے۔ اپنی شاعری میں وہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ جن کی سب باتوں سے بالاتر، وہ ایک "پیغمبر عمل" کی حیثیت سے تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ اور آپ کا یہ ایمان ہے۔ کہ ایک "آئیڈیل پالیٹی" (Ideal Polity) (مثالی ہیئت اجتماع) کے اساسات صرف حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم میں دریافت ہو سکتے ہیں۔ وہ عالم اسلام (اور اسکے واسطہ سے عالم انسانیت) کی نشاۃ الجدیدہ شخصیت کے پرزور اظہار، نمو خودی اور ارتقائے نفس کے واسطہ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جہاں تک ہر فرد اپنے آپ کو ایک کامل فرد بنانے کی سعی کرتا ہے۔ اس حد تک وہ ترقی اسلام کو دنیا میں آگے بڑھاتا ہے۔ عمل کی اس تعلیم میں جیسا کہ حیات النبی تعلیم دیتی ہے۔ کوئی جگہ اس جمود و سکون کے لئے نہیں ہے۔ جو مسلم تصوف کا نمایاں و مثالی پہلو تھا۔ اور جس کا یہ مفکر سخت مخالف ہے۔ اس دماغ اعظم کا اثر مسلم نوجوان نسل پر عمیق اور وسیع

ہے۔ لیکن اس فلسفیانہ شکل کی وجہ سے جس کے واسطہ سے اُن کی تعلیم پیش ہوئی ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے۔ کہ یہ کسی منظم دینی تحریک کی اساس نہیں بن سکتی ہے"

سر طامس آرنلڈ

اسلامیک فیتھ (دین اسلام) مطبوعہ لندن ۱۹۲۸ء

مسلمانوں کی ذہنی پستی کی انتہا

کسی منظم دینی یا اجتماعی یا کلچرل تحریک کا اساس تو کجا اب تک مسلمانوں نے اقبال کو سمجھنے کی بھی پوری کوشش نہیں کی ہے۔ ابھی تک ایسے حضرات موجود ہیں۔ بلکہ ہماری قومی ادب وملی پالیسی پر چھائے ہیں۔ جن کے نزدیک اقبال محض ایک شاعر اور وہ بھی ایک پنجابی شاعر ہے۔ بعض کور دماغ تو سرے سے اُسے اردو کا شاعر ہی تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اور ان کے اُن کارناموں کے خلاف جو جرمنی۔ اٹلی۔ انگلستان میں ترجمہ ہو کر مقبول خاص ہوئے ہیں۔ عرصہ تک ردّ و قدح کرتے رہے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں۔ جن کو فہم اقبال تو کجا سیاسیات و عمرانیات کی ابجد سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مگر وہ اُس کے فلسفۂ اجتماع پر مہینوں جہاد کرتے رہے ہیں۔ یہ ہماری قومی بدمذاقی، ذہنی پستی اور ملی بدبختی کی انتہا ہے۔ کہ ہمارے باکمالوں کو دنیا مان رہی ہے۔ اور اُن کی تعلیم کی منظم اشاعت پر زور دے رہی ہے۔ مگر ہم نے اب تک منظم طور سے اُس کو سمجھنے سے ہی انکار کر دیا ہے۔

اقبال ایک آئیڈیل کا علمبردار ہے

اقبال ایک زندہ آئیڈیل کا نام ہے۔ اور یہ وہ آئیڈیل ہے۔ جس میں فرد و جماعت، مشرق و مغرب، عالم اسلام اور عالم انسانیت کی خودنمائی و خود فزائی۔ زندگی و برتر زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اقبال کبھی گمنام نہیں رہ سکتا ہے۔ اور نہ کبھی مُردہ ہو سکتا ہے۔ مگر سوال اصلی ملت کا اقبال سے کما حقہٗ استفادہ و اخذ نور کرنے کا ہے۔ اقبال اپنا وظیفۂ عمل انجام دے کر رہے گا۔ مگر کیا ملت بھی اس کی عظمت۔ جلالت و طاقت سے آگاہ ہوگی۔ اور اپنا فرض ادا کرے گی؟ اقبال جس آئیڈیل کا نمایندہ ہے۔ اس کا خاص تعلق ملت اسلامیہ سے ہے۔ کیونکہ درحصل وہ اس ملتِ وسطیٰ کو دنیا کے لئے ایک دار السلام بنانے کا آرزومند ہے۔ اور اس کو انسانیت کی تعمیر

و منزل ارتقاء یا صحیح معنوں میں مذہب ارتقاء بنتے ہوئے دیکھنے کا طالب و داعی ہے۔ اس ترجمانِ حقیقت کے شعر و بیان کی رنگین بیانی و سحر کاری کے ساتھ اس کو عامۂ ملت کے لئے جاذب و دلکش بنانے کی سعی کی ہے جو اس طرح کامیاب ہوئی ہے کہ اس نے ملت کے ایک طبقہ کو اس کا جوہر شناس بنا دیا ہے۔ مگر وہ ابھی تشنہ ہے۔ اور اُسے زبان کے ذریعہ سے علمی متانت و صحت فکری گہرائی و جامعیت اور پیغمبرانہ جوش و اثر کے ساتھ تفسیر و تبلیغ کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ عالم ہے۔ عالم مشرق۔ عالم اسلام عالم عرب اور عالم انسانیت کے موجودہ مسائل و مہمات کے حل کرنے میں مشعلِ ہدایت ثابت ہو جس کے لئے وہ موضوع و مقدر ہے!

حبل الورید ملت

اپنے آثار و روایات کی حفاظت کرنا کسی قوم کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اس لئے اس کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنے آثار و روایات کی حفاظت کرے۔ کیونکہ یہی اس کے لئے اعصابِ اجتماع ہیں۔ اور آثار و روایات ملیہ میں سب سے زیادہ حیات پرور ملت کے صاحبانِ فضل و کمال اور اُن کے شاہکار ہیں۔ ان کی حفاظت و تربیت گویا حبل الورید ملت کی حفاظت و تربیت ہے۔ ہیرو ازم یا ہیرو پرستی، قدامت پسندی یا عصبیت جنسی کی پیدائش نہیں ہے۔ بلکہ اس کا بڑا تعلق اصول اجتماعیہ سے وابستہ ہے۔ یہی باعث ہے کہ ہم قدیم و جدید تمام ملل و اقوام کے نشانات و مرسومات میں اسکو نمایاں پاتے ہیں!

ہندو قائدین کے منظم تحریکات

اس ملک (ہندوستان) میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہندو اپنے قائدین کی تعظیم و تکریم اور اُن کے کام و پیام کی حفاظت و اشاعت میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اور اس کو محض جذبۂ شخصیت پرستی سے منسوب کرنا مشکل ہے۔ بلکہ واقعات و شواہد سے یہ ماننا ضروری ہے۔ کہ اس قوم میں واقعی اب ملت پرور رہنماؤں پر نقد و تبصرہ کرنے کی قابلیت پیدا ہو گئی ہے۔ اور جو اب آزادی حاصل کرنے کی اہل ثابت ہو رہی ہے۔

ا۔ سوامی دیانند ان میں ایک مبلغ ہوا ہے۔ مگر اس قوم نے اس کو آسمانِ شہرت پر پہونچا دیا ہے اور اس کی تحریک کو جو زیادہ تر قومی عصبیت پر مبنی ہے۔ عام و عالمگیر کرنے کے لئے ملک کے طول و عرض

میں سماجوں، سبھاؤں، اسکولوں، کالجوں اور سیشنوں کا جال پھیلا دیا ہے؛

۲۔ راجہ رام موہن رائے۔ سوامی دیوکانند اور سوامی رام کرشنا بنگال جدید میں ہندو نشاۃ ثانیہ کے اول درجہ کے مبلغین میں سے ہیں۔ اور ان تینوں کی تحریکات خاص ادارات کے ایک منضبط نظام کے ساتھ چل رہی ہیں۔ بلکہ یورپ و امریکہ میں بھی اُن کے مناد پہنچے ہوئے ہیں۔ اور ہندو ملت کو سربلند کر رہے ہیں!

۳۔ سر سی وی رامن۔ سر جے سی بوس۔ اور سر پی سی رائے طبیعات۔ نباتات اور کیمیا کے شہرۂ آفاق آئمہ ہیں۔ ہندو قوم نے اُن کے فضل و کمال کو اپنی ملت کے تاج کا طرۂ امتیاز بنا لیا ہے۔ اور اُن کے کارناموں کی عالمگیر اشاعت کے لئے علی الترتیب (۱) انڈین ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف سائنس (۲) بوس انسٹی ٹیوٹ اور (۳) بنگال کیمیکل ورکس کلکتہ کی منظم و منضبط ادارات قائم کر لیا ہے۔

۴۔ بنکم چندر چٹرجی۔ بھنڈارکر۔ آسوتوش مکرجی اور ٹیگور۔ عہد جدید کے ... ادب علم و تعلیمات میں ممتاز ہستیاں ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ اس بیداری ... نسل جاری رکھنے اور اُن کی روایت کو ملت بنانے کے لئے "بنکم پاریشد" ... ٹیگور سوسائٹی۔ بھنڈارکر ... اور آسوتوش ہال۔ آسوتوش چیئرز۔ آسوتوش ڈے (یوم تعطیل) آسوتوش سانکیرتن۔ ورنہ معلوم کتنے دستورات تقریبات اور ادارات قائم کر رکھے ہیں۔ مقصد سب کا یہ ہے کہ کسی طرح اُن کا نام، کام، اور پیام، ہر ہندو نوجوان کی رگ اور خون کا جزو لاینفک بن جائے۔ حتیٰ کہ بنگال کا شاید ہی کوئی اسکول ایسا ہوگا۔ جس میں بنکم ... نے خود بول پور میں اپنے کام کی عالمگیر اشاعت کے لئے بہترین ہندو دماغوں اور چند مغربی حضرات کی معیت میں ایک خاص ادارہ بنام وشوا بھارتی سبھا ایک تعلیمی و ثقافتی یونیورسٹی۔ کئی کلچرل مجالس و مجلات کے ساتھ قائم کر رکھا ہے۔

۵۔ بال گنگا دھر تلک۔ گوکھلے۔ داس اور گاندھی اس عہد میں ہندو سیاسی بیداری کے امام ہیں اور آج مہاراشٹر۔ پونہ۔ کلکتہ اور احمد آباد میں اُن کے مخصوص سیاسی و مذہبی خیالات و مقاصد کی تبلیغ کیلئے

مخصوص ادارات۔ مضبوط پریس کے ساتھ قائم ہیں۔

منظم ادارات اور مستقل تحریکات

اور ہندو سیٹھ اور مہاجن قوم پرستی کے لاکھوں اور کروڑوں روپیہ سے اُن کی مدد کر رہے ہیں۔

میں نے یہ تمام تذکرہ بہ ایں بحث ہندو ملت کی تحسین و آفرین اور مسلم ملت کی عبرت آموزی کے لئے کیا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ملت اسلامیہ نے ایک زمانہ میں دنیا کو درس تہذیب دیا تھا۔ مگر وہ آج خود ہندو قوم سے فضل پروری و کمال دوستی کا درس حاصل کرنے کے لئے مجبور ہے۔ ہندو قوم نے تمدن جدید کی اس ضرورت اور اصل کو بخوبی سمجھ لیا ہے کہ کوئی اعلیٰ و مستحکم کام ایک نسل میں پورا نہیں ہو سکتا ہے۔ صاحبان فضل و کمال محض اعلیٰ تحریکات کی بیج بوتے ہیں۔ اور یہ قوم کا فرض ہے کہ اُن کی تخم ریزی کی نسل در نسل، قرن در قرن [illegible] کاشت۔ تربیت۔ پرورش، اور حفاظت و ترقی کا کام جاری رکھے۔ بڑوں کے کام کو مستقل تحریکات بنانا اور اُن کو نسل و نسل ضروریات زمانہ کے مطابق دائم و قائم رکھنے کے لیے منظم ادارات کی بنیاد ڈالنا [illegible] ہے۔ قوموں کے استحکام و استقلال کا یہی راز ہے!

میں ملت اسلامیہ سے جس میں اقبال پیدا ہوا ہے۔ یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اُس نے اپنے سرسیدؒ۔ قاسمؒ۔ شبلیؒ۔ اجملؒ۔ جوہر[1] اور اقبال کے کام اور پیام کو نسل در نسل قائم رکھنے اُن کو مستقل تحریکات بنانے اور اس مطلب کے لئے منظم ادارات کی بنا ڈالنے میں کچھ کیا ہے؟ حالانکہ اُس کا دعویٰ ہے۔ وہ ایک عالمگیر ملت ہے۔ انسانیت کی مداوا اور دنیا کی تقدیر ہے؟

ہماری ذہنی پستی اور اغیار کی قدردانی

یہ بڑے ہی شرم کی بات ہے کہ ہم جوہر کے جوہر سے اس وقت کچھ آگاہ ہوتے ہیں۔ جب وہ ہمارے ظلموں اور غفلتوں سے بیزار و خستہ ہو کر غریب الوطنی میں ہم پر قربان ہو جاتا ہے۔ اور یورپ اُس کو "ایک عظیم الشان ہندوستانی ایک عظیم الشان مسلم اور ایک عظیم الشان پیامبر انسانیت" کہتا ہے۔ اور قدس کے حرم میں ایشیا۔ یورپ اور

[1] مولانا محمد علی مرحوم ۱۲

افریقیہ کی گردنیں اس کی نعش پر فرط الم سے جھک جاتی ہیں۔ ہم اقبال کے نیر اقبال کی درخشندگی سے اس وقت کچھ خبردار ہوتے ہیں۔ جب جوسف بل المانی اس کے ایک کارنامہ کو عہد جدید کا سب سے حیرت ناک "حادثہ" یا **Phenomenon**, کہتا ہے۔ اور کیمبرج یونیورسٹی اپنے اس روشن ستارہ کو نذر عقیدت پیش کرتا ہے۔ اور اٹلی کا بے تاج بادشاہ سوپرمین مسولینی اس سے درس خودی و بے خودی حاصل کرتا ہے۔ اور اٹالین اکاڈیمی اس کی شان میں تقریب خاص مناتی ہے!

کیا یہ فرق اس لئے ہے۔ کہ ہم بحیثیت ملت بڑائی کی قدر کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔ اور اس لئے اس کے اہل بھی نہیں ہیں؟

بہرکیف اب ہمیں سوچنا چاہئے۔ کہ ہم کیا کرسکتے ہیں اور کیا کرنا چاہئے۔ یہ کتنے بڑے افسوس کی بات ہے کہ حضرت علامہ اقبال لندن۔ کیمبرج۔ روم۔ قاہرہ اور قدس میں عالیشان خطبات ارشاد فرماتے ہیں۔ جس پر حکما مغرب و علمار مشرق اظہار حیرت زدگی کرتے ہیں۔ مگر اس کا ایک لفظ بھی مستند شکل میں دنیا کے سامنے نہیں آتا ہے۔ اور نہ اصل یا نقل اردو یا انگریزی میں شائع ہوتی ہے۔ حالانکہ ایک ملت بیدار کا یہ فرض تھا۔ کہ اقبال کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرہ کو مستندترین ذرائع سے حاصل کرکے جمع کر دیتی۔ اور کم سے کم اردو اور انگریزی دنیا کے لئے تو عام اور قابل حصول بنا دیتی۔

اقبال اکاڈیمی کی ہیئت

میرے خیال میں اس کی ایک صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ لاہور میں جو علامہ اقبال کا دوسرا وطن ہے۔ ایک مستقل انسٹی ٹیوشن اپنی ذاتی زمین و باغ و عمارات کے ساتھ بنا کر اور "اقبال اکاڈیمی" سے موسوم کرکے حضرت علامہ سر محمد اقبال کو قوم کی طرف سے پیش کیا جائے۔ اقبال اکاڈیمی کا ایک دستور اساسی اور ایک ہیئت ترکیبی ہو۔

وظائف و مقاصد

اقبال اکاڈیمی کی اساسی وجہ زیست اقبال کے کام اور پیام کی تفسیر و تبلیغ اور اس کے آثار و اخبار

ایک یادگار تصویر



شاہی مسجد لاہور میں علامہ اقبال جنگ طرابلس کے موقعہ پر اپنی مشہور نظم پڑھ رہے ہیں۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

عطیہ ایم۔ ایم اسلم۔

کی جمع و ترتیب ہوگی۔ اور مقصود عمومی اسلامی کلچر کی حفاظت و ارتقا ہوگا۔

گویا یونٹی کلچرل ادارات ملیہ کے نظام کی ایک مرکزی کڑی ہوگی۔ جس کی تجویز علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور ۱۹۳۲ء کے خطبۂ صدارت میں ملتِ اسلامیۂ ہند کے تہذیبی احیاء کے لئے کی ہے۔

اقبال اکاڈیمی کا وظیفۂ اول اقبال کے افکار و تعلیمات اور سوشل۔ پولٹیکل اور ایکانامیک مطمحِ نظر کی تفسیر خود اُن کے زیر ہدایت ہونا چاہیے۔ اُن سے خاص موضوعات پر خطبات و ارشادات حاصل کرنا اور اُن کے ملفوظاتِ گرامی کو بالالتزام اردو و انگریزی رسائل کی شکل میں حسن طباعت کے ساتھ شائع کرنا بھی اس میں داخل ہے۔

اکاڈیمی کا دوسرا وظیفہ اقبال کی تصنیفات نظم و نثر، متفرق مقالات کو مستند طریق پر ضروری مقدمات و تعلیقات کے ساتھ مکمل و مہذب صورت میں شائع ہونا چاہئے۔ جس طرح شبلی اکاڈیمی اعظم گڑھ علامہ شبلی کے رشحاتِ قلم کو شائع کر رہی ہے۔

اکاڈیمی کا تیسرا وظیفہ علامہ سر محمد اقبال کی پرائیویٹ اور پبلک لائف سے متعلق آثار و نشانات و تبرکات کی ایک میوزیم کا قیام ہونا چاہئے۔ تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے وہ تمام تبرکات محفوظ ہو جائیں۔ جو آزاد و ترقی یافتہ ملتوں نے اپنے ابطال کے فکر و عمل کی جمع کی ہیں۔ اور ایک روز اقبال کی جمع کرنا چاہے گی مگر یہ کام جو کہ آج آسان ہے نہایت مشکل و ناتمام ہوگا۔

اکاڈیمی کا چوتھا وظیفہ شرق و غرب کے متوازی الفکر ارواح سعیدہ ([illegible] souls) کی برادری کے مشترکہ پلاٹ فارم کا کام دینا اور اتحاد اسلام و اتحاد عالم کی تحریک کی پیش رفت ہونا چاہیے۔

اقبال اکاڈیمی لاہور کا پانچواں اور سب سے اہم بالشان وظیفہ اس کے نام کے دو ضروری اجزا یعنی (۱) اقبالیت اور (۲) اکاڈیمیت سے ظاہر ہے۔

"اقبال" جیساکہ مذکور ہوا۔ ایک آئیڈیل کا نام ہے۔ اور اس ادارہ کا سب سے بڑا کام چیدہ سعید و صالح نوجوانوں کو اس آئیڈیل کی روح میں تربیت و تعلیم دینا ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ اس آئیڈیل اس

تثلیث وسطیٰ اور اس مذہب انسانیت کے مبلغ و منادین کر پھیل جائیں۔ جس کے لئے اقبال کا ظہور ایک عالم ہونکی صبح صادق کے مخبر صادق کی شکل میں ہوا ہے:

اقبال اور افلاطون

"اکاڈیمی" افلاطون کے مدرسہ کا نام ہے جس کی تعلیم و تربیت نے معلم اول ارسطو جیسے یگانۂ روزگار کو پیدا کیا ہے۔ اکاڈیمی دراصل کوئی موجودہ اسکول، مدرسہ یا یونیورسٹی کی نوعیت کی درسگاہ نہیں تھی۔ بلکہ ایک مخصوص طریقت زندگانی یا مذہب عمرانی کی نمایندہ تھی۔ جس کا بڑا کام اُس زمانہ کے سوفسطا۔ خطابت و زعامت کے خلاف جہاد کرنا اور "اسٹیٹ" کو تمام اجزا کا "کل" اور فطری بلکہ ایک فوق البشر حقیقت کبرائی ثابت کرنا اور مذہب اعیان کی تعلیم دینا تھا۔ اقبال بلاشبہ افلاطون کا سخت ترین ناقد ہے۔ مگر اقبال، سقراط، افلاطون اور ارسطو کی روح میں یہ مایۂ مشترک ہے۔ کہ یہ چاروں حکمار نہ "سوفسطیٔ" ہیں۔ جو پُر فریب دلائل کے دلدادہ اور ہر نوع کی مصنوعیت و بہیمیت کو عمرانی زندگی سے خارج کرنے کے حامی تھے۔ اور نہ "خطیب" ہیں۔ جن کا مقصد وحید جذبات و تعصبات کی تسخیر ہوتی ہے۔ اور جن کا واحد آلۂ عمل طلاقت لسانی، لفاظی اور سحر کاری ہے۔ اور نہ "زعیم" "ڈیماگاگ" جو محض عوام کی نفسیات و رجحانات کے نمایندے نہ کہ حقیقی "قاید" ہوتے ہیں۔ برعکس ازیں یہ چاروں آئمہ فکر اپنے مخصوص عقائد و خیالات کی سنگ بنیاد پر دنیا کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے مضطرب و بیتاب ہیں۔ چنانچہ افلاطون اور ارسطو کے مدرسوں سے یونان و ماورا یونان کی ریاستیں اور سلطنتیں اپنی اساس زندگی کے لئے سوشیل ادارات و دستورات کے کوڈ اور مخصوص فالیطی[1] نظام نامے طلب کیا کرتی تھیں۔ اور چونکہ یہ حکما محض آئیڈیلیسٹ نہیں تھے۔ بلکہ عملی سیاسیات و عمرانیات سے گہرا تعلق رکھتے

---

[1] یونانی لفظ پالیٹی (πολιτεια) کو میں اردو جامہ پہنا کر درج کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لفظ پولیس بمعنی شہر سے ماخوذ ہے۔ اور اس کے معنی عموماً "اسٹیٹ" کی ہیئت اجتماعی یا دستور کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کو محض سیاسی دستور حکومت کا مرادف تصور کرنا غلط ہے۔ بلکہ یہ ایک جامع ترین یونانی تخیل کے لئے موضوع ہے۔ اور اس کو اردو بنانا ضروری ہے ۱۲

لہٰذا افلاطونی اکاڈیمی اور ارسطاطالیسی مدرسے نے متعدد سلطنتوں کو دستوراتِ اساسی اور ضوابطِ اجتماعی مہیا کیا تھا۔ یونانی دستورِ سلطنت کو روحِ سلطنت جانتے تھے۔ افلاطون اور ارسطو کے نزدیک "فالیطی" (سلطنت کی ہیئت اجتماعی) ہی درحقیقت "اسٹیٹ" تھی۔ اس طرح ان کا یہ خیال تھا کہ دستور کی تبدیلی سلطنت کی تبدیلی اور دستور کا خاتمہ سلطنت کا خاتمہ اور دستور کی وحدت سلطنت کی وحدت ہے۔ یہ خالصتاً یونانی عقیدہ ایک دوسرے خالصتاً یونانی عقیدہ کی وسیع اساسِ محکم پر مبنی تھا۔ اور یہ وہ بنیادی عقیدہ تھا کہ فالیطی (پالیٹی polity) یا دستوری یا شریعت ملی درحقیقت ایک جماعت کے تمام کائناتی، مادی و معاشی تصورات پر مبنی اور تمام اجتماعی، سیاسی و عمرانی دستوراتِ زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی شعبہ یا پہلو، جامع فالیطی کے ہمہ گیر نظام سے باہر اور محفوظ نہیں رہ سکتا ہے۔ زندگی کی جامعیت اور ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کا یہ عقیدہ افلاطون اور اقبال میں مشترک ہے۔ دونوں عملی سیاسیات و عمرانیات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں کی آئیڈیل ازم مختلف ہو سکتی ہے۔ مگر ان کے آئیڈیلسٹ ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ دونوں حال سے بیزار اور ایک خوشتر و بہتر آئندہ فالیطی کے آرزومند ہیں۔ اقبال بھی آج افلاطون کی طرح ملتِ اسلامیہ کو سیاسی و عمرانی، اجتماعی و انفرادی، مادی و معاشی لحاظ سے ہر نوع ایک مکمل، ہمہ گیر، جامع و محیط فالیطی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے۔ جس کی اساس قرآن و سنت، وحی و تنزیل کے مطابق ایک خاص کائناتی تصور اور روحانی اور تہذیبی آئیڈیل ہے۔

بنا بریں اقبال اکاڈیمی لاہور کا یہ وظیفۂ اعظم ہوگا۔ کہ وہ عالمِ اسلام کے لئے خصوصاً اور عالمِ جدید کے لئے عموماً عہدِ حاضر کا افلاطونی اکاڈیمی ثابت ہو! بلکہ "یونانی اکاڈیمی" سے "ہندی اکاڈیمی" بہتر و برتر ثابت ہو۔ کیونکہ خود اقبال کہیں اس سے بہتر و برتر ہے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو اپنی بہترین و اعلیٰ ترین تفسیر کے ساتھ بھی محض ہیلن ازم (یونانیت) کے نمائندے ہیں۔ اور ان کی فکر یونان کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں کے حصار میں اس طرح مقید و محصور ہے۔ کہ وہ مجرد انسانیت و ارضیت اور اس سے بلند تر عالمِ معا

کے متوازی تصور سے عاجز ہیں۔ جو خاص اسلام کا امتیاز اور اقبال کا آئیڈیل ہے۔

یونانیت اور اسلامیت

کو "یونانی" (ہیلین) اور "باربیرین" میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ غیر یونانیوں کو اصلاً غلام، اور آزادی و تہذیب کے ناقابل تصور کرتے ہیں۔ خود یونانی یعنی ہیلین نسل کو وہ برترین نسل جانتے ہیں۔ مگر اسکی بڑی تعداد کی غلامی کو "طبعی" اور فطری بلکہ "اسٹیٹ" کی ہستی کے لئے ضروری و لابدی تصور کرتے ہیں۔ فرد اور خاندان کو "سٹیٹ" پر قربان کر دیتے ہیں۔ اور ایسے اصول کی تعلیم دیتے ہیں۔ جو شخصیت، خودی کی زندگی کو موت اور ترقی کو تباہی بنانے والے ہیں۔ ان تمام باتوں میں یہ یونانی حکما پورے پورے یونانی اور یونانی عقائد کے ترجمان ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ یونانیت کے جال سے باوجود اپنی حکمت اور عرفان کے آزاد ہونے میں ناکام ہیں۔

برعکس ازیں اقبال اپنے بہترین و اعلیٰ ترین شکل میں آریت اور ہندوازم۔ ایرانیت اور پارسی ازم، یونانیت اور ہیلین ازم، رومانیت اور رومن ازم۔ المانیت اور جدید ویسٹرن ازم۔ سامعیت اور اسلام کے مغز۔ عطر۔ جوہر۔ اور روح کا عارف اور ناقد ہے اور اُن کے روشن عطیات کا معترف ہے۔ کیونکہ وہ دراصل ایک شہرہ آفاق مبصر کے قول کے مطابق اسلام کے لباس میں مذہب انسانیت کا مبلغ ہے۔

پس یہ لازم ہے کہ اُس کی دعوت بھی ساری انسانیت کے لئے عام اور اس کی ہمہ گیر و جامع حکمت بھی عالمگیر ہو۔ اور اُس کے آئیڈیل کی تفسیر، تعلیم کی اشاعت اور آثار و اخبار کی جمع و ترتیب کا ادارہ "اقبال اکاڈیمی لاہور" "افلاطون اکاڈیمی ایتھنز" سے برتر، بہتر و پایندہ تر ہو!

مگر یہ ایک زندہ قوم کا کام ہے۔ اور سوال صرف یہی ہے۔ کہ ملتِ اسلامیۂ ہند ایک زندہ ملت بھی ہے!

ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال

مختصر سوانح حیات

(از جناب منشی محمد الدین صاحب فوق۔ ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور)

خاندان کا مشرف بہ اسلام ہونا شیخ صاحب کو کشمیری برہمنوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے جو ... [illegible] ... سب سے پہلے جد اعلیٰ قریباً ۲۰۰ دو سو سال ہوئے کہ مسلمان ہو گئے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان ... بزرگوں کا اسلام پر ایمان لانا ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوا اور وہی عقیدت اور وہی ... تک اس خاندان میں موجود ہے ۔

ولادت اور تعلیمی زندگی آپ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر پورے ۵۲ سال کی ہے۔ ابتدا میں اکثر مسلمان بچوں کی طرح کچھ دنوں آپ نے بھی مکتب کی ہوا کھائی۔ پھر مدرسے میں داخل ہوئے۔ مدرسہ پانچویں جماعت کا امتحان وظیفہ لے کر پاس کیا۔ مڈل کے درجوں میں بھی نہ صرف تعریف کے ساتھ کامیاب ہوتے رہے۔ بلکہ مڈل کے آخری درجے میں بھی وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد باب العلم شروع ہوتا ہے۔ یعنی انٹرنس کلاس جو کالج کا دروازہ ہے۔ دروازے کو کھولنا ہمت و استقلال اور فتح و شکست کے بہترین اثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اور خوشی کی بات ہے کہ اقبال بھی جب کالج کا دروازہ کھول کر کالج کے مدارج میں داخل ہوئے۔ یعنی جب انہوں نے انٹرنس

کا امتحان پاس کیا۔ تو پرائمری اور مڈل کی طرح یہاں بھی سرکاری وظیفہ لے کر کامیاب ہوئے۔ آپ کی طبیعت ابتدا ہی میں ذکاوت و ذہانت کا ایک نمونہ تھی۔ جب آپ ایف اے (سکاچ مشن کالج سیالکوٹ) میں داخل ہوئے۔ تو مولانا سید میر حسن[1] جیسے قابل سخن شناس عالم تبحر اور استاد شفیق کی توجہ خاص اور فیضان صحبت و تربیت نے ان جوہروں کو جلا دینے میں جو قدرت نے آپ کی طبیعت میں امانت رکھے تھے۔ کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ سیالکوٹ کالج سے فارغ ہو کر آپ لاہور گورنمنٹ کالج کی بی۔اے کلاس میں داخل ہوئے۔ طبیعت چونکہ فلسفیانہ پائی تھی۔ اس لئے بی۔اے کے امتحان میں فلسفہ کا مضمون لے کر نہ صرف پاس ہی ہوئے۔ بلکہ انگریزی اور عربی میں باتعریف کامیاب رہنے کے لئے دو طلائی تمغے اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ انہیں دنوں مسٹر ڈبلیو آرنلڈ صاحب علی گڑھ کالج سے گورنمنٹ کالج میں چلے آئے تھے۔ فلسفہ دانی میں آرنلڈ صاحب کی شہرت عالمگیر ہے۔ اس شہرت نے بے اختیار اقبال کو اپنی طرف کھینچا۔ آرنلڈ صاحب بھی اس ہونہار طالب علم کی تیز فہمی اور اس کے فلسفیانہ دماغ کے معترف ہو گئے۔ اور اقبال کو شاگردی کے مراتب سے گزار کر رفتہ رفتہ دوستی کے اعزاز تک پہنچا دیا۔ آرنلڈ صاحب اقبال تحقیقات علمی اور اس کی فلسفیانہ طبیعت کے متعلق ایک دفعہ فرماتے تھے۔ کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق بنا دیتا ہے۔ اور محقق کو محقق تر۔ غرض یونیورسٹی کی آخری تعلیم (امتحان ایم اے) کا مرحلہ بھی طے کیا۔ اور ایک تمغہ بھی حاصل کیا ۔

سلسلۂ ملازمت ایم۔اے پاس ہونے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ فلسفہ اور سیاست مدن کے مضامین پر آپ لیکچر دینے کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ پھر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ افسران کالج اور عہدہ داران تعلیم کی رائے اُن کی خدمات اور ان کی لیاقت علمی کے متعلق بہت اچھی تھی۔ علمی مشغل آپ کی زندگی کا جزو ضروری تھے۔ اکثر طالب علموں کو آپ اپنے مکان پر بھی اوقات کالج کے بعد پڑھایا کرتے تھے جب تک آپ طالب علم رہے۔ ایک سعادتمند اور ذہین و محنتی رہے۔ اور جب اُستاد کی حیثیت میں آئے تو ایک شفیق اور بے تکلف اور مہربان اُستاد

[1] شمس العلما مولانا میر حسن صاحب ۱۹۲۹ء میں انتقال فرما گئے ۔

ثابت ہوئے۔ اسی زمانہ میں سیاست مدن پر ایک کتاب اردو زبان میں بنام علم الاقتصاد لکھی۔

سفرِ ولایت

تحقیقاتِ علمی کا شوق جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا علاج یہاں بھی کثرتِ مطالعہ کے ذریعہ ہوتا رہا۔ لیکن ؎

مرض علم پر رحمت خدا کی مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر فلسفہ، قانون اور تحقیقاتِ علم کے لیے ولایت کا سفر اختیار کیا۔ اور محض علم اور صرف علم کی خاطر ہی ترکِ وطن اور دوست و احباب سے بلکہ والدین، بچوں اور دیگر اعزہ سے ہزارہا میل کی مفارقت اختیار کی۔ اور وہ بھی دو چار مہینوں کے لیے نہیں بلکہ کامل تین سال تک۔ وہاں سے کیمبرج یونیورسٹی سے بذریعہ تحقیقاتِ علمی علم اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ اور جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی (پی ایچ ڈی) کی فرسٹ کلاس ڈگری ایک کتاب بنام فلسفۂ ایران لکھنے سے حاصل کی۔ یہ کتاب جو لندن میں شائع ہوئی سلیس انگریزی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ولایت کے بڑے بڑے اہل الرایوں نے انگلستان کے مشہور پرچوں میں اس پر نہایت عمدہ ریویوز لکھے۔ فضلائے یورپ نے اس کتاب کو نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ افسوس ہے کہ ایسی لاجواب تصنیف ہنوز اردو زبان میں ترجمہ نہیں ہوئی۔ جرمنی سے واپس آنے کے بعد لندن کے سکول آف پولیٹیکل سائنس میں داخل ہوئے۔ اور وہاں کے پروفیسروں، نامور عالموں اور بڑے بڑے سائنسدانوں اور انگلستان کے دیگر فضلاء، حکما، علما اور مدبرین سے استفادہ حاصل کیا۔ اور بیرسٹری کا امتحان بھی کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔

انگلینڈ میں بطور لیکچرار و پروفیسر

بہت کم لوگ ایسے ہیں جو تحریر، تقریر اور نظم و نثر میں یکساں روانی اور یکساں قابلیت رکھتے ہیں۔ اور ایسے صاحب کمال لوگ بہت کم ہیں جو دونوں اوصاف سے متصف ہوں۔ ہمارے اقبال بھی امتیازِ خاص رکھتے ہیں۔ دورانِ قیام انگلینڈ میں باوجود کثرتِ مشاغل "اسلام" پر چھ پبلک لیکچر دیئے۔ جو نہایت مقبول ہوئے۔ اور جس سے آپ کی مذہبی تحقیقات کی بھی دھوم مچ گئی۔ چھ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ صاحب کے قائم مقام کی حیثیت سے آپ نے

پیرو فلسفہ بھی رہے ہیں ✦

ولایت سے واپسی

صرف ۳۲-۳۳ سال کی عمر میں اس قدر علمی اعزاز۔ اسقدر ڈگریاں اور فارسی عربی و سنسکرت کے علاوہ یورپ کی کئی زبانوں میں ماہر ہونا اور مقبولیت کو شہرت حاصل کرنا معمولی دماغ اور تربیت کا کام نہیں ہے۔ اقبال کی عزت جو عالم متبحر ہونے کی حیثیت سے آج کل ہندوستان اور یورپ میں ہے۔ وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ آخر آپ ولایت سے واپس وطن کو روانہ ہوئے۔ اور بمبئی۔ دہلی۔ انبالہ میں ٹھہرتے اور اپنے دوستوں سے ملتے ہوئے ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز پیر شام کی گاڑی میں لاہور تشریف لائے۔ جہاں اُن کے احباب اور دیگر بزرگان لاہور بلا تخصیص مذہب اُن کے خیر مقدم کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ شام کو اُن کے اعزاز میں ایک پارٹی منعقد ہوئی۔ جہاں اکثر احباب نے نظمیں بھی پڑھیں۔ ایک دن کے قیام کے بعد آپ سیالکوٹ تشریف لے گئے ✦

اہل اللہ سے ارادت

انگریزی تعلیم نے نوجوانانِ ملک وقوم کے عام (بالخصوص مذہبی) خیالات کو نقصان عظیم پہنچایا ہے۔ یہ ایک حد تک بالکل درست ہے۔ لیکن جب غور کیا جائے گا۔ تو معلوم ہوگا کہ

> مے کہ بدنام کند اہلِ خرد را غلط است بلکہ مے میشود از صحبت ناداں بدنام

درحقیقت یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ ہماری تعلیم و تربیت اگر اچھے پیمانہ پر ہو۔ صحبت نیک ہو۔ مذہبی تعلیم سے اچھی واقفیت ہو۔ تو کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی کسی کو صراطِ مستقیم سے گمراہ نہیں کرسکتا۔ آجکل مشائخ اور علمائے کرام کی طرف سے جو بدگمانی بلکہ نفرت سی تعلیم یافتہ گروہ میں پھیل رہی ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن اقبال اور اس کا خاندان اس کا زندہ نمونہ موجود ہے۔ کہ تعلیم کے ساتھ اگر تربیت بھی اور واقفیت بھی ہو تو مشائخ و اولیاء کی حسن عقیدت کے اثر کو انگریزی اعلیٰ تعلیم، سائنس اور فلسفہ اور ممالک یورپ کی سیر و سیاحت اور نئی روشنی اور تہذیب بھی زائل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ آپ ولایت جاتے ہوئے بھی بمقام دہلی آستانہ

حیاتِ جاوداں

محمد اقبال

حضرت محبوب الٰہی پر حاضر ہوئے۔ وہاں ایک خالص صوفیانہ نظم بھی پڑھی۔ اور واپسی کے وقت بھی جبکہ علاوہ علمی قابلیتوں کے اضافہ کے آزادیٔ یورپ کی ہوا بھی کھا چکے تھے۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیا (محبوب الٰہی) پر بصد عجز سرِ تسلیم و نیاز خم کیا لیکن شرط یہ ہے کہ وہ بزرگ صحیح معنوں میں صوفی ہو۔ زکا نما نہ ہو ؎

زر کیا ہے سر بھی دیدیں مریدانِ باصفا　　علم و عمل کا وصف کسی پیر میں بھی ہو

اعجاز بیان شاعر کب پیدا ہوتے ہیں

مغرب کے نقادانِ سخن کہتے ہیں۔ کہ زمانہ اپنی رفتار کے مطابق شاعر پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور ہر شاعر اپنے زمانہ کے حالات کا ایک مجسمہ ہوتا ہے۔ شاعری کی تاریخ اس دعوی کا ایک بین ثبوت پیش کرتی ہے۔ اور اقوام عالم کے مختلف زمانوں کی حالت اس کی صداقت کی ایک مکمل دلیل ہے جب کسی قوم میں شجاعت اور جوانمردی کا جوہر کمال پر ہوتا ہے۔ اس کے افراد میدان کارزار کو عیش و نشاط کا ایوان خیال کرتے ہیں۔ شمشیر کی عریانی ہلال عید کی تابانی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ تو شاعر نعرۂ جنگ بلند کرتا ہے۔ اور قتل و غارت کا طبل بجاتا ہوا اٹھتا ہے۔ وہ گوہر افشاں نہیں بلکہ شرر ریز ہوتا ہے۔ اس کے منہ سے پھول نہیں جھڑتے۔ انگارے برستے ہیں۔ اس کے اشعار خنجر براں سے تیز تر ہوتے ہیں۔ ان کی شعلہ بیانی میں ایک داستان شجاعت پنہاں ہوتی ہے جو ملکوں اور قوموں کو زیر و زبر کر دیتی ہے۔ اس نوع کے شاعر ازمنۂ تاریک میں سینکڑوں کی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ سپارٹا کی فتوحات کا باعث ایک نحیف الجسم شاعر تھا۔ جسے یونانیوں نے فوجی خدمت کے ناقابل سمجھ رکھا تھا۔ عرب کا نابینا شاعر قیس اعشیٰ قبیلوں کی قسمت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اسکا ایک شعر ہنگامۂ قتال کی آتش فروزی کے لئے کافی تھا۔

قوم کی ہستی میں ایک اور دور آتا ہے جب قوم حکمران ہوتی ہے۔ اُس وقت جدوجہد زندگانی اور مقابلہ کا فقدان قوائے حیات میں اضمحلال اور سکون پیدا کر دیتا ہے۔ اور ابتدائی ذوق نشو و نما ملک قناعت سے

؎ از مضمون فلسفہ اقبال اکرام الحق صاحب سلیم بی اے۔

کا فقدان قوائے حیات میں اضمحلال اور سکون پیدا کر دیتا ہے۔ اور ابتدائی ذوق نشو و نما مسلک قناعت سے متبدل ہو جاتا ہے۔ شاعر ایک با قاعدہ مبنی ہوتی ہے۔ جو ارباب دولت اور ثروت کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرتی رہتی ہے۔ صنف شاعری میں قصائد اور غزل کو فروغ ہوتا ہے۔ مگر اول الذکر کسی صاحب اقبال کی تعریف اور توصیف اور موخر الذکر حسن و عشق کے چرچے کی قدر ہوتی ہے۔ حقیقتاً شاعری میں ایک تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ جس کی ابتدا قوم کے آفتاب ترقی کے زوال کے ساتھ ہونے لگتی ہے +

اس حالت سے گرنے پر ایک تیسرا دور آتا ہے جب قوم کی حالت ایک عبرت انگیز انجام کو پہنچ چکی ہے۔ اسے اپنی پستی اور تنزل کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ غیر ٹھوکریں مارتے ہیں ظلم کرتے ہیں۔ ان کا حق دبا بیٹھتے ہیں۔ مگر افراد قوم کچھ ایسے قعر ذلت میں گرے ہوتے ہیں کہ چپکے سے بے شرمی کی باتیں سہے جاتے ہیں۔ اور اپنے اخلاق کو انتہائی تہذیب اور اپنی بے غیرتی کو قناعت اور صبر کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس وقت نظام طبعی کے قوانین کو قائم رکھنے کے لئے قدرت کروٹ بدلتی ہے اور اس زمین شعر سے ایسے ایسے پیغمبران سخن اٹھاتی ہے۔ جو اپنی اعجاز بیانیوں سے نیم مردہ قوم کے یخ بستہ جذبات کو سخن کی آگ سے گرما دیتے ہیں۔ اور ملت کی مردہ رگوں میں خون زندگی کی ایک لہر دوڑا دیتے ہیں۔ قوم کو اسلاف کے کارناموں کی خبر دے کر یقین دلاتے ہیں۔ کہ اس قوم میں ابھی تک ترقی کے اجزا موجود ہیں ؎

تو از دمید گل و لالہ ناامید مشو — کہ شاخ زندگی ما ہنوز نمناک است

اقبال کی ابتدائی شاعری

اقبال نے ایف اے کا امتحان مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کیا تھا۔ اور شاعری کی ابتدا بھی وہیں سے ہوئی تھی لیکن طبع خداداد کے شاعرانہ جوہر گورنمنٹ کالج لاہور میں آکر ظاہر ہوئے۔ علم کی روشنی اور لاہور کی سوسائٹی نے طبیعت کو وہ جلا دی۔ کہ ذرہ آفتاب بن کر چمکا اور ایسا چمکا۔ کہ ایک عالم کو طرز جدید کی شاعری سے منور کیا۔ آپ کی شاعری کا چرچا ابتدا میں ہم جماعت طلبا تک ہی محدود تھا۔ فروری ۱۸۹۶ء میں جبکہ آپ بی۔ اے میں پڑھا کرتے تھے۔ آپ کی شاعری عموم طلبا اور خاص احباب کے حلقہ سے نکل کر اپنی برادری یعنی اہل خطہ کی مجلس میں پہنچی۔ جس کے

دو ایک جلسوں میں آپ نے چند نظمیں اور رباعیاں پڑھیں۔ ایک رباعی ذیل میں درج کی جاتی ہے ؎

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں مل کے دنیا میں رہو مثل حروف کشمیر

اسی زمانہ میں لاہور کے مشاعروں میں بھی شامل ہوتے رہے۔ مرزا داغ مرحوم سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ ایک طویل غزل میں جو رسالہ شورش محشر میں چھپی تھی آپ تلامذۂ داغ کا ثبوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

ابتدائی کلام میں زیادہ تر غزلیں ہی ملتی ہیں۔ اور چونکہ آپ نے اپنے مجموعۂ کلام "بانگ درا" میں پرانا کلام اور خصوصاً غزلوں کو بہت کم جگہ دی ہے۔ اس لئے وہ بھی نایاب ہیں۔ سب سے پہلے مشاعرہ میں آپ نے جو غزل پڑھی۔ اُس کا مقطع یہ ہے ؎

اقبال لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض ہم تو اسیر ہیں خم زلف کمال کے

حق یہ ہے کہ آپ نے دلّی و لکھنؤ کی قید سے آزاد ہوکر اپنے لئے ایک الگ دنیائے شاعری پیدا کی ہے۔ اور آج تمام ہندوستان میں ہر شاعر اپنی شاعری کو آپ ہی کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش میں نظر آتا ہے۔ بیس بائیس سال کی عمر تھی۔ جب آپ نے یہ غزل پڑھی تھی۔ اس شعر پر جب پہنچے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو مرزا ارشد گورگانی مرحوم بے اختیار واہ واہ اور سبحان اللہ کہہ اُٹھے۔ اور بولے "میاں اقبال اس عمر میں اور یہ شعر" یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور کے با مذاق اور سخن فہم لوگوں کو اس نوجوان اور ہونہار شاعر سے شناسائی ہوئی +

جو شاعر ملکوں اور قوموں کو بیدار اور سیاسات نفس و حیات کا اعادہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ زیادہ دیر تک غزلوں اور محض عشقیہ غزلوں کے دلدل میں نہیں رہ سکتے۔ آخر اقبال بھی قوم کی طرف متوجہ ہوئے ۱۸۹۹ء میں آپ نے نالۂ یتیم کے نام سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں جو نظم نہایت سوز و گداز سے پڑھی اُس نے

آپ کی شاعرانہ و علمی شہرت کو ہندوستان و پنجاب کی سرحدوں سے باہر تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد انجمن کے ہر سالانہ جلسہ میں نظم اقبال ایک ضروری جزو ہو گئی +

اس معجز رقم شاعر نے چاروں طرف نگاہ ڈال کر ملت کی پُردرد اور عبرت انگیز تباہی کو دیکھا اور قوم کے جمود اور سکون کو دور کرنے کے لئے غیر اسلامیت سے اسلام کے بچانے کا بیڑا اٹھایا۔ جہاں اس کے وہ نغمے اور وہ نالہ گداز سے خون کے آنسو رلاتے تھے۔ اور ملک کی حالت پر نوحہ خوانی کرنے کے لئے مخزن کے صفحات پر کلیجہ نکال کے رکھ دیا۔ اور "ہندوستان ہمارا" اور "ہمالہ" اور "نیا شوالہ" کے نام سے وہ نظمیں لکھیں کہ ہر اہل دل، ہر اہل علم اور بالتخصیص ہر وقت ہر شخص کی زبان پر اقبال ہی اقبال تھا +

اقبال کی وطن پرور شاعری

علامہ اقبال نے وطنیت کے جذبات سے لبریز نظم "ہمالہ" کے نام سے دنیا میں پیش کی۔ یہ پہلا ہی شعر ہے اور کس محبت اور جوش سے اس کا اظہار کرتا ہے:

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں زیب دیتا ہے تجھے کہنہ اگر سا ہماں

یہ نظم ایک وطن پرست انسان کے مردہ حسیات کو زندہ کرنے کے لئے برقی رو کا کام دیتی ہے۔ اسی نظم میں ہمارا شاعر کس بے تکلفانہ انداز میں ہمالہ سے خطاب کرتا ہے:

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا

کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا

اقبال نے وطنی اتحاد اور قومی ہمدردی پیدا کرنے کے لئے اور بھی نظمیں لکھیں بلکہ قیام یورپ کے ایام میں وطن کی زبوں حالی سے بہت متاثر تھے۔ فرماتے ہیں:

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

پھر "ہندوستان ہمارا" میں لکھتے ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اقبال کی شاعری اسلامی رنگ میں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

سنہ ۱۹۱۰ء و سنہ ۱۹۱۱ء کی تاریخ نے مسلمانانِ عالم کے لئے کربلائے جدید کا ایک نیا باب کھولا۔ بلقان کی جنگ اور طرابلس الغرب کی لڑائیاں مسلمانوں کا خون نچوڑ رہی تھیں۔ خلافتِ اسلامیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھنے کو اور اسلام کا سیاسی اقتدار مٹنے کو تھا۔ ہمارے قومی شاعر کے دل میں بھی جذبات موجزن تھے۔ اس عام مصیبت پر کونسا مسلمان نہ تڑپ اٹھا ہوگا۔ پھر ہمارا شاعر اس تیر کی زد سے کس طرح بچ سکتا تھا۔ نظمیں لکھیں اور پڑھیں، محفلوں میں شور و شین برپا کر دیا۔ مجلسیں صفِ ماتم بن گئیں۔ خصوصاً ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں "خونِ شہدائے بلقان" کے عنوان سے جو نظم آپ نے پڑھی۔ اس نے ایک قیامت بپا کردی۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو آنسوؤں سے لبریز نہ تھی۔ اور کوئی دل ایسا نہ تھا۔ جو تڑپ نہ اُٹھا ہو +

مسلمان اسلام اور اسلامی ممالک کو خطرہ میں دیکھ کر سہمے ہوئے تھے۔ اقبال بھی انہیں میں تھے۔ اور شاعر چونکہ فطرتاً ذکی الحس ہوتا ہے۔ اس لئے اُنہوں نے اس عالمگیر اسلامی مصیبت کو سب سے زیادہ محسوس کیا۔ اب وہ وطن کو ایک "بت" کہتے تھے۔ اور ان کے نزدیک "فرد" کا وجود ایک عالمگیر "ملت" میں مدغم ہونے کے لئے تھا۔ اب وہ "ترانۂ ہندی" کی بجائے "ترانۂ ملی" لکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اور وطنیت کو اسلام کے منافی قرار دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پھر ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؏ مسلم ہے اگر تو تو "وطن" سے کیا کام؟

کچھ شک نہیں کہ اقبال کی شعلہ نوائی سے یہ آگ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گئی۔ لیکن وطن پرستوں کو ان سے شکوہ پیدا ہوا۔ اور اس کا اظہار جس نظم[a] میں کیا گیا۔ اس کے چند شعر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

[a] مصنفہ پنڈت اندر نرائن صاحب ناظم اسرار الہ آباد

ہندی ہونے پہ ناز جسے کل تک تھا حجازی بن بیٹھا — اپنی محفل کا رند پرانا آج نمازی بن بیٹھا
محفل میں چھپا ہے قیس عرب دیوانہ کوئی حجازی نہیں — پیغام جنوں جو لایا تھا اقبال وہ اب نیا من نہیں
اے مطرب تیرے ترانوں میں اگلی سی اب وہ بات نہیں — وہ تانیں گئے تخیل نہیں بے ساختگی جذبات نہیں

علامہ اقبال کے کلام کی شہرت اور اس پر تضمین!

علامہ ممدوح کا کلام اپنی سحر طرازی اور سوز و گداز کی وجہ سے شہرت کے پر لگا کر اڑ رہا تھا اور ہمالہ کی فلک بوس چوٹیوں کو عبور کر کے ہندوستان سے باہر بھی اپنی قبولیت کی فضا پیدا کر رہا تھا۔ مئی سنہ ۱۹۲۴ء میں جبکہ شاہ امان اللہ خاں اپنی حکومت کے انتہائی عروج کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کا کلام کابل کی ایک عظیم الشان مجلس میں پڑھا گیا جس میں شاہ ممدوح سفرائے دول خارجہ۔ معززین شہر اور وزیر تعلیم اور دوسرے وزراء بھی شامل تھے۔ یہ جلسہ طلباء کے تقسیم انعامات کا تھا۔ اس میں ہمارے ملک الشعراء ہند کا مشہور قومی ترانہ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" بچوں نے اپنے پیارے اور سادے لہجہ میں سنایا۔ پھر جب فوجی باجہ نے اسے دُہرایا تو حاضرین پر رقت طاری ہو گئی۔ جس طرح ہندوستان کی ہر قومی و ملکی محفل میں "ہندوستاں کے ہم ہیں، ہندوستاں ہمارا" کا ترانہ پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی ہر اسلامی مجلس میں "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" ایک جزو لاینفک ہو گیا ہے +

ڈاکٹر اقبال کے یہ دونوں ترانے بے حد مقبول ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کی کئی اردو اور فارسی نظموں پر بہت شاعروں نے تضمینیں لکھی ہیں۔ بلکہ اسلامی ترانہ کا ترجمہ عربی کی نظم میں بھی ہو گیا ہے +

آغا شاعر قزلباش دہلی کے ایک نامور شاعر ہیں۔ وہ مہاراجہ جھالرا پٹن (آنجہانی) کے مصاحب بھی اور [illegible] زمانہ میں بھی تھے۔ سنہ ۱۹۲۶ء یا سنہ ۱۹۲۷ء میں وہ کلکتہ کے گرانڈ ہوٹل میں مقیم تھے۔ جہاں امریکن سیاحوں کی ایک پارٹی بھی قیام پذیر تھی۔ ان میں اور ایک سیاح میں کچھ بات چیت ہوتی ہے۔ امریکن سیاح ان سے پوچھتا ہے۔ آپ کون ہیں اور کیا کام کرتے ہیں۔ آغا شاعر جواب دیتے ہیں۔ میں ایک مہاراجہ کا مصاحب

اور اس کا ایک مشہور شاعر ہوں۔ امریکن سیاح کہتا ہے "تو کیا آپ اقبال ہیں۔ سر اقبال" آغا صاحب لکھتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں متحیر ہو گیا۔ اور مجھے ڈاکٹر اقبال کی اس عظیم الشان مقبولیت اور لافانی شخصیت کا دل سے اعتراف کرنا پڑا +

کوئی دن اور کوئی ہفتہ ایسا نہیں جاتا۔ جب ہمارے اس مشہور عالم مگر گوشہ نشین شاعر کے پاس اقطاع ہند کے سیاحوں کے علاوہ جرمن۔ ٹرکی۔ انگلینڈ۔ بخارا افغانستان۔ ایران۔ امریکہ اور دیگر ممالک کے اہل علم ملاقات کے لئے نہ آتے ہوں +

اقبال شعرائے ہند کی نظروں میں

اقبال کی الہامیہ شاعری کی قبولیت عامہ کا یہ عالم ہے۔ کہ اس کی زندگی ہی میں اس کے سوانح حیات انگریزی اور اردو میں لکھے گئے۔ اس کے کلام پر بڑے بڑے اہل علم و اہل دماغ اصحاب نے تبصرے کئے۔ اس کی حیات افروز نظموں کی وجہ سے اس کی شان میں اس کے ہم عصر شعراء نے قصائد لکھے۔ اور واقعات و حقایق کا پہلو لئے ہوئے لکھے۔ مولانا غلام قادر گرامی نے جو عہد حاضرہ کے استاد فارسی شاعر گزرے ہیں۔ اقبال کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ایک شعر میں تو کمال ہی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیغمبر نتواں گفت

ان کے ایک ہموطن نگارہ صاحب سیالکوٹی لکھتے ہیں ؎

از خمستان کہن جام شراب آوردۂ	نغمۂ داؤد از تار رباب آوردۂ
اے حکیم نو رح ملت از دوائے فلسفہ	دین ابراہیم و اشہد شراب آوردۂ
از سبوئے بیخودی "مستِ خودی" کردی عیاں	از سراب اے ابو الحکم دریائے آب آوردۂ

مولانا گرامی کی معنی رس نظروں میں اقبال کی جو وقعت ہے۔ وہ ان اشعار سے بھی معلوم ہو سکتی ہے ؎

درس ماضی از کتاب حال گیر — سر غرازم خانہ اقبال گیر

از نوا لیش بزم یورپ در خروش　　حکمت امریکہ اورا سفتہ گوش
نالہ ہائے آتشیں آں حکیم　　معرفت رفت فتنہ امید و بیم
ساخت باد لہا بو سش ہیچ نیست　　سوخت و لہا راؤ و دش ہیچ نیست

سید بشیر احمد صاحب اخگر جالندھری "اقبال" کے عنوان سے ایک نظم میں لکھتے ہیں ؎

تیری ہستی کیا ہے پیغام بقا میرے لئے　　تیرے "اسرار خودی" ہمت فزا میرے لئے
ہیں "رموز بیخودی" عقدہ کشا میرے لئے　　راہبر سی بن گئی "بانگ درا" میرے لئے

روح غالب در د تیرا اقبال تیرے دل میں ہے
حسن لیلائے سخن پنہاں اسی محمل میں ہے

فارسی کا ایک قطعہ مشہور ہے ؎

در شعر سہ تن پیمبر انند　　ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات قصیدہ و غزل را　　فردوسی و انوری و سعدی

یہ تو اصناف شاعری کی تحسین کا انداز تھا۔ مولانا حامد حسن قادری نے خصائص و محاسن شاعری میں جن تین اردو شاعروں کا انتخاب کیا ہے اُس کا انداز مدح و بیان بھی قابل تعریف ہے۔ میر و غالب کے کمالات شعر کو کس خوبی سے اقبال کی ذات میں دکھاتے ہیں ؎

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے　　جن کی فیض طبع نے اردو کو گنج زر دیا
ایک اثر میں بڑھ گیا اک رفعت تخیل میں　　تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائنات شاعری ہیں یہی دونوں کمال　　تیسرے میں اس لئے دونوں کو یکجا کر دیا

خان اصغر حسین خاں صاحب نظیر لدھیانوی، فارسی اور اردو دونوں زبانوں کی شاعری میں یکساں کمال رکھتے ہیں۔ بلکہ فارسی میں ان کا درجہ اردو سے بھی زیادہ بلند ہے۔ وہ اقبال کے متعلق اپنی ایک نظم میں لکھتے ہیں:-

جان و دل را از نوائے خود گداز — آشیاں در گلشن اقبال ساز
آں چمن آرائے اسرار و رموز — آسماں پیرائے اسرار و رموز
خیمہ زن در وادیٔ طورش کلیم — شعر او تفسیر قرآن حکیم
حاصل خم خانہ ہا زیر برش — مے بہ تاک اندر نہاں در ساغرش
در تن ما گر رواں بینی ازوست — آنچہ در ہندوستاں بینی ازوست

گرامی مرحوم اپنے مرض الموت میں بھی (۲۶ مئی ۱۹۲۷ء کو) علامہ اقبال کو اکثر یاد کرتے رہے آخری لمحوں میں یہ شعر اُن کی زبان پر تھا ؎

صبا بہ حضرت اقبال ایں پیام بدہ — کہ رفت جان گرامی و تو ہنوز خموش

ہمارے قومی شاعر کو سر کا خطاب

۱۹۰۱ء میں جب کہ ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر ڈاکٹر اقبال نے ایک درد انگیز ترکیب بند لکھا۔ تو سرکاری حلقوں میں اقبال کی شاعری نے ایک دھوم مچا دی۔ پھر انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسہ میں جب سر [illegible] اس زمانہ کے لاٹ صاحب تشریف لائے تو اقبال نے اُن کی شان میں علم کی تعریف میں ایک قطعہ لکھا یہ غالباً ۱۹۰۳ء کا ذکر ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم میں آپ نے ایک نظم لکھی۔ یہ نظم گورنمنٹ پنجاب کے سرکاری اخبار "حق" میں چھپی۔ اور اپنی طرز خاص کے لحاظ سے سرکاری و غیر سرکاری حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ لیکن گورنمنٹ زیادہ تر اقبال کے علم و فضل اور اس کی قدر و قیمت سے اسوقت واقف ہوئی۔ جب ان کی فارسی تصانیف (اسرار بیخودی۔ رموز بیخودی) نے یورپ کے اخبارات اور اہل علم طبقہ میں جگہ پیدا کر لی۔ ان دونوں مثنویوں کے ترجمے یورپ کی کئی زبانوں میں - - ہوگئے۔ اور جب اہل مغرب نے مشرق کے ایک شاعر کا فلسفہ حیات ایک نئی زبان اور نئے انداز میں دیکھا۔ تو بے ساختہ انکی زبان سے نکل گیا ؎

آتشے از سینۂ اہل عجم افروختی — در فضائے غرب سیل اضطراب آوردۂ

چنانچہ سنہ میں آپ کو نائٹ (سر) کا عظیم القدر خطاب ملا۔ یہ خطاب ایک ایسے شاعر کو ملا تھا جس نے

کبھی خطابات اور ہوسِ جاہ کی خواہش نہ کی تھی۔ بلکہ جو ہمیشہ آزادی و حریت کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اس لئے اس پر اخبارات اور شعرا نے بہت کچھ طبع آزمائیاں کیں۔ ایک نظم کے تین شعر یہاں بھی درج کئے جاتے ہیں ؎

لو مدرسۂ علم ہوا قصرِ حکومت — افسوس کہ علامہ سے سر ہوگئے اقبال
پہلے تو سرِ ملت بیضا کے تھے وہ تاج — اب اور سنو "تاج" کے سر ہوگئے اقبال
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ — سرکار کی دہلیز پہ سر ہوگئے اقبال

لیکن آپ کی اس عزت افزائی پر جو عظیم الشان پارٹی مقبرۂ جہانگیر میں لاہور کے سکھوں، مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرف سے آپ کو دی گئی۔ اور جس میں نہ صرف لاہور کے معززین بلکہ پنجاب کے مختلف شہروں کے اکابر اور اہل علم شریک تھے۔ اور اکثر انگریز حکام و لیڈیوں کے علاوہ خود گورنر پنجاب بھی مدعو تھے۔ وہ ظاہر کرتی ہے کہ ملک نے ایک شاعر کی عزت کو کس وقعت و فخر کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس پارٹی میں ڈاکٹر صاحب نے انگریزی زبان میں ایک دلچسپ تقریر کی۔ اور اسی تقریر سے پہلی مرتبہ لوگوں کے کان آپ کی مشہور تصنیف "پیام مشرق" سے آشنا ہوئے۔ جو آپ جرمن شاعر گوئٹے کے جواب میں تصنیف کر رہے تھے۔

علامہ اقبال کا سفر میسور، مدراس و حیدرآباد دکن

دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری ایام میں چند لکچر دینے کے لئے سر اقبال کو مدراس میں مدعو کیا گیا۔ تین دن آپ وہاں رہے۔ مختلف افراد اور انجمنوں نے ایڈریس اور دعوتیں دیں۔ مدراس، بنگلور، میسور کے قریباً ہر انگریزی و ورنیکلر اخبار نے آپ کے فوٹو شائع کئے۔ اخبارات کے نمائندوں اور مذہب و فلسفہ کے بڑے بڑے عالموں نے آپ سے مذہب و فلسفہ اور سیاسیات پر گفتگو کی۔ مدراس میں انجمن ترقی اردو کے علاوہ ہندی پرچار سبھا اور جنوبی ہند کے برہمن عالموں نے آپ کو سپاسنامے پیش کئے۔ ۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو جب ڈاکٹر صاحب بنگلور کے سٹیشن پر پہنچے۔ تو ہزارہا آدمی شمالی ہند کے اس نامور

عالم لوگ دیکھنے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ یہاں آپ کو مسلم لائبریری کی طرف سے جس جلسہ میں ایڈریس دیا گیا۔ اُس کے صدر امین الملک دیوان مرزا اسمٰعیل چیف منسٹر میسور تھے۔ طالب علموں اور تعلیم یافتہ لوگوں نے آپ کے خیالات سے مستفیض ہونے کے لئے جس جلسہ کا اہتمام کیا اُس کے صدر ڈاکٹر سبرائن ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات میسور تھے۔ مہاراجہ میسور کا دعوت نامہ آپ کو بنگلور ہی میں مل چکا تھا۔ اس لئے ۱۰ رجنوری کو آپ گورنمنٹ کے مہمان خانہ میں فروکش ہونے کے لئے میسور روانہ ہوئے۔ خاص شہر میسور میں میسور یونیورسٹی نے آپ کے لکچر کا انتظام کیا۔ دوسرے دن ٹون ہال میں مسلمانانِ میسور نے اپنا ایڈریس پیش کیا۔ جہاں ہندو بھی مدعو کئے گئے تھے۔ میسور یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسر نے جو غیر مسلم تھے۔ اپنی تقریر میں کہا۔ "ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنا کہیں۔ مگر وہ ہم سب کے ہیں کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملکیت نہیں۔ اگر مسلمانوں کو یہ ناز ہے کہ اقبال اُن کا ہم مذہب ہے تو ہم ہندوستانیوں کو یہ فخر کم نہیں ہے کہ اقبال ہندوستانی ہے۔" میسور، بنگلور، سری رنگا پٹن۔ اور دوسرے مقامات دیکھنے کے بعد آپ ۱۴ رجنوری کو حیدرآباد پہنچے۔ جہاں اسٹیشن پر ہی مسلمان بچے ایک قطار میں کھڑے ہو کر "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" کی نظم خوش الحانی کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ اسٹیشن پر عوام کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کے تمام ارکان موجود تھے یہیں آپ کو اطلاع دی گئی کہ آپ نظام گورنمنٹ کے مہمان ہیں۔ اس لئے سیدھے گورنمنٹ مہمان خانہ میں جانا ہوگا۔ ۱۸ رجنوری کی صبح کو ۱۱ بجے آپ اعلیحضرت حضور نظام سے ملے۔ حیدرآباد دکن۔ میسور اور مدراس کے اخباروں نے آپ کی علمی فضیلت پر مضامین شائع کئے۔ آپ کی تصویریں چھاپیں۔ اور میسور کے اخبار الکلام نے اقبال نمبر چھاپا +

مذہب اور سیاست کے متعلق علامہ اقبال کے خیالات

مدراس کے سفر میں ۷ رجنوری ۱۹۲۹ء کو مدراس کے مشہور روزانہ اخبار سوراجیہ کے ایک نمائندہ نے مذہب اور سیاست کی یک جائی کے متعلق علامہ اقبال سے ایک سوال کیا۔ آپ نے اُس کا جواب بڑی تفصیل سے دیا۔ ہم یہاں اُس کا خلاصہ درج کرتے ہیں +

"میں اس امر کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری درسگاہوں میں مذہبی تعلیم بھی ہونی چاہئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میں بحیثیت ایک ہندوستانی کے مذہب کو سوراج پر مقدم خیال کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر مجھے ایسے سوراج سے کوئی واسطہ نہ ہوگا جو مذہب سے بے نیاز ہو۔ یورپ میں تعلیم کا خالصتہً دنیوی طریق بڑے تباہی آمیز نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا ملک بھی ان تلخ تجربات سے دوچار ہو۔ یہ امر صاف ظاہر ہے کہ باشندگان ایشیا یورپ کے خالص مادی رویہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے۔ کہ روحانی اور مادی امور کو کس طرح یکجا جمع کیا جائے +

سب سے پہلی ایشیائی قوم جسے اس مسئلہ کو حل کرنے سے واسطہ پڑا تھا۔ ترک تھی۔ میں کہتا ہوں کہ ترک روحانیت و مادیت کے مطلوبہ اجتماع کو حاصل کرنے میں ناکامیاب رہے۔ تاہم میں ترکوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تاتاری نسل اس تیزیٔ فہم و ادراک اور اس عمقِ ضمیر سے محروم ہے۔ جو اس مسئلہ کے حل کے لئے ضروری تھی۔ میں فی الحال اس مسئلہ کے متعلق ایران۔ عرب اور افغانستان کی آئندہ روش پر بھی اظہار خیال نہیں کر سکتا۔ جو اقوام ایشیا کے سامنے پیش ہو رہا ہے +

میرا عقیدہ ہے کہ باشندگانِ ہند اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے اہل ثابت ہوں گے۔ کیونکہ ان کی مذہبی روایات۔ ان کے ادراک کی تیزی اور ان کے جذبات کی شدت اس کام کی اہلیت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نوع انسان کی عام بھلائی کے لئے میں یہاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مفاہمت کا متمنی رہتا ہوں۔ اور اسے اشد ضروری خیال کرتا ہوں۔ صرف باشندگانِ ہند ہی پرانی دنیا کے کھنڈروں پر نسلِ آدم کے لئے نئی دنیا تعمیر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کی باتیں کہ مذہب کو بالائے طاق رکھ کر تمام تر توجہ سیاسیات پر دینی چاہیئے۔ یورپ کی غلامانہ تقلید کے سوا اور کچھ نہیں جس کی مادہ پرستی یورپ کی روحانیت اور دوسری اقوام کی مادیت کے لئے پیامِ موت ثابت ہو چکی ہے +"

علامہ اقبال کی تصنیفات

علامہ ممدوح نے سب سے پہلے اردو میں علم الاقتصاد کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جو آجکل نایاب ہے۔ انگلستان میں "فلسفہ ایران" پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی جس پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ انگلستان سے واپس آکر اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کے نام سے دو مثنویاں شایع کیں۔ جن پر ملک کے ہر گوشہ سے احسنت و مرحبا کی صدا بلند ہوئی۔ پھر "بانگِ درا" کے نام سے اپنے اردو کلام کا مجموعہ شایع کیا۔ اس کے بعد پیامِ مشرق اور زبورِ عجم نے آپ کی شہرت و عظمت کو اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ آپ نے ۱۹۲۹ء میں جو چھ لکچر انگریزی میں مدراس میں دئے تھے۔ وہ بھی کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ کون جانتا تھا کہ سیالکوٹ کا وہ لڑکا جس کی ابتدا نہایت معمولی تھی۔ بڑھتے بڑھتے شہرت کے اس فلک الافلاک تک جا پہنچے گا۔ جہاں ان سے پہلے کوئی ہندوستانی نہ جا سکا تھا۔ کس کو علم تھا کہ خاموش وضع کا یہ تنہائی پسند لڑکا اپنے دماغ میں کیا کیا فیضان و بہی چھپائے ہوئے ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جس پر خطۂ کشمیر کو ناز ہے۔ یہ وہ نادرِ وجود ہے۔ جس پر سیالکوٹ جو اس کا جنم بھوم ہے۔ فخر کرتا ہے۔ یہ وہ لاثانی شخصیت ہے۔ جس کا نام لے کر پنجاب بلکہ تمام ہندوستان پھولا نہیں سماتا +

علامہ اقبال اور بیرونی ممالک کے اربابِ علم[1]

(۱) حسین دانش ترکی فاضل نے ترکی میں علامہ اقبال کی بہت سی نظموں کا ترجمہ کیا۔ اور "پیامِ مشرق" پر تبصرہ لکھا۔ ہمیں یہ معلومات ڈاکٹر توفیق بے رکن وفدِ ہلالِ احمر سے ملیں۔ ڈاکٹر توفیق بے نے یہ بھی فرمایا کہ اقبال کے نظریات کو شاید ہی کسی نے اس وضاحت سے لکھا ہو جس وضاحت سے حسین دانش نے لکھا ہے۔ ایک روز ڈاکٹر توفیق بے نے دورانِ گفتگو میں کہا کہ اگر اقبال کبھی قسطنطنیہ تشریف لائیں تو ان کا شاہانہ استقبال کیا جائے +

(۲) امان افغان (کابل) جناب آغا ہادی حسن صاحب وزیر تجارت نے جو پہلے انگلستان میں افغانستان

---

[1] انقلاب ۲۴ رجولائی ۱۹۲۸ء مضمون مرتبہ پروفیسر محمد عبد اللہ صاحب +

۱۳۶۴۶

کے سفیر تھے۔ ایک سلسلۂ مضامین پیام مشرق پر بطور تبصرہ لکھا تھا۔ جو کئی نمبروں میں چھپا +

(۳) مصر کے مشہور و معروف سیاح جناب احمد رفعت بھی ہیں جنھوں نے پچھلے دنوں ممالک اسلامیہ کی سیاحت ختم کی۔ اس سیاحت کے دوران میں وہ شملہ و لاہور میں بھی رونق افروز ہوئے۔ جناب احمد رفعت نے علامہ اقبال کی بہت سی نظموں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اور یہ تراجم مصر کے مشہور جریدہ الاہرام میں شایع ہوئے +

(۴) مولوی عبدالحق صاحب حقی بغدادی مرحوم سابق پروفیسر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے علامہ کی مشہور نظم ترانہ کا ترجمہ عربی میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ بھی مصر وغیرہ کے عربی اخبارات میں چھپ چکا ہے +

یورپ و امریکہ

(۱) ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی نے اسرار خودی کو انگریزی لباس پہنایا۔ پھر پیام مشرق پر رسالہ اسلامیکا (جرمنی) میں تبصرہ لکھا۔ اس تبصرہ کا اردو ترجمہ نیرنگ خیال کے عید نمبر ۱۹۲۵ء میں شایع ہو چکا ہے بتایا جاتا ہے کہ آجکل ڈاکٹر موصوف پیام مشرق کے انگریزی ترجمہ میں مصروف ہیں +

(۲) ڈاکٹر براؤن آنجہانی نے اسرار خودی کے انگریزی ترجمہ پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلہ ۱۹۲۱ء میں تبصرہ لکھا۔ نیز اپنی تازہ ترین تالیف تاریخ ادبیات فارسی کی آخری جلد یعنی جلد چہارم میں شہاب الدین سہروردی کے سلسلہ میں ذکر فرمایا +

(۳) ڈاکٹر ایشور داس نے پیام مشرق کے مقدمہ کو جرمنی زبان کے لباس کا جامہ پہنا کر پیام مشرق کی غرض و غایت کو واضح کر دیا ہے +

(۴) ڈاکٹر فشر پروفیسر لیپزگ یونیورسٹی (ایڈیٹر) اسلامیکا نے جرمنی زبان میں پیام مشرق پر تبصرہ لکھا۔ اور ڈاکٹر نکلسن سے بھی زیادہ بہتر طریق پر علامہ اقبال کا گوئٹے سے مقابلہ کیا +

(۵) جرمنی کے مستشرق ڈاکٹر ہانس مانکے نے جو وہاں کا ایک مشہور فلسفی شاعر ہے نہایت حسن عقیدت اور فرط محبت سے پیام مشرق کا استقبال کیا۔ یعنی اس کے ایک خاص حصہ کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا۔ پھر اسے چمڑے کے کاغذ پر جس پر عموماً انجیل وغیرہ مقدس کتابیں لکھی جاتی ہیں اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھ کر اور مشرقی انداز میں نقش و

نگار کر کے علامہ اقبال کی خدمت میں بطور تحفہ ارسال کیا۔ احقر کو یہ ہدیۂ نادرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ واقعی ایسی نایاب چیز کبھی قدیم زمانہ میں تیار کی جاتی تھی +

(۶) خان بہادر عبدالعزیز ڈپٹی کمشنر بندوبست جب انگلستان تشریف لے گئے تو وہاں آپ نے لنڈن یونیورسٹی اور کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال کی شاعری کے نصب العین پر لکچر دئے جو بعض یورپی رسائل میں شایع بھی ہوئے +

(۷) جرمنی میں ڈاکٹر اقبال کے نام سے ایک سوسائٹی قائم ہوئی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے۔ کہ علامہ موصوف کی تعلیمات اور آپ کے کلام کی اشاعت کرے +

(۸) ڈاکٹر سکارپہ اٹلی کے مشہور فاضل ہیں۔ جو پچھلے دنوں افغانستان میں بھی تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے اٹلی کے ایک ادبی مجلہ میں اقبال کے متعلق ایک نہایت محققانہ مضمون لکھا +

(۹) حال ہی میں جرمنی میں ایک بیاض ہندوستانی علم ادب کے متعلق شایع ہوئی ہے۔ جسمیں مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب بصورت تراجم جمع ہے۔ اس مجموعہ میں علامہ اقبال کی پانچ نظمیں ہیں۔ اور ٹیگور کی محض ایک نظم ہے +

(۱۰) ایک روسی نے جو ہندوستان کا سفر کر چکا ہے اور لاہور محض علامہ اقبال ہی سے ملنے کی غرض سے آیا تھا۔ اسرار خودی کے نظریات کو روسی زبان میں قلمبند کیا +

(۱۱) ڈاکٹر کزن نے جو مدراسی تھیوسیفیکل سوسائٹی کے رندج وال ہیں۔ اپنی تازہ کتاب سا ما دارشن میں نبصو لکھا۔ اور ٹیگور و اقبال کا مقابلہ بھی کیا۔ وہ فرماتے ہیں بنگالی شاعر نے دنیا پہ قبضہ کر لیا ہے مگر اقبال اس کا برادر کلاں ہے +

(۱۲) ڈاکٹر سپوز آنجہانی نے شکوہ کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ جو انڈین ریویو میں شایع ہو چکا ہے۔ آپ پیام مشرق کا بھی انگریزی ترجمہ کرنا چاہتے تھے +

(۱۳) اتصنیم سنہ ۱۹۲۱ء میں مسٹر فارسٹر نے اسرار خودی کے انگریزی ترجمہ پہ تبصرہ لکھا۔ اور علامہ اقبال کے

کلام پر ایک مصلح قوم کی تعلیمات کی حیثیت سے نظر ڈالی۔ اس تبصرہ کا ترجمہ بھی غالباً معارف میں شائع ہو چکا ہے۔

(۴) مسٹر اَپن سابق مدیر مسلم آؤٹ لک نے بارہا ٹیگور اور اقبال کا مقابلہ کیا۔ اور اقبال کو ٹیگور سے ہمہ وجوہ برتر ثابت کیا ہے۔

(۵) کتاب ہندوستان کی بیداری مصنفہ میکنزی میں ایک باب جدید علم ادب کا طلوع کے نام سے بھی ہے جس میں سر راجو گندر سنگھ کی تحریر کی رو سے اقبال کا بھی نہایت وضاحت سے ذکر کیا گیا ہے۔ (صفحہ ۱۵۹) یہ کتاب امریکہ میں ۱۹۲۰ء میں چھپی۔ اس کا مصنف تمام امریکہ کا نمائندہ بن کر ہندوستان آیا تھا۔

(۶) ۱۹۲۵ء میں کے انڈین ریویو میں ایک مضمون پیام اقبال کے عنوان سے مسٹر مینن کے قلم سے شائع ہوا۔ مصنف نے دراصل اسرار خودی پر اپنے خیالات قلمبند کئے ہیں۔ وہ اسرار خودی کو اخوت اسلامی کے موضوع پر ایک الہامی کتاب قرار دیتا ہے۔

(۷) علامہ اقبال جب کونسل کے انتخابات میں مصروف تھے۔ تو ایک مقرر نے علامہ ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے مارننگ پوسٹ کی ایک تحریر کا بھی حوالہ دیا تھا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ اقبال بہت بڑی طاقت ہے۔

سر اقبال اور پنجاب کونسل

علامہ اقبال ذہنی طور پر ہمیشہ احرار کے طبقہ میں شامل رہے ہیں مگر عملی طور پر ان کو میدان سیاست میں آنے کا کوئی موقع نہ ملا تھا۔ وہ خود ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں ؎

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں — کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

پھر ایک اور نظم میں اپنی خاموش زندگی کا اس طرح ثبوت دیتے ہیں ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے — گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

لیکن باوجود یہ سب کچھ جاننے کے ان کے دوستوں اور عقیدتمندوں نے بڑے اصرار کے ساتھ

ان کو کونسل کی انتخابی جد و جہد کے لئے تیار کیا۔ اور اہل لاہور واقف ہیں کہ ۱۹۲۶ء میں لاہور کے ہر محلے اور کوچے میں حمایت اقبال کے لئے اُن کے دوستوں نے کثیر التعداد جلسے کئے۔ کونسلوں کے انتخابات کے موقع پر امیدواروں کی طرف سے ہزارہا روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ اور ووٹروں کی خوشامدیں اور اُن کی خاطر داریاں علیحدہ ہوتی ہیں۔ لیکن اہل لاہور خوب جانتے ہیں۔ کہ اقبال ہی پہلا ممبر کونسل ہے۔ جس کے لئے نہ صرف دو جلیل القدر امیدواروں نے اپنے نام واپس لے لئے بلکہ شہر کی تمام مسلمان برادریوں نے اقبال کی حمایت میں علیحدہ علیحدہ اشتہارات شائع کئے۔ اور اقبال ایک پیسہ خرچ کئے بغیر ۳۰ نومبر ۱۹۲۶ء کے پولنگ میں اپنے مد مقابل سے اتنے کثیر ووٹوں کے ساتھ کامیاب ہو گیا۔ جو اس بات کا مظہر ہے کہ جمہور اسلام۔ طبقہ اعلیٰ اور تعلیم یافتہ نوجوان آپ کی قابلیت پر اور آپ پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔

اخبارات نے علامہ اقبال کی کامیابی پر تعریفی مضامین لکھے۔ زمیندار نے جو اپنے بعض سیاسی وجوہ کے اختلاف پر آپ کی تمام خوبیوں اور قابلیتوں کی تنقیص و تردید کو مستحکم کردہ امر و استثناء کا سبب بنا رہا ہے۔ آپ کے کامیاب ہو جانے پر ایک مقالہ افتتاحیہ میں آپ کے متعلق اپنی ۵ دسمبر ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں لکھا۔ "ساری دنیا جانتی ہے کہ علامہ ممدوح ایسی نادر الوجود شخصیتیں صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتی ہیں۔ موجودہ مسلمانانِ ہند میں سے شاید علامہ ممدوح ہی وہ ممتاز ترین ہستی ہیں جن کے علم و فضل کے روبرو یورپ و امریکہ کی کلاہ افتخار کو بھی مضطربانہ جھکنا پڑا ہے۔ ایک ایسے وجود کا کونسل کی رکنیت کے لئے امیدوار بننا مسلمانان لاہور کے لئے علی الخصوص اور مسلمانان پنجاب کے لئے علی العموم بڑی ہی خوش قسمتی اور سعد بختی کا موجب ہے"۔

سر اقبال کی ملکی و قومی خدمات کونسل میں

سر اقبال کونسل میں مسلمانوں کے نمائندہ بن کر گئے تھے۔ اُنہوں نے کونسل کے مختلف اجلاس میں کئی سوالات و استفسارات مسلمانوں کی ترقی و فلاح کے لئے کئے۔ لیکن اُن کا دل چونکہ ملکی درد سے لبریز ہے خصوصاً غریب طبقہ (مزدور اور کاشتکار) کے ساتھ ان کو فطری اُنس و ہمدردی ہے۔ اس لئے اُنہوں نے زمینداران

سود و بہبود اور دُان کے مالیہ کو کم کرانے اور انکم ٹیکس اور معاملہ اراضی میں فرق بتانے کے لئے کونسل
...فر دیا تھا اجلاس میں تو کوئی تحریک خود پیش کی ہے اور نہ کسی اور محرک کی کسی تحریک کی تائید کی ہے۔ اور تحریک
...کیوقت اپنی مدلل اور زبردست تقریروں سے بہت سے ممبروں کو اپنا ہم خیال بنالیا ہے +

ملک میں ایک طبقہ ایسا ہے جو حکومت کو مشکلات میں ڈالنے اور قوموں میں تفرقہ اور ملک میں بدامنی
...رنے کے لئے مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں پر کمینے حملے کرتا رہتا ہے۔ آپ نے اس کے متعلق تحریک پیش
...کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کی جائے۔ کہ بانیان مذاہب پر توہین آمیز شر انگیز اور کمینہ
...ں کی اشاعت کا سدباب کرنے کے لئے ایک ریگولیشن نافذ کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء ہی سے یہ
...ن نافذ چلا آتا ہے۔ تلوار کو قانون اسلحہ ہند سے مستثنیٰ کرانے کی بھی آپ نے تحریک پیش کی۔ شراب کی
...ت کو دور کرنے کے لئے یہ قرارداد پیش کی کہ شراب نوشی کے انسداد کی حکمت عملی کا منتہائے نظر امتناع
...یم کیا جائے۔ اور اس کی میعاد پندرہ سال سے متجاوز نہ ہو۔ نیلی بار منٹگمری کے ضلع میں سوا تین لاکھ ایکڑ
...سرکار نے فروخت کیا ہے۔ اس کا زیادہ حصہ سرمایہ داروں نے ہی خریدا ہے۔ اس کے متعلق علامہ
...ں نے یہ تحریک پیش کی کہ اس کا نصف مزارعین یعنی کسانوں کے لئے جو اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کا کام
...تے ہیں۔ مخصوص کیا جائے +

شہروں میں جب کوئی وبا پھیلتی ہے۔ تو اس کے سدباب کے لئے سرکاری وغیر سرکاری انتظامات
...رع ہو جاتے ہیں۔ اور ہر قسم کی طبی امداد ہر مریض کو مل سکتی ہے لیکن دیہاتوں میں ایسی بات نہیں ہے۔
...لئے آپ نے دیہاتیوں کے مفاد کے لئے یہ تحریک پیش کی۔ کہ سرکاری و غیر سرکاری ارکان کی ایک
...مقرر کی جائے۔ جو دیہات میں حفظان صحت کے طریقوں کی ترقی کی رپورٹ پر غور کرے +

...ہیں حکومت کی ملکیت نہیں بلکہ قوموں کی ملکیت ہوتی ہیں

۲۸ فروری ۱۹۳۲ء کے اجلاس کونسل میں وزیر مالیات نے جو
...نیہ پیش کیا۔ اُس پر علامہ اقبال نے ایک زبردست تبصرہ کرتے ہوئے نظام محاصل کی بے ضابطگیوں

کی نقاب کشائی کی۔ اور تخفیف محاصل پر بحث کرتے ہوئے فرمایا۔ بے ضابطگی یہ ہے کہ زمین کے معاملہ میں یہ نظریہ قایم کرلیا جاتا ہے۔ کہ ساری زمین ملکیت حکومت ہے۔ اس ملکیت عامہ کا دعویٰ۔ عہد قدیم میں کسی نے کیا اور نہ سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں ایسا مطالبہ پیش کیا گیا۔ یہ اس مسئلہ کا تاریخی پہلو ہے۔ جسے مجلس تحقیقات محاصل بھی تسلیم کر چکی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے۔ کہ اس ملک میں حکمران طاقت نے کبھی اس قسم کے حقوق کا مطالبہ نہیں کیا (نعرہ ہائے تحسین) مجھے بتایا جاتا ہے کہ مغلوں نے ایسا دعویٰ کیا تھا۔ لیکن پنجاب کے باشندے اس ملک کی زمین۔ کے اُس وقت سے مالک چلے آتے ہیں۔ جبکہ بابر کی نسل نے تاریخ کے ایوان میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔ اس سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ بادشاہتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ اور صرف قوم زندہ و سلامت رہتی ہے (نعرہ ہائے تحسین) اور اگر کسی وقت کسی ملک کے اندر یہ نظریہ رائج بھی تھا۔ تو اس بیسویں صدی میں اُسے جائز نہیں مانا جا سکتا۔ اس وقت زمین کے ہر چھوٹے بڑے قطعہ کے لئے معاملہ لیا جاتا ہے۔ خواہ کسی شخص کے پاس دو کنال زمین ہو۔ خواہ دو سو کنال۔ بہر صورت اسے معاملہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس انکم ٹیکس کے باب میں صلاحیت و استطاعت کے اصول یا مدارج کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک تدریجی پیمانہ قایم ہے۔ بعض لوگوں سے قطعاً کوئی انکم ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ میری گذارش یہ ہے کہ کونسل کو اس اصول کی روشنی میں تخفیف محاصل کے مسئلہ پر نظر ڈالنی چاہیئے۔"

(نعرہ ہائے تحسین)

۱۹۲۸ء میں سرکاری ملکیت کا نظریہ پھر زیر بحث آیا۔ اس پر علامہ اقبال نے پھر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔" اس نظریہ پر سب سے پہلے جس یورپین مصنف نے تبصرہ کیا۔ وہ بیرن تھا۔ ۱۸۰۸ء میں اُس نے پوری تحقیق و تفتیش کے بعد اس نظریہ کو بالکل مسترد کر دیا۔ ۱۸۳۰ء میں بریگز نے ہندوستان کے اندر ملکیت کے قانون و رواج کی پوری تحقیقات کی۔ یہ مصنف اپنی کتاب میں منوجی کے قوانین۔ اسلامی شریعت اور ہندوستان کے مختلف حصص بنگال۔ مالوہ۔ پنجاب وغیرہ کے متعلق رواجی پابندیوں کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ تاریخ ہند کے کسی دور میں بھی سلطنت زمین کی ملکیت کی مدعی نہیں ہوئی۔

پنجاب کے وزیر مالیات سے علامہ اقبال کی پُر لطف بحث

زمین کا لگان معاف یا کم کرانے اور انکم ٹیکس اور معاملہ اراضی کا فرق

بتانے اور زمین کو سرکاری ملکیت سے مستثنیٰ قرار دینے پر علامہ اقبال کی تقریر بڑی زوردار اور بڑی طویل تھی۔ تقریر کے دوران میں فاضل رکن مالیہ آنریبل سر فضل حسین سے خطاب ہوتا تھا۔ ہم اس تقریر کے چند پُرلطف ٹکڑے ناظرین کی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ رکن مالیہ نے اپنے دلائل میں دو باتوں پہ زور دیا (۱) صوبہ کی ترقی کے لئے روپیہ کی اشد ضرورت ہے۔ (۲) حکومت کیمیاگری نہیں جانتی۔ اس کا جو جواب علامہ اقبال نے اپنی تقریر کے دوران میں دیا۔ اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکا۔ آپ نے فرمایا "میری رائے میں حکومت کو اس وقت تک کیمیاگری سیکھنے کی ضرورت نہیں جبتک کہ ملک کے تمام محنت کش کسان جن کا پسینہ مٹی کو سونا بنا دیتا ہے اُس کے قبضہ میں ہیں" وزیر مال نے علامہ اقبال کے دلائل سُنکر جب کہا کہ مالگذاری کا یہی طریق جاری رکھا جائے گا۔ یا اسے بالکل چھوڑ دیا جائے گا۔ اس کے سوا تیسرا راستہ کوئی نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر اقبال نے کہا اگر آپ اس امر کو تسلیم کرلیں کہ مالگذاری عاید کرنے کا یہ طریق غیر منصفانہ ہے۔ تو اس بے انصافی کو دور کرنے کے لئے کچھ علاج شروع کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا علاج آپ نے یہ بتایا۔ کہ ایک ایسے شخص کو جس کے پاس پانچ بیگہ سے زیادہ زمین نہیں۔ بشرطیکہ زمین ایسے رقبہ میں نہ ہو جہاں آبپاشی نہیں کیجا سکتی اور اس کی پیداوار کی تعداد بھی معین ہو۔ لگان معاف کر دینا چاہیئے۔ جب وزیر مال نے یہ خوف اور احتمال پیش کیا کہ یہ قرارداد مسودہ قانون مالگذاری کے شیرخوار بچہ کی موت کا باعث بن جائے گی۔ اور ارکان کونسل بچہ کشی کے جُرم کے مرتکب ہوں گے۔ تو آپ نے فرمایا۔ آجکل جیسا کہ منع حمل کی تدابیر پر عمل کیا جاتا ہے کسی ایسے بچہ کا قتل کر دینا جس کے متعلق نہیں علم ہو کہ یہ بڑا ہو کر شریر ہوگا۔ نہایت معمولی بات ہے۔ میری رائے میں یہ مطالبہ کہ پانچ بیگہ تک کی زمین کا مالیہ معاف کر دیا جائے۔ کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔ ۲½ ایکڑ زمین والے شخص کا لگان معاف کرنے پر وزیر مالیات نے کہا۔ کہ یہ گناہ بے لذت ہوگا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا اگر آپ گناہ بے لذت کا ارتکاب کریں گے۔ تو اتنا تو ثابت کر دیں گے۔ کہ آپ میں انصاف کا کچھ نہ کچھ احساس ہے ◆

اخیر میں آپ نے کہا۔ کہ حکومت کو چاہئے۔ کہ ان بیچاروں کے لئے کچھ کرے۔ جو اپنی زمین سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے بھی پیداوار حاصل نہیں کر سکتے ؛

سر اقبال اور خطۂ جنت نظیر کشمیر

سر اقبال گو آج سارے جہان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ سارے جہان میں کشمیر کا چھوٹا سا ملک جو بارہ تیرہ لاکھ فاقہ کشوں کا وطن ہے۔ کیا حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم آپ نے اپنے وطن قدیم کے لحاظ سے اس غریب ملک اور اس غریب قوم کے لئے بھی اپنے قلب میں جو سمندر سے بھی زیادہ وسیع ہے تھوڑی بہت جگہ ضرور دی ہے۔ جو نظمیں آپ کی سب سے پہلے کسی اخبار یا رسالہ کی زینت ہوئیں۔ وہ کشمیر اور کشمیریوں کے متعلق ہی تھیں۔ انگلستان سے واپس آکر آپ پہلے کشمیری انجمن کے اور بعد ازاں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کے سکرٹری قرار پائے۔ اسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ ظفروال کے ایک تحصیلدار نے ایک مقدمہ میں کشمیریوں کے متعلق مفسد اور بہادر کے لفظ لکھے۔ واقعہ یہ تھا۔ کہ دس بارہ آدمیوں نے تین کشمیریوں پر مارپیٹ کا دعویٰ کیا۔ تحصیلدار نے فیصلہ میں لکھا۔ کہ بظاہر یہ باور کرنا بہت مشکل ہے۔ کہ دس بارہ آدمی تین آدمیوں سے کس طرح مار کھا سکتے ہیں۔ لیکن عام طور پر چونکہ کشمیری مفسد اور بہادر پائے جاتے ہیں۔ اس لئے میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ ان تین کشمیریوں نے اپنے سے چوگنی تعداد کے حریفوں کو زخمی نہ کر دیا ہو۔ ایک منچلے کشمیری نے اس فیصلہ کی مصدقہ نقل لیکر کانفرنس کے دفتر میں بھیجی۔ کہ اس تحصیلدار نے ہم کو مفسد قرار دیا ہے۔ اس پر ہتک اور توہین کا مقدمہ قائم ہونا چاہئے۔ سر اقبال سکرٹری تھے۔ آپ نے فرمایا تحصیلدار نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ صحیح ہے۔ جو قوم بہادر ہے۔ وہ ضرور مفسد ہے۔ اور جو مفسد ہے وہ بہادر اور دلیر ہے۔ اس فیصلہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ابتدا کشمیریوں کی طرف سے نہیں تھی۔ اس لئے وہ لاتفسدوا فی الارض کی ذیل میں نہیں آسکتے۔ بلکہ اُنہوں نے قومی غیرت سے کام لے کر اپنی مدافعت کی ہے۔ اس فیصلہ پر مقدمہ کی تجویز پاس نہ ہو سکی ؛

نواب سر سلیم اللہ خان جی۔ سی۔ آئی۔ ای نواب آف ڈھاکہ جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں

امرت سر تشریف لائے تھے تو کشمیریانِ پنجاب کی طرف سے سر اقبال نے ہی آپ کی خدمت میں خیر مقدم کا ایڈریس فارسی زبان میں پڑھا تھا۔

راقم الحروف نے کشمیر کے متعلق جسقدر کتابیں لکھی ہیں۔ ان کو سر اقبال نے ہمیشہ پسند کیا۔ اور اپنی زرّیں راؤں سے کتابوں کی وقعت کو دوچند کر دیا ہے۔ میری اخباری خدمات اور تصنیفات متعلقہ کشمیر کی وجہ سے آپ نے مجھے بارہا مجدد الکشامرہ لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خطۂ کشمیر کے بارہ و تیرہ لاکھ انسانوں کی تعلیمی و اخلاقی پستی کو دور کرانے اور اُن لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگانے والوں کی خدمات کو پسند فرماتے ہیں۔

مہاراجہ سر پرتاب سنگھ آنجہانی سے بھی ایک دو دفعہ ملاقات کر چکے ہیں۔ مہاراجہ نے کشمیر آنے اور سرکاری مہمان بننے کی دعوت بھی دی تھی۔ ایک دفعہ کشمیر تشریف بھی لے گئے تھے۔ وہاں اپنی آنکھوں سے کشمیر کی جو حالت دیکھی۔ اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نشاط باغ کی سیر میں جہاں سر اقبال ہر اہل دل کے دل کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں ع

شرابے کتابے ربابے نگارے

وہاں نشاط کی سیر کے دوران میں بدنصیب کشمیریوں کی المناک حالت کے متعلق اسی نظم میں لکھتے ہیں

کشیری[۱] کہ با بندگی خو گرفتہ — بتے مے تراشد ز سنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے — خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او — نصیب تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے — نہ در سینۂ او دل بیقرارے
ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری — کہ خاکسترش آفریند شرارے

غنی شاہجہان کے زمانہ میں کشمیر کا نامور شاعر گذرا ہے جس کا سکہ ہندوستان و ایران تک بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بادشا

۱؎ کشمیری کشمیر کو کشیر بھی کہتے ہیں۔ جیسے کشیر اندر سٹھا تور کشیر میں سخت سردی ہے۔ اسی لحاظ سے آپ نے کشمیری کو کشیری کہا ہے۔

کے بلانے پر بھی اس کے دربار میں نہیں گیا۔ اس کا قاعدہ تھا کہ جب اپنے مکان پر ہوتا تھا تو دروازہ بند کر دیتا تھا۔ اور جب باہر جاتا تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی۔ تو کہا متاع گراں تو میں ہی ہوں۔ جب میں گھر میں نہیں تو حفاظت کس کی۔ اس واقعہ کو سر اقبال نے ذیل کی نظم میں کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

غنی آں سخن گوئے بلبل صفیر — نوا سنج کشمیر مینو نظیر
چو اندر سرا بود در بستہ داشت — چو رفت از سرا تختہ را واگذاشت
یکے گفتش اے شاعر دل رسے — عجب دارد از کار تو ہر کسے
بہ پاسخ چہ خوش گفت مرد فقیر — فقیر و بہ اقلیم معنے امیر
ز من آنچہ دیدند یاراں رواست — دریں خانہ جز من متاعے کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش — متاع گرانے است در خانہ اش
چو آں محفل افروز در خانہ نیست — تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

سر اقبال نے سیاحت کشمیر کے دوران میں ایک اور نظم بھی لکھی۔ وہ بھی اپنی روانی اور منظر آفرینی کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس میں فرماتے ہیں ؎

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر — سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج — صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
تا نہ فتد بہ زینتش چشم سپہر فتنہ باز — بستہ بہ چہرۂ زمیں برقع نسترن نگر
لالہ ز خاک بردمید موج بہ آب جو تپید — خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر
زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز — قافلہ بہار را انجمن انجمن نگر
دخترکے برہمنے لالہ رخے سمن برے — چشم بروے او کشا باز بخویشتن نگر

سر اقبال نے اہل کشمیر اور کشمیر کے متعلق اپنی طالب علمی (بی۔ اے) کے زمانہ میں جو رباعیات کہی ہیں۔ وہ اُن کے مطبوعہ کلام میں نہیں ہیں۔ ہم یہاں چند درج کرتے ہیں ؛

رُباعیات

کہکشاں میں آ کے اختر مل گئے اک لڑی میں آ کے گوہر مل گئے
واہ وا کیا محفل احباب ہے ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے

موتی عدن سے، لعل ہوا ہے یمن سے دور یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

سامنے ایسی گلستاں کے کبھی گر نکلے جیب خجلت سے سر طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلی گر مولائے جلیل عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

پنجۂ ظلم و جہالت نے برا حال کیا بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا
توڑ اس دست جفا کیش کو یا رب جس نے روح آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

محمد دین فوق



A Pen Drawing
by
Shabuddin Rahmat Ullah
PATNA

فلسفۂ سخت کوشی

علامہ سر اقبال کا ایک مضمون

اُردو میں پہلی مرتبہ

محترمی ڈاکٹر نکلسن

شفیع کے نام آپ نے جو مکتوب تحریر فرمایا ہے۔ اُس سے مجھے یہ معلوم کر کے بیحد مسرت ہوئی۔ کہ اسرارِ خودی کا ترجمہ انگلستان میں قبولِ عام حاصل کر رہا ہے۔ بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نیٹشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے۔ دھوکا کھایا ہے۔ اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ "دی ایتھنیم" والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحب مضمون پر عائد نہیں ہوتی۔ اُس نے اپنے مضمون میں میری جن نظموں کا ذکر کیا ہے۔ اگر اُسے اُن کی صحیح تاریخ اشاعت کا بھی علم ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میری ادبی سرگرمیوں کے نشوو ارتقا کے متعلق اُس کا زاویہ نگاہ بالکل مختلف نظر آتا +

وہ انسانِ کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے خلط مبحث کر کے میرے انسانِ کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسانِ کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اُٹھایا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نیٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا۔ نہ اُس کی کتابیں میری نظروں سے گذری تھیں۔ یہ مضمون "انڈین انٹی کیوری"

میں شایع ہوا۔ اور جب ۱۹۰۸ء میں میں نے "ایرانی الٰہیات" پر ایک کتاب لکھی۔ تو اُس مضمون کو اُس میں شامل کر دیا گیا +

انگریزوں کو چاہئے کہ میرے خیالات کو سمجھنے کے لئے جرمن مفکّر کے بجائے اپنے ایک ہموطن فلسفی کے افکار کو رہنما بنائیں۔ میری مراد الگزینڈر سے ہے۔ جس کے گلاسگو والے خطبات پچھلے سال شایع ہو چکے ہیں۔ ان خطبات میں اُس نے "خدا اور الوہیت" کے عنوان سے جو باب لکھا ہے۔ وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ صفحہ ۳۴۴ پر لکھتا ہے:۔

"گویا ذہن انسانی کے نزدیک الوہیت دوسری اعلیٰ تجربی قوت ہے۔ جسے کائنات عالم وجود میں لانے کی سعی کر رہی ہے۔ قیاس و اجتہاد کی رہنموئی سے ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ بطن گیتی میں اس قسم کی ایک قوت موجود ہے۔ لیکن ہم نہیں جانتے۔ کہ وہ قوت کیا ہے۔ ہم نہ تو اُسے محسوس کر سکتے ہیں نہ ہمارا ذہن اُس کے تصوّر پر قادر ہے۔ انسان ابھی تک ایک نامعلوم خدا کے لئے قربانگاہیں تعمیر کر رہا ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ الوہیت کیا چیز ہے۔ اُس کا احساس کیسا ہوتا ہے اُس صورت میں ممکن ہے۔ کہ ہم خدا بن جائیں" +

الگزینڈر کے خیالات میرے عقائد کی نسبت زیادہ جسارت آمیز ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ کائنات میں جذبۂ الوہیت جاری و ساری ہے۔ لیکن میں الگزینڈر کی طرح یہ نہیں مانتا۔ کہ یہ قوت ایک ایسے خدا کے وجود میں جلوہ آرا ہوگی جو وقت کا تابع ہوگا۔ اس باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قوت ایک اکمل و اعلیٰ انسان کے پیکر خاکی میں ظاہر ہوگی۔ خدا کے متعلق الگزینڈر کا عقیدہ میرے عقیدے سے مختلف ہے۔ لیکن اگر انگریز ان جزوی اختلافات سے قطع نظر کر کے انسان کامل کے تخیل پر اپنے ایک ہموطن مفکّر کے افکار کی روشنی میں نظر ڈالیں تو اُنہیں یہ عقیدہ اسقدر اجنبی اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوگا +

مجھے مسٹر ڈکنسن کی تنقید بدرجۂ غایت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ میں اس کے متعلق چند باتیں عرض کر دوں +

(۱) مسٹر ڈکنسن کے نزدیک میں نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے آمال قرار دیا ہے (اُنہوں نے مجھے ایک مکتوب لکھا ہے جس میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔) اُنہیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں۔ لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوتِ پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کے رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اُس کا فرض ہے۔ لیکن میں اُن تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں۔ جن کا مقصد محض کشورکشائی اور ملک گیری ہو +

مسٹر ڈکنسن نے صحیح فرمایا ہے۔ کہ جنگ خواہ حق و صداقت کی حمایت میں ہو۔ خواہ ملک گیری اور فتحمندی کی خاطر تباہی اور بربادی اُس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لئے اُس کے استیصال کی سعی کرنا چاہیئے۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاہدے، لیگیں، پنچائتیں، اور کانفرنسیں استیصالِ حرب نہیں کر سکتیں۔ اگر ان مساعی میں ہمیں پیش از پیش کامیابی حاصل ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ طاقتور ملل مستعمرین ملکوں کو تمدن و تہذیب میں اپنا ہمسر نہیں سمجھتیں اُنہیں اپنے سہامِ جور و تعدی کا شکار بنانے کے لئے زیادہ پُرامن وسائل اختیار کریں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی شخصیت کی ضرورت ہے۔ جو ہمارے معاشری مسائل کی پیچیدگیاں سلجھائے۔ ہمارے تنازعات کا فیصلہ کرے۔ اور بین الملی اخلاق کی بنیاد مستحکم و اُستوار کر دے + پروفیسر میکنزی کی کتاب "انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی" کے یہ دو آخری پیراگراف کس قدر صحیح ہیں۔ میں اُنہیں یہاں لفظ بہ لفظ نقل کر دیتا ہوں:

"کامل انسانوں کے بغیر سوسائٹی معراجِ کمال پر نہیں پہنچ سکتی۔ اور اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت آگاہی کافی نہیں۔ بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے۔ جسے یوں کہنا چاہیئے کہ یہ مقاصد حاصل کرنے کے لئے ہم نور و حرارت دونوں کے محتاج ہیں۔ غالباً عہدِ حاضرہ کے معاشری مسائل کا فلسفیانہ فہم و ادراک بھی وقت کی اہم ترین ضرورت نہیں۔ ہمیں معلم بھی چاہیئے اور پیغمبر بھی۔ ہمیں آج رسکن یا کارلائل یا ٹالسٹائی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو ضمیر کو زیادہ متشدّد اور سخت گیر بنانے اور فرائض کے دائرے کو زیادہ وسیع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ غالباً ہمیں ایک مسیح کی ضرورت ہے۔ . . . . یہ قول صحیح ہے۔ کہ عہدِ حاضرہ کے پیغمبر کو محض "بیابان کی صدا" نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ عہدِ حاضرہ کے "بیابان" آباد شہروں کے گلی کوچے ہیں۔ جہاں ترقی کی مسلسل

پیہم جد و جہد کا بازار گرم ہے۔ اس عہد کے پیغمبر کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اسی ہنگامہ زار میں وعظ و تبلیغ کرے غالباً ہمیں پیغمبر سے بھی زیادہ عہد نو کے شاعر کی ضرورت ہے۔ یا ایک ایسے شخص کا وجود ہمارے لئے مفید ثابت ہوگا۔ جو شاعری اور پیغمبری کی دوگونہ صفات سے متصف ہو۔ عہد ماضی کے شاعروں نے ہمیں فطرت سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے۔ انہوں نے ہمیں اسقدر ژرف نگاہ بنا دیا ہے۔ کہ ہم مظاہر فطرت میں انوار ربانی کا مشاہدہ کرسکتے ہیں لیکن ہم ابھی ایک ایسے شاعر کے منتظر ہیں جو ہمیں اسی وضاحت کے ساتھ پیکر انسانی میں صفات الٰہی کے جلوے دکھا دے۔ ہائینے نے ازراہ تفنن اپنے آپ کو "روح القدس کا سپاہی" کہا تھا۔ ہمیں ایسے شخص کی ضرورت ہے۔ جو درحقیقت روح القدس کا سپاہی ہو۔ جو اس حقیقت پر ہماری آنکھیں کھول دے۔ کہ ہمارے بلند ترین نصب العین روزمرہ کی زندگی میں پورے ہو رہے ہیں۔ اور اگر اس زندگی کو ترقی دینے کی سعی کی جائے۔ تو ہمیں محض راہبانہ ریاضت اور نفس کشی ہی کا موقع نہیں ملیگا۔ بلکہ ایسا ارفع و اعلیٰ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ جو تمام خیالات، تمام جذبات اور تمام مسرتوں کو ترقی کے بلند مقام پر پہنچا سکتا ہے"

انگریزوں کو چاہئے۔ کہ اس نوع کے خیالات کی روشنی میں انسان کامل کے متعلق میرے افکار کا مطالعہ کریں۔ ہمارے عہد نامے اور پنچائتیں جنگ و پیکار کو صفحۂ حیات سے محو نہیں کرسکتیں۔ کوئی بلند مرتبہ شخصیت ہی ان مصائب کا خاتمہ کرسکتی ہے۔ اور اس شعر میں میں نے اسی کو مخاطب کیا ہے ؎

باز در عالم بیار ایام صلح جنگجویاں را بدہ پیغام صلح

(۲) مسٹر ڈکنسن نے آگے چلکر میرے "فلسفۂ سخت کوشی" کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس باب میں جو کچھ فرمایا ہے۔ اس کا مدار علیہ وہ خیالات ہیں۔ جو میں نے حقیقت کے متعلق اپنی نظموں میں ظاہر کئے ہیں۔ میرے عقیدے میں حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے۔ جو تصادم کے واسطے سے ربط و امتزاج پیدا کرکے "کل" کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں۔ اور یہ تصادم لامحالہ ان کی شیرازہ بندی اور انضباط پر منتج ہوگا۔ در اصل بقائے شخصی اور زندگی کے علو و ارتقا کے لئے تصادم نہایت ضروری ہے۔ نیٹشے بقائے شخصی کا منکر

سے جو شخص حصولِ لذت کے آرزومند ہیں۔ وہ اُن سے کہتا ہے "کیا تم ہمیشہ کے لئے [illegible] زمانے کے [illegible]
کا [illegible] بننا چاہتے ہو [illegible] اُس کے قلم سے۔ الفاظ اس [illegible] نکلے ہیں [illegible] اخلاقی [illegible]
غلط تھا۔ اس نے کبھی مسئلہ بقائے زمان کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ [illegible]
نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاعِ گرانمایہ ہے [illegible] حصول پیا [illegible]
[illegible] ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں [illegible] کی تمام صور استقلالِ مختلفہ میں تصادم و پیکار بھی شامل [illegible]
ضروری سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک اُن سے انسان کو زیادہ استحکام [illegible] حاصل ہوتا ہے۔
چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے سکون و جمود [illegible] کا [illegible] قیاس
آرائیوں تک محدود ہو مردود قرار دیا ہے ؛

میں تصادم کو سیاسی حیثیت سے نہیں بلکہ اخلاقی کیفیت سے ضروری سمجھتا ہوں حالانکہ اس باب
میں نیٹشے کے خیالات کا مدار غالباً سیاست ہے۔ [illegible] مادی قوت کے
حدود نا مختتم [illegible] نے ہزارہا سال تک ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد [illegible] کی ہے [illegible]
[illegible] فانی ہے۔ اور اُسے مٹا دیا جا سکتا ہے۔ قوتِ ذہنی یا یوں کہیے کہ [illegible] پر بھی
یہی کیفیت ہے۔ صدہا برس کی مسلسل جدوجہد اور تصادم [illegible] کے [illegible] صورت تک پہنچا ہے
پھر بھی عوارضِ ذہنی کے مظاہرِ مختلفہ سے اُس کی بے ثباتی اور عدمِ استحکام ظاہر ہے۔ اگر وہ بدستور قائم
و باقی رہنا چاہتا ہے۔ تو یقیناً وہ ماضی کے درسِ عبرت کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اُسے لامحالہ ان قوتوں
سے اپنے قیام کی خاطر استمداد کرنی پڑیگی۔ جو آج تک اُس کے استحکام کی ضامن رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ
فطرت کا ارتقا ان قوتوں میں اصلاح کر دے۔ یا اُن میں سے بعض کو (مثلاً تصادم اور جنگ و پیکار کو جو استحکام
کے قوی عوامل میں سے ہیں) جو اُس کے ارتقا کی کفیل بنی رہی ہیں۔ بالکل مٹا دے اور اس کے استحکام و بقا کی
خاطر بعض ایسی قوتیں عرصۂ شہود میں لے آئے جن سے انسان آج تک ناآشنا رہا ہے۔ لیکن میں بتا دینا
چاہتا ہوں کہ میں اس باب میں کسی نصب العین کا پرستار نہیں ہوں۔ اس لئے میرے نزدیک اس نوع

۔ کہ انقلاب کا زمانہ ابھی بہت دور ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ یورپ کی جنگ عظیم میں انسان کی بصیرت و جبلت کا جو سرمایہ پنہاں ہے وہ اس سے عرصۂ دراز تک متمتع نہ ہو سکیگا +

ان سطور سے واضح ہو گیا ہے۔ کہ میں نے محض اخلاقی زاویۂ نگاہ سے تصادم و پیکار کو ضروری قرار دیا ہے۔ افسوس ہے کہ مسٹر ڈکنس نے "فلسفۂ سخت کوشی" کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے +

(۳) مسٹر ڈکنس نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ لیکن باعتبار اطلاق و انطباق مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اوّلین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرۂ مخاطبت محدود کر دیں گے۔ جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے +

اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے۔ نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے۔ کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے۔ کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کر دیں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافی حدود ملک پر ہے۔ دنیائے اسلام میں استیلاء حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوع کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ اُن کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوو ارتقا ہے۔ نسل اور حدود ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیات اجتماعی کی ترقی

اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوت عمل کا نقطہ اتم سمجھ لیا جائے ۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ بلکہ دراصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیونکہ تمام ایسی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی حد کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُن کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے۔

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ

میرے خیال میں مسٹر ڈکنسن کا ذہن ابھی تک یورپ والوں کے اس قدیم عقیدے سے آزاد نہیں ہوا کہ اسلام سفاکی اور خونریزی کا درس دیتا ہے۔ دراصل خدائی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام انسان اُس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کر دیں۔ اور ایک دوسرے کی شخصیت تسلیم کر لیں۔ انجمنیں، ملکیں، داریاں۔ اس قسم کے عہدنامے جن کا ذکر مسٹر کینز نے کیا ہے ملکیت خواہ وہ جمہوریت کی ہی قبا میں پوشیدہ کیوں نہ ہو۔ انسان کو فوز و فلاح سے آشنا نہیں کر سکتی بلکہ [illegible] تمام [illegible] آج [illegible] چیز کی [illegible] احتراز کیا جائے [illegible] یا ایسی اقوام جو تیاری اور جنگجوئی سے [illegible] میں چنداں مہارت نہیں رکھتیں [illegible] ہو جائیں۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح جنگ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بھی فتوحات کی ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ اُن کے بعض قافلہ سالار ذاتی خواہشات کو دین و مذہب کے لباس میں جلوہ گر کرتے رہے

ہیں۔ لیکن مجھے پوری طرح یقین ہے۔ کہ کشور کشائی اور ملک گیری ابتداء تو اسلام کے مقاصد میں داخل نہیں تھی۔ اسلام کو جہاں ستانی اور کشور کشائی میں جو کامیابی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک وہ اس کے مقاصد کے حق میں بے حد مضر تھی۔ اس طرح وہ اقتصادی اور جمہوری اصول نشو و نما نہ پا سکے۔ جن کا ذکر قرآن کریم اور احادیث نبوی میں جا بجا آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قایم کرلی۔ لیکن ساتھ ہی اُن کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا۔ اور انھوں نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ کہ اسلامی اصولوں کی گہرائی درحقیقت کس قدر وسیع ہے +

اسلام کا مقصد یقیناً یہ ہے۔ کہ دوسری قوموں کی جداگانہ حیثیت مٹا ڈالے اور انہیں اپنے اندر جذب کرلے۔ بلکہ صرف اسلام کی سیدھی سادی تعلیم جو الٰہیات کے دقیق اور پیچیدہ مسائل سے پاک اور عقل انسانی کے عین مطابق واقع ہوئی ہے۔ اس عقدہ کی گرہ کشائی کر سکتی ہے۔ اسلام کی فطرت میں ایسے اوصاف نمایاں ہیں۔ جن کی بدولت وہ کامیابی کے اوج بلند پر پہنچ سکتا ہے۔ ذرا چین کے حالات پر نظر ڈالئے۔ جہاں کسی سیاسی قوت کی پشت پناہی کے بغیر اسلام کے تبلیغی مشن نے غیر معمولی کامیابی حاصل کرلی۔ اور لاکھوں انسان خیل در خیل اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے ہیں۔ بیس سال سے دنیا کے افکار کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اور اس طویل عرصے نے مجھ میں اس قدر صلاحیت پیدا کر دی ہے کہ حالات و واقعات پر غیر جانبدارانہ حیثیت سے غور کر سکوں +

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں۔ بلکہ میری قوت طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے۔ کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے۔ اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات پات۔ رتبہ و درجہ۔ رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے۔ اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسن معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گرانمایہ سے محروم ہے۔ اور یہ

متاع اُسے ہمارے ہی فیضِ صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے ؛

میں اس بارے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسرار خودی پر چند تشریحی نوٹ لکھے تھے۔ جنہیں آپ نے دیباچۂ اسرار میں شامل کر لیا ہے۔ ان تفسیری حواشی میں میں نے صوفیائے متقدمین کے افکار و عقاید کی روشنی میں اپنی حیثیت واضح کی ہے۔ یہ طریق محض اس لئے اختیار کیا گیا تھا تاکہ اس ملک کے لوگ میرے خیالات بآسانی سمجھ لیں۔ ورنہ قرآن حکیم، صوفیائے کرام اور مسلمان فلسفیوں کے افکار سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسرار کے پہلے ایڈیشن میں جو دیباچہ لکھا تھا اُس میں یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے ؛

میرا دعویٰ ہے۔ کہ "اسرار" کا فلسفہ مسلمان صوفیا اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔ اور زمان و وقت کے متعلق برگساں کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لئے نئی چیز نہیں۔ قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں۔ بلکہ اس میں انسان کی معاش و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ ... سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اُن کا تعلق الٰہیات کے ہی مسائل سے ہے ... اہل علم جب ان مسائل کو مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے ... ہے۔ تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے ... کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اہل مغرب اسلامی فلسفے کی تعلیم سے ناآشنائے محض ہیں۔ اے کاش مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ میں اس موضوع پر ایک بسیط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے روشناس کراتا کہ دنیائے مختلف قوموں کے فلسفیانہ خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ ہیں ؛

چراغ حسن حسرت

علامہ سر اقبال کے اُستاذ

شمس العلما مولوی میر حسن مرحوم

(از جناب شیخ آفتاب احمد صاحب بی اے آنرز علیگڑھ)

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی ... رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی ... بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں ... کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

(التجائے مسافر)

"خانقاہِ عظمتِ اسلام" کے اس "طور در آغوش" گوشہ میں جہاں اقلیمِ تصوف اور روحانیت کا تاجدارِ اعظم تاریخ ادبیات کے دو نامور ترین شخصیتوں یعنی خسرو اور غالب کے پہلو میں [illegible] ابدی نیند کے مزے لے رہا ہے۔ وہاں آج سے ٹھیک ستائیس - [illegible] سب سے بڑے شاعر اور فلسفی اقبال نے "[illegible]" [illegible] "دوشیزۂ گفتار کے چرچے" ہندوستان کے فلک بوس پہاڑوں اور [illegible] افغانستان جرمنی اور ایران کے ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین و آفرین وصول کر رہے ہیں۔ یہ دعا اُس وقت پڑھی جبکہ "خرابِ علم کی لذت" نگارخانۂ ہندوستان سے اسے کشاں کشاں انگلستان لئے جا رہی تھی۔ اور جبکہ اُس کی شاعری کے کمالات نے عروسِ نو کی طرح اپنے حسین و جمیل چہرے پر سے ابھی نقاب سرکانا

شروع کیا ہی تھا۔ وطن کو خیرباد کہتے ہوئے انسان کے دل و دماغ پر جو رقت آمیز کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اُس کا صحیح نقشہ کھینچنا شاعر کے پرواز تخیل کی سرحد سے دور، مصوّر کی سحر آفرین رنگ آمیزیوں کے احاطے کے امکان سے کہیں بعید اور نثّار کی مضمون آفرینی کے تصوّر سے بھی باہر ہے۔ یہ تو عوام کے جذبات کا حال ہے۔ رہا اس شخص کے جذبات تو اس سے کہیں نازک تر ہیں جو خود کہتا ہے ع "خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے"۔ اس لمحہ میں تلازمِ اخلاص و عقیدت کی اس بہترین ساعت میں اپنے عزیز ترین خواہشات ہی ہوسکتے ہیں۔ اور بس۔ اقبال جب علم و عمل کی ارزانی کی دعا مانگ چکا تو سائل کی التجا نے دفعۃً پلٹا کھایا۔ اور محبوب ترین شخصیتوں کی طرف منتقل ہوگئی۔ ایک سعادتمند فرزند کی طرح اُس نے اب سب سے پہلے جس تمنا کا اظہار کیا وہ "پھر - قدم مادر و پدر پہ جبیں" تھی۔ اور اس کے بعد وہ آرزو ہے جو ان اشعار میں مستتر ہے۔ جو ان سطور کے زیب عنوان ہیں۔ یہ اشعار حقیقتاً بہترین شاہد اس ارادت و عقیدت کے ہیں جو شاگرد کو اُستاد یا اقبال کو مولوی میر حسن سے ہے۔ اقبال کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ جب تک اس میں ہندوستان کے اس طوطیِ شکرفشاں یا بلبلِ شیریں نوا کے اس محسن اُستاد کے حالات شامل نہ ہوں جس کے فیض سے اقبال "ذوق تپش سے آشنا ہوا"+

یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعر کے خمیر مایۂ خاک میں وہ عناصر آفرینش عالم کے وقت سے ودیعت ہوچکے ہوتے ہیں۔ جو گوہر ہائے معانی کی کان اور زبان کی جان ہوتے ہیں۔ شاعر انگریزی کے ایک مشہور مقولہ کے مطابق بطنِ مادر سے ہی شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اور عربی کے ایک مسلّمہ قول کی رو سے شاعر کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہوتا۔ اس درخشاں حقیقت کی موجودگی کے باوجود بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شاعر کے خیالات پر اپنے مطالعہ گرد و پیش کے حالات اور سب سے بڑھ کر اُستاد کے رجحانات اور خیالات کا بہت ہی نمایاں اثر ہوتا ہے۔ شکسپیر اگر تھیئٹر میں سائیس کی ملازمت اختیار نہ کرتا تو آج دنیا اُسے ڈرامہ کا مہر منیر تسلیم نہ کرتی۔ فردوسی نے محمود کے دربار میں باریابی حاصل کرنے سے پیشتر شاہنامہ کا آغاز کر رکھا تھا مگر شاہنامہ اس شان سے کبھی مکمل نہ ہوتا۔ اگر محمود کی علم پروری اُسے اپنے سایۂ

عاطفت میں نہ لے بیٹھتی۔ غالب عبدالصمد ایرانی کی عنایات سے انکار کرتے ہوئے اپنی ظرافت طبع کا ثبوت دیتے ہیں تو دیا کریں۔ علمی مذاق انہیں کا پیدا کردہ تھا۔ انہوں نے فارسی کا شوق پیدا کیا۔ اتفاق تھا کہ فارسی کی بجائے غالب اُردو کے بہترین شاعر بنے۔ اقبال کو قدرت نے دل و دماغ کی تمام قوتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی تھیں۔ مولوی میر حسن صاحب کی نگرانی نے سونا پر سہاگہ کا کام کیا۔ اقبال کے کلام نے خفتہ قوم کو بیدار کیا۔ نئے احساس خودداری کی وہ شراب پلا دی جس نے "قلب مسلم کو تڑپا دیا" اور "روح کو گرما دیا"۔ قوم کی ساقی گری کرنے سے پیشتر وہ بھی کسی خمخانہ سے سرشار ہو کر نکلا تھا۔ یہ میکدہ مولوی صاحب مرحوم کا مدرسہ تھا جن کے متعلق اقبال بجا کہہ سکتے ہیں ؎

مغانم را مئے او جام جم کرد درونِ قطرہ ام پوشیدہ یم کرد

تمہید کو چھوڑ کر اب میں مولوی صاحب مرحوم کے حالات کی طرف آتا ہوں۔ ۱۸۴۴ء کا سن تھا۔ مغلیہ کی علم نوازیاں افسانہ ہوئے جا رہی تھیں۔ شیدایانِ ادب کی اشکبار آنکھیں علم پرور سلسلہ شہنشاہیت کو جاں بلب دیکھ کر علم کی ترقی کے احتمالات پر نوحہ کناں تھیں۔ اسوقت

خاک پنجاب از دم او زندہ گشت صبح ما از مہر او تابندہ گشت

یعنی میر حسن سیالکوٹ کے ایک سادات خاندان کے ہاں پیدا ہوئے۔ والدین کو کیا معلوم تھا کہ علم کی جو خدمت مغلیہ خاندان کے زرفشاں عہد میں پرورش پانے والے شعرا اور فلسفی نہ کر سکے۔ وہ اس نونہال کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہوگی۔ جو اس مولود مسعود کی نوازشوں سے سرفراز ہوگا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس وقت پیدا ہونے والا بچہ ایک دن "بدخشان شعر کے "کوہ نور" کو اپنے جواہر تراش ہاتھوں سے اس قابل بنا لے گا کہ وہ تاجِ ادب کے لئے محبوب ترین سرمایۂ نازش و افتخار ہو۔ آغوش مادر کو چھوڑنے کے ساتھ ہی وہ حقائق و معارف کے اس شیریں سرچشمہ سے اپنی تشنگیٔ شوق کو بجھانے لگا۔ جسے مسلمانوں کی اصطلاح میں "قرآن" کہتے ہیں۔ سات سال کی عمر میں یہ ہونہار بچہ میر حسن سے حافظ میر حسن بنا۔ اس فریضہ کی تکمیل کے بعد علوم مروجہ کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ اوّل ہی اوّل مولانا محبوب عالم

سیالکوٹی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ اور بعد ازاں مولوی بشیر احمد سے عربی پڑھی۔

سولہ برس کی عمر تھی کہ اس خوردسال معلّم نے قوم کے بچّوں کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کیا۔ ملازمت کی تلاش ہوئی تو مشن اسکول میں استاد مقرر ہوئے اور تمام عمر مشن کی ملازمت میں گذار دی۔ پہلے پرائمری جماعتوں کو فارسی۔ عربی۔ حساب۔ جغرافیہ وغیرہم مضامین پڑھاتے رہے۔ مگر بقول آنریبل جسٹس سر عبدالقادر دیباچہ نگار "بانگِ درا" ان کی تعلیم کا ہمیشہ سے یہ خاصّہ رہا ہے کہ طالب علم کے دل میں تحصیل علم کا صحیح شوق پیدا ہوجاتا۔ پرائمری کی معلّمی ختم ہوئی تو مڈل اور ہائی جماعتوں کے استاد بنے۔ مشن اسکول منازل ارتقا کو حیرت انگیز زُود رفتاری کے ساتھ طے کرتا ہُوا کالج بنا۔ تو مولوی صاحب اس میں السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر بنے اور ترسیٹھ سال کی ملازمت کے بعد دیدۂ یعقوب کی سی بصارت کے مالک ہوجانے کی بنا پر ۱۹۲۹ء میں اس محبوب مشغلہ سے دست کش ہوئے۔ اور اسی سال یعنی ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو عالمِ عقبیٰ کو سدھارے۔

جوہر شناسی مولوی صاحب کے درس و تدریس یا طریقِ تعلیم کی یہ حیرت انگیز کامیابی دراصل جوہر شناسی کی اس غیر معمولی استعداد پر مبنی تھی۔ جو ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ یہ تو معمولی بات تھی کہ ذہین سے ذہین طالب علم کا چہرہ دیکھ کر اُسے کہہ دیتے کہ آج تمہیں سبق یاد نہیں۔ عمرِ آخرت سے چند ماہ پیشتر بصارت ضائع ہوجانے کی بنا پر ایک ملازم رکھنے کی ضرورت پیش آئی جو صرف اُن کی خور و پرداخت کرتا۔ تو ملازم کی آواز پہچان کر کہنے لگے یہ شریف آدمی ہے اسے ضرور رکھنا چاہئے۔ چنانچہ واقعات نے اس قیاس پر مُہرِ تصدیق ثبت کی۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اور ایران والوں کے ہاں بھی مشہور ہے "سالے کہ نکوست از بہارش پیدا"۔ اقبال شروع سے ہی ہونہار تھا۔ مولوی صاحب نے دیکھ لیا تھا کہ یہ نونہال آئندہ چل کر کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ اس کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ عربی۔ فارسی اور ہر وہ علم جو السنۂ مشرقیہ کے خزانہ میں محفوظ ہے۔ اس کی ایسی تعلیم دی کہ شاگرد استاد کے "دارالعلوم" سے رخصت ہونے سے پیشتر ہی ایک فاضلِ روزگار شخصیت بن چکا تھا۔ اقبال نے شعر کہنا شروع کیا تو اس کی وہ داد دی کہ اسے

اپنے ہنر کا اظہار ہونے لگا۔ مگر یہ سمجھنا بیجا ہے کہ وہ ہر اس قومی کی جبلی یا عطیہ ایزدی کے بغیر" اور بازوقت شاعر بننا چاہتا ہو حوصلہ افزائی فرماتے۔ اس کی ایک عمدہ مثال مولوی صاحب کبھی کبھی خود ہی اپنے ان شاگردوں کو بتایا کرتے تھے جو شاعری کے شوقین ہوتے۔ ... نے ایک ذہین طالب علم مولوی صاحب کے دوستوں میں ... (اگر یہ لفظ صحیح تسلیم کر لیا جائے) پر ہر روز عربی اور فارسی پڑھنے کو حاضر ہوتا۔ طالب علم ذہین تھا اور مولوی صاحب اکثر اس کی تعریف فرمایا کرتے۔ ایک دن ہونہار طالب علم کے دماغ میں یہ بات سمائی جو ایک پوری غزل کہہ کر مولوی صاحب کے پاس لے گئے۔ روزمرہ کا سبق ختم ہوا استاد نے شاگرد کو آفرین دی۔ اس کی ہمت بڑھی اور کہا "قبلہ چند شعر موزوں ہو گئے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں" "ہاں بھائی ضرور" مولوی صاحب نے کہا۔ طالب علم نے اس استادانہ انداز سے جو کسی ملک الشعرا ہی کو زیب دیتا جیب میں سے ایک پرزہ کاغذ نکالا اور مولوی صاحب سے کہا "قبلہ سنئے عرض کیا ہے" یہ کہہ اور شعر پڑھنے شروع کئے۔ مولوی صاحب ہمہ تن بیٹھے سنتے رہے۔ جب سنا چکا تو مولوی صاحب نے کہا ذرا وہ چھڑی تو اٹھا لانا وہ غریب اٹھا اور چھڑی مولوی صاحب کے ہاتھ میں دیدی۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ اس سے کیا کرنا چاہتے ہیں اس سلوک کا تو اس نے تجربہ بھی نہیں کیا تھا۔ مولوی صاحب نے چھڑی ہاتھ میں لے نوخیز شاعر کی وہ مرمت کی کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ اس کے بعد اس سے کہا "شاید میں تجھ سے پیار سے کہتا کہ اس فن سے باز آؤ تو تم نہ سنتے۔ اس لئے مجھے یہ تلخ فرض انجام دینا پڑا ہے۔ تمہیں قدرت نے شاعر پیدا نہیں کیا۔ اگر اس میں دسترس حاصل کرنے کی کوشش کروگے تو زندگی ناکام رہیگی۔ اور اس قابلیت کے باوجود کامیابی تم سے کوسوں بھاگے گی"۔ استاد کا کہنا شاگرد کے لئے وید یا پران سے کم نہ تھا۔ اس نے اس دن سے توبہ کی۔ زندگی ایسی کامیاب ہوئی کہ مقابلہ کے امتحان میں شریک ہو کر پراونشل سروس سے زندگی کا آغاز کیا +

والدین کی اطاعت اور سعادتمندی

ان کے والدین مدت ہوئی انتقال کر چکے تھے۔ لیکن ان کی وفات سے اس وقت تک کہ وہ بیماری سے اٹھنے سے بالکل معذور نہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے ۳۳ سال بلا ناغہ ان کی قبروں پر جانا اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ انتہائی گرمی کڑکڑاتا

جاڑا ہو یا لو، دھوپ ہو یا بارش یا آندھی کا طوفان کوئی رکاوٹ ایسی نہ تھی جو انہیں قبرستان پہنچ کر والدین پر فاتحہ پڑھنے سے باز رکھ سکتی۔ اس شعار میں اس وقت بھی ناغہ نہیں ہوا جب اُن کی کمر ضعیفی کی وجہ سے دوہری ہو چکی تھی۔ چلنا پھرنا بھی مشکل تھا۔ اور قبرستان کی آمد و رفت پر ایک گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔ اس حالت میں کہ قبرستان آپ کے مکان سے کوئی دو یا تین فرلانگ تھا۔ والدین کا یہ احترام شاید اولیا یا انبیا کا شعار ہو۔ مگر عام لوگوں میں سے تو ایک آدمی بھی ملنا مشکل ہے۔ ان کی ... ایک اور مثال ... صاحب منشی ... صاحب نے میرے تاریخ سیالکوٹ کے میر حسن نمبر میں لکھی ہے۔ ... ناظرین ہے۔ جنتری کی مشہور کتاب نجوم الفرقان منشی صاحب مذکور کو کسی دوست سے مستعار مل گئی۔ یہ ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے۔ جبکہ مولوی صاحب کی عمر ۷۸ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ انہوں نے مولوی صاحب کی خدمت میں ملاحظہ کے لئے پیش کر دی کہ جوہر کو جوہری کے سامنے پرکھ کے لئے پیش کیا۔ مولوی صاحب نے کتاب دیکھ کر فرمایا "ایک سو جید علما اگر پورے سو سال تک مجموعی کوشش کریں تو ایسی کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ تعجب ہے کہ ایک المانوی فاضل نے اپنی واحد کوشش سے مرتب کر لیا" کتاب کی قیمت اُن کی اُس وقت کی استطاعت سے بالاتر تھی یعنی قریباً تیس روپیہ۔ مگر مذاق علمی جیب و کیسہ کی وسعت کا متمنی نہیں۔ کتاب ایک روز کے لئے عاریتاً منشی صاحب سے لے لی۔ اب باقی ماندہ تفصیل خانصاحب موصوف کی زبانِ قلم سے سنئے۔

"یہ موسم شدتِ گرما کا تھا۔ دوسرے دن دوپہر کو حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت اپنے مکان کے زیرین حصہ میں جو بالکل تنگ و تاریک ہونے کی وجہ سے قدرے خنک تھا مٹی کا چراغ جلائے ایک بوریئے پر تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے سلام عرض کیا تو فرمانے لگے بہت مشکور ہوں۔ کتاب لے جاؤ۔ میں نے عرض کیا حضور دن کو چراغ جلائے بیٹھے ہیں کیا ماجرا ہے۔ فرمانے لگے کچھ نہیں ابھی ابھی فارغ ہوا ہوں۔ کل جس وقت تم کتاب دے گئے تھے۔ میں اُسیوقت بازار سے کاغذ لے آیا تھا۔ اور اُس وقت سے متواتر یہاں بیٹھا ہوں۔ چنانچہ بحمد اللہ ساری کتاب تمام و کمال جدول بجدول نقل کر کے ابھی ابھی فارغ ہوا ہوں۔ کل سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ یہ کہتے ہی کاغذ کا ایک موٹا سا پلندہ میرے سامنے رکھ دیا۔" جہانگیر یا شاہجہان کا زمانہ

نہ تھا۔ خانخاناں کی علم پروریاں مدت ہوئی افسانہ ہوکر رہ گئی تھیں۔ تاہم مولوی صاحب کے ایک فارغ البال قدرشناس[1] نے جب یہ واقعہ سنا تو کتاب مذکور منگوا کر مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ مستعدی اور ایفائے عہد کے لئے سعیٔ بلیغ کا ایسا واقعہ آنحضرتؐ کے بعد کسی شخص کی زندگی میں نہیں مل سکتا +

اخلاق

حلم۔ اخلاق۔ غربا نوازی۔ اقربا پروری۔ اور راستبازی کے جمیع اوصاف مبداء فیاض نے کچھ اس فراخدلی سے انہیں ارزانی فرمائے تھے۔ کہ ان سے بہتر ہیکل اشیاء رندا اخلاق دنیا دار آدمیوں میں ملنا از قبیل محالات ہے۔ وہ جماعت میں طالب علموں کے ساتھ بہت سختی کا برتاؤ کرتے تھے۔ مگر کسی آدمی سے کبھی سخت کلامی نہیں کی۔ طالب علموں کی اپنے ہاں دعوتیں کرتے۔ اور انہیں اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتے کبھی کسی کو آزردہ نہیں کرنا چاہتے تھے +

احکام الٰہی کا احترام

گرمی کا موسم ہے اور گرمی بھی اس شدت کی کہ نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی۔ سیالکوٹ جیکب آباد بنا ہوا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ رمضان کا مہینہ ہے۔ مولوی صاحب دوپہر کے وقت کالج سے واپس گھر تشریف لے جا رہے ہیں۔ شاہراہ حیات کی اسی منزلیں طے کر چکے ہیں۔ اس لئے اب بھوک اور پیاس کی تکالیف برداشت کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ مگر مذہبی احکام کا احترام ہے کہ اس معذوری کو خاطر میں لانے ہی نہیں دیتا۔ پیاس کی شدت جو بڑھتی ہے تو مولوی صاحب غشی سے گر جاتے ہیں۔ ارد گرد ہندو اور سکھ حضرات کی دکانیں ہیں جو کسی وقت مولوی صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ اور اب انہیں دیوتا سمجھتے ہیں۔ ایک سکھ شاگرد آتا ہے اور انہیں اٹھا کر اپنی دوکان میں لے جاتا ہے۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دئے جاتے ہیں۔ پنکھے کی ہوا دی جاتی ہے مگر ابھی نیم بیہوشی کا عالم ہے۔ کہ ایک اور ہندو شاگرد اضطراب کی حالت میں یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ انہیں صندل کا شربت پلایا جائے۔ سکھ عطار اس بات کو خوب جانتا ہے کہ بوڑھا استاد جان دیدیگا۔ مگر روزہ نہ چھوڑیگا۔ وہ سب کہ اس پر آمادہ نہیں ہوتا۔ آخر ایک اور آدمی شربت کا ایک گلاس تیار کرتا ہے۔

---

[1] یہ کتاب ڈاکٹر صاحب نے جرمنی سے منگوا کر انکی خدمت میں پیش کی تھی +

اور جونہی وہ آسمان سے مولوی صاحب کے لبوں سے مس کرتا ہے تو وہ دانتوں کو مضبوطی سے بند کر لیتے ہیں اور انگلی کے اشارہ سے اس جاں بخش جام سے مبرا ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد مولوی صاحب کی حالت بحال ہوتی ہے۔ وہ تانگہ پر سوار ہو کر گھر پہنچتے ہیں۔ افطاری کے لئے ابھی سات گھنٹہ کا انتظار باقی ہے۔ وہ تمام دن گیلی چادر اوڑھ کر بیٹھے رہتے ہیں۔ عصر کی نماز کے بعد قرآن شریف بھی پڑھتے ہیں۔ اکثر شاگرد مزاج پرسی کے لئے آتے ہیں۔ مگر کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ یہ تجویز پیش کرے کہ روزہ چھوڑ دیا جائے۔ آخر خدا خدا کر کے روزہ افطار کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ اور عزیز اور رشتے دار اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔ دوسرے دن جو کالج جاتے ہیں۔ تو حسب عادت روزہ سے ہیں۔ کسی نے پرنسپل صاحب کو بھی سارا حال کہہ سنایا۔ وہ بھی سخت متردد ہیں۔ آخر ایک مسلمان پروفیسر کی وساطت سے یہ پیغام مولوی صاحب تک پہنچاتے ہیں کہ مذہب اس ضعیفی کی حالت میں تکالیف برداشت کرنے کا سبق نہیں دیتا۔ انسان پر اپنی آسائش کو ملحوظ رکھنا بھی فرض ہے۔ اب ذرا سنئے کہ یہ جواں ہمت بزرگ مولوی صاحب کیا جواب دیتے ہیں۔ وہ اس قابل ہے کہ عشاق اسلام کی تواریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے۔ پیامبر سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ "مجھے افسوس ہے اس خدمت کے لئے آپ کو انتخاب کیا گیا۔ کاش آپ یہ پیغام مجھ تک نہ پہنچاتے۔ پرنسپل صاحب سے کہئے کہ میری کمر ضعیفی اور آپ کی عنایات کے بوجھ سے دوہری ہو رہی ہے۔ اس عنایت اور نگہداشت کا ہزار بار شکریہ۔ کالج سے میرا تعلق معاشی بنا پر ہے۔ ملازمت سے شکم پری مقصود ہے لیکن جس تعلق کی بنا پر یہ مصائب یا تکالیف برداشت کرتا ہوں۔ وہ عشق اور محبت کا رشتہ ہے۔ اور اس راہ میں جان ایک ارمغان محقر کی حیثیت رکھتی ہے۔ معاشی ذرائع منقطع ہو جائیں تو غم نہیں لیکن مذہبی احکام سے روگردانی میرے لئے ممکن نہیں" پرنسپل صاحب ایک فرشتہ سیرت پادری ہیں۔ وہ یہ جواب سنکر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور پھر کبھی اس بات کا تذکرہ نہیں کرتے +

لباس آپ کو یقیناً مولوی صاحب کے نیاز حاصل کرنے کا اشتیاق پیدا ہو چکا ہے۔ آیئے میرے

ساتھ صبح صبح مرے کالج روڈ پر چلئے۔ وہ دیکھئے وہ سامنے ایک سفید ریش خمیدہ قامت مولوی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ کمر ضعف کی وجہ سے کمان کی طرح خم ہو گئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ عصا ہاتھ میں ہے۔ دائیں بائیں دو آدمی کتابیں کھولے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ایم۔ او۔ ایل کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور دوسرے منشی فاضل کے امتحان میں شریک ہونگے۔ لباس بھی دیکھئے صاف ستھرا سر سے لے کر پاؤں تک سفید لباس ہے۔ سر پر سفید پگڑی۔ بدن پر چغہ نما لٹھے کا سفید کوٹ کندھے پر گز بھر کا ایک سفید رومال بھی ہے۔ اس کے ایک کونہ میں کچھ بندھا ہوا ہے۔ یہ کیا ہے؟ "بی" ٹائم پیس۔ کس کام کے لئے؟ مولوی صاحب اسے وقت دیکھنے کے لئے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اکثر طالب علم کبھی کبھی مذاق بھی کرتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب ہنسی میں ٹال دیتے ہیں اور کہتے ہیں مجھے کام سے غرض ہے۔ فیشن سے سروکار نہیں۔

سادگی مولوی صاحب کی طبیعت حد درجہ سادہ تھی۔ جو کام خود کرنے کی ہمت ہوتی وہ خود کرتے۔ شہر میں ایسے آدمی بھی موجود تھے جو مولوی صاحب کا کوئی کام کرنا سعادت سمجھتے۔ گھر پر ملازم موجود تھا۔ ہر طرح کی فارغ البالی نصیب تھی۔ اس کے باوجود گھر کا سودا سلف وہ خود خرید فرماتے تھے۔ بالخصوص سبزی تو ہمیشہ آپ خریدتے۔ اکثر لوگ اصرار کرتے کہ انہیں رومال میں بندھی ہوئی سبزی کی گٹھڑی گھر تک پہنچا دینے کی اجازت دی جائے۔ وہ کبھی اس پر رضامند نہ ہو سکے۔ ہاں یہ مشہور ہے کہ اقبال اگر کوئی خدمت بجا لانے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تو انہیں یہ اجازت مل جاتی۔ ہمیشہ رات کو مٹی کے دئیے کی مدد سے مطالعہ فرماتے۔ اور یہ اصول آخری وقت تک قائم رہا۔ گھر میں ایک چھوٹا سا کمرہ نشستگاہ کے طور پر وقف رکھا تھا۔ اس میں کھجور کی چٹائی بچھا دی تھی۔ بس۔ اور کوئی فرنیچر نہ تھا۔ اسی چٹائی پر رائے بہادر کنور سین کبھی کبھی آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ جس زمانہ میں وہ جموں ہائیکورٹ کے چیف جج تھے۔ وہ بھی مولوی صاحب کے خاص شاگردوں میں سے ہیں۔

احسان شناسی جب آزاد مرحوم کی بڑھتی ہوئی مجذوبیت نے انہیں ملازمت کی پابندیوں سے آزاد

کردیا تو اُن کے جانشین کی تلاش ہوئی۔ چنانچہ نظرِ انتخاب مولوی صاحب پر پڑی۔ ان سے جب اس اسامی کے متعلق کہا گیا تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت مولوی صاحب کی جو تنخواہ تھی اُس سے چار گنا کی توقع گورنمنٹ کالج میں ملنے کی تھی لیکن جاہ و مرتبت یا مال و زر کی خاطر اصول قربان نہیں کئے جا سکتے۔ مولوی صاحب کے احباب نے بے اصرار کیا۔ تو انہوں نے کہا "مشن نے میری پرورش اُس وقت کی جب میں ابھی بالکل ناآموز تھا۔ ان لوگوں کے طفیل مجھے یہ فراغت نصیب ہوئی کہ اطمینان سے اپنے علم میں اضافہ کرتا رہا۔ یہ احسان فراموشی ہے کہ اس وقت حکومت کی قدردانی کو دیکھ کر اپنے دیرینہ محسن کو بھول جاؤں" سچ تو یہ ہے کہ کالج نے بھی ان کی خوب قدر کی۔ جب زیادہ ضعیف ہو گئے تو ان کے لئے ٹائم ٹیبل میں ہمیشہ خاص مراعات ملحوظ رکھی گئیں۔ جب بصارت سے محروم ہو گئے۔ تو ستر روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔ اگرچہ کسی پرائیویٹ ادارہ میں یہ ممکن نہ تھا۔

طرزِ تدریس

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے" یہ تھا اُن کا اصول۔ بچے۔ جوان۔ بوڑھے اُن کے مکان پر حاضر ہو کر انوارِ علم سے مستفیض ہوتے۔ خدمتِ علم اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ امیر غریب سب کے لئے تعلیم مفت تھی۔ درس و تدریس کے عوض کوئی حقیر سے حقیر خدمت یا ہدیہ بھی قبول نہ کرتے۔ اکثر کہا کرتے کہ علم کو اس طرح پہ فروخت کرنا اس کی تضحیک اور اپنی تذلیل ہے۔ تعلیم کا طریقہ عجیب تھا۔ طالب علم عربی کے کورس کی نثر یا اشعار پڑھتا جاتا۔ نثر کے لفظی معنی بتاتے جاتے۔ اور پھر طالب علم سے فقرات کے معنی پوچھتے اور اگر نظم پڑھانا ہوتی تو ہر شعر کے بیان میں متعدد اُردو اور فارسی کے مترادف اشعار پڑھتے چلے جاتے۔ ان کو فارسی اور اردو کے اساتذہ کے بے حساب اشعار زبانی یاد تھے۔ چنانچہ خانصاحب منشی سراج الدین جنہیں شعر سننے کا شوق اکثر اُن کے آستانہ پر کھینچ لاتا۔ رقمطراز ہیں "انہیں بلا مبالغہ علمِ شعر کا زندہ کتب خانہ کہا جا سکتا تھا۔ ادنیٰ موقعہ او رمحل پر عرب جاہلیت سے لیکر فارسی اور اُردو کے استادوں کو لپیٹتے ہوئے وارث شاہ۔ فضل شاہ۔ بلھے شاہ اور علی حیدر کے کلام سے وہ وہ بے نظیر اشعار پیش فرماتے کہ ذوقِ صحیح کی روح فی الجملہ وجد میں آجاتی تھی۔ سعدی۔ حافظ۔ فردوسی۔

نظامی۔ خاقانی۔ انوری۔ عرفی۔ نظیری سے لیکر بیدل اور غالب تک تو ہاتھ باندھے موزونی طبع کے سامنے کھڑے ہی رہتے تھے۔ مگر ان کے علاوہ خالص ہندوستانی شعرا کا کلام بھی ایسے ہی حفظ تھا جیسے بعض یہود کو توریت اور مسلمانوں کو قرآن حفظ ہوتا ہے"۔ یہی خانصاحب آئندہ سطور میں مولوی صاحب کے گھر والے سکول کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس کا ہو بہو یہاں نقل کرنا خالی از لطف نہیں۔ "صبح و شام جب اپنے بیت العلوم (مسکن) پر تشریف رکھتے۔ تو گردوپیش کے بوریئے عجیب منظر پیش کرتے تھے۔ ایک طرف ایک جید مولوی صاحب کو تفسیر قرآن کے نکات سمجھاتے جاتے تھے۔ تو دوسری طرف کسی دوسرے مولینا کو حدیثِ نبوی کا درس دیتے ہوئے چند عربی فارسی کے فضیلت خواہ طلاب کے ساتھ ساتھ چند "بالغ العلوم" اور "مالک العلوم" درجات کے طلبا کی مشکلات کو بھی اسی طرح حل فرماتے جاتے تھے۔ کہ حضرت کا ایک ایک لفظ سننے والوں کے دل و دماغ پر برقی اثر پیدا کرتا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ انہیں بلند درجہ طالبانِ علم کے ساتھ ساتھ ایک جماعت چھوٹے بچوں کی بھی بیٹھی نظر آتی تھی۔ کسی کے ہاتھ میں قاعدہ ابجد ہے تو کوئی اردو کی پہلی سامنے رکھے بیٹھا ہے۔ کوئی قواعد بغدادی اور پارۂ عم کی الجھنوں میں گھرا ہوا ہے۔ ایک درویش صورت بزرگ ہیر وارث شاہ کا کوئی ادق مقام سمجھنے کے لئے چادر میں سر لپیٹے بیٹھے ہیں"۔ یہ ایک دھندلا سا نقشہ ان صاحب کے قلم سے ہے جو مدتوں ان کے پاس جاتے رہے۔ اکثر شاگردوں کا یہ دستور تھا کہ جب مولوی صاحب کالج جانے کے لئے گھر سے نکلتے تو ساتھ ہو لیتے۔ اور ان کے کالج پہنچنے تک اپنا سبق پڑھ لیتے +

مشاہیر عہد سے تعلقات

سرسید مرحوم سے پہلی مرتبہ ملاقات ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ دونوں کے تعلقات دوستانہ قایم ہو گئے۔ جو اوّل الذکر کے سفر آخرت اختیار کرنے تک قایم رہے۔ سرسید کی زندگی میں اس کے بعد کوئی سال ایسا نہ تھا کہ مولوی صاحب مرحوم سرسید مغفور کی دعوت پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک نہ ہوئے ہوں۔ سید کے اس دعوے "دلے بریاں و عشقِ مصطفےٰ دارم" کا بہترین ثبوت وہ واقعہ ہے جس کے مولوی صاحب مرحوم عینی شاہد تھے۔ سرسید

مرحوم کی زندگی کے آخری دن تھے۔ مولوی صاحب کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لئے علی گڑھ میں تشریف فرما تھے۔ رات کو دیر تک کسی اہم مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ اور پھر دونوں بزرگ سو گئے۔ آدھی رات کے وقت مولوی صاحب کی آنکھ کھلی تو سرسید والے پلنگ کو خالی پایا۔ مولوی صاحب کو کچھ تردد ہوا۔ باہر نکل کر دیکھا تو سرسید برآمدہ کے ایک کونہ میں کھڑے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے دعا کر رہے تھے کہ خدا اُن کی قوم کو گمراہی سے بچائے۔ اور ترقی کی طرف لائے۔ اس نیک مرد کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے سرسید کے اس اخلاص کا مرحوم پر اسقدر اثر ہوا کہ تا دم مرگ اُن کے مداح رہے۔ سرسید کی وفات کے بعد اُن کی سالگرہ کے دن حیات جاوید کا مطالعہ کیا کرتے۔ اور یہ طریقہ سال وفات تک جاری رہا۔

مولوی نذیر احمد اور علامہ شبلی سے ان کے مراسم تھے۔ مگر محمد حسین آزاد مرحوم سے تعلقات بہت گہرے تھے۔ چنانچہ جب کبھی لاہور میں جانا ہوتا۔ تو ان کے ہاں ٹھہرتے۔ آزاد ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ آزاد مرحوم نے مولوی صاحب کے کہنے سے بعض شاعروں کے حالات وغیرہ میں معتدبہ اضافہ کیا۔

حدیث دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد　　دگر از سر گرفتم قصۂ زلف پریشاں را

مولوی صاحب اور اقبال

مولوی صاحب اور اقبال کے تعلقات ان سطور کے حوالۂ قلم کرنے کے محرک ہوئے۔ اس لئے اب ان کا تحریر کرنا لازمی ہے۔ یوں تو اقبال کا نام تجویز کرنے والے کو ایک پیغمبر سمجھنا چاہئے۔ کہ کیا موزوں نام رکھا۔ مگر اس معاملہ سے ہمیں بحث مقصود نہیں۔ ہمارے شاعر نے جب تحصیل علم کا آغاز کیا تو اُسی وقت بلند اختری اور اقبالمندی نے اُس کا ہاتھ میر حسن صاحب کی عالمانہ غور و پرداخت کے سپرد کیا۔ مولوی صاحب کا ایک فرزند رشید اقبال کا ہم جماعت تھا۔ اور اس کے علاوہ اقبال کے والد ماجد کے ان سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے بچے انگریزی سکولوں میں تعلیم پانے کے ساتھ ساتھ مساجد میں بھی پڑھا کرتے تھے۔ شیدایانِ ملت کی اکثر یہ خواہش ہوا کرتی کہ اُن کی اولاد تعلیم حاصل کر کے ملازمت کرنے کے بجائے علوم

مذہبی میں قابلِ نماند دسترس حاصل کرے۔ مسلمانانِ سلف نے ہمیشہ عقبیٰ کی بہتری کو دنیوی جاہ و جلال سے اعلیٰ و ارفع تصور کیا۔ چنانچہ یہی حال اقبال کے والدین کا تھا۔ اقبال چوتھی جماعت میں تعلیم پاتے تھے کہ ایک دن ان کے والد ماجد مولوی صاحب کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ میں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ بچے کو آپ سکول کی تعلیم دینے کی بجائے دینیات کا درس دیا کریں۔ اور آئندہ یہ مدرسہ جانے کے بجائے مسجد میں ہی پڑھا کرے۔ اس وقت ایک عجب نازک گھڑی تھی۔ در اصل اردو شاعری کے لئے موت و حیات کا سوال درپیش تھا۔ مولوی صاحب مسکرائے اور فرمایا۔ "بچہ مسجد میں پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ مکتب میں پڑھنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ مدرسے ہی میں پڑھے گا۔" حقیقتاً استاد اس درخشاں مستقبل کو اپنی حقیقت شناس آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر جو کچھ آنکھ دیکھ رہی تھی اُسے لب پر نہیں لانا چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قابلیت کے جوہر کہیں دبے نہیں رہتے۔ کیا تعجب ہے کہ وہ مسجد میں تعلیم پانے کے باوجود بھی اس طرح آسمانِ شہرت پر آفتاب ہو کر چمکتے۔ شاعر بنتے یا امام الہند کہلاتے۔ دریا کو کاٹ کر خواہ کسی راہ پر ڈال دیجئے۔ وہ اپنی گذرگاہ بنا لیگا۔ بجلی کی طاقت اگر محفلِ علم و ادب کے قمقموں کو روشن نہیں کرتی تو وہ مسجد و کلیسا کی مجالس میں اس روشنی سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ اقبال شاعر نہ ہوتے تو شاید ہائیکورٹ کے جج بنتے یا کسی صوبہ کے گورنر ہوتے یا وزیر بنائے جاتے۔ مگر مولوی صاحب کے اثر کے بغیر "برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز" نہ ہوتے۔ اور یہ واقعہ حقیقتاً اُن کے "اقبال گر" کہلانے کا واحد کفیل ہو سکتا ہے۔ اُستاد اور شاگرد کے تعلقات "بل پیش کیجئے" والے حقیہ اصول پر مبنی نہ تھے۔ بلکہ یہاں کی فیس "دل و دماغ" کا ہدیہ تھا۔ ماہرینِ تعلیم اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ طالب علم کے رجحانات اور قوتِ ذہنیت مختلف تعلیمی مدارج پر حیرت انگیز طور سے تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر ہوتا ہے کہ مڈل سکول کا ہونہار طالب علم ہائی سکول میں پہنچ کر اپنی مایہ ناز قابلیت کو کھو بیٹھتا ہے۔ یا ایک اوسط درجہ کا طالب علم ہونہار ہو جاتا ہے یا اسے کسی مضمون سے خاص شوق کم ہو جاتا ہے۔ اور اس کی بجائے کوئی دوسرا مضمون مقبول ہو جاتا ہے۔

یہ انقلابات ہر طالب علم کی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض میں یہ تغیرات بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ اور بعض بالکل معمولی کالج کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی طالب علم کے رجحانات خصوصی نشو و نما پانا شروع کرتے ہیں مگر یہ سب "خطرناک مراحل" جہاں مذاق کے متغیر ہونے کے احتمالات تھے۔ اقبال نے مولوی صاحب مرحوم کی زیر نظر طے کئے۔ اور اقبال کے علامہ اقبال بننے یا تسلیم ہونے کے لئے مرور ایام کی شرط کی تکمیل باقی رہ گئی تھی فارسی عربی کا علم اور اسلامی معاملات سے والہانہ وابستگی اقبال کے کلام کی سب سے درخشاں خصوصیت ہے اور حقیقت میں یہی "اقبالیات" کا مابہ الامتیاز ہے۔ اور یہ سب مرحوم کی (اقبال نوازی) کے طفیل میں ہے شاگرد کی قابلیت نے استاد کے دل میں وہ گھر کر رکھا تھا کہ مولوی صاحب مرحوم اپنے نزدیک ترین عزیزوں سے علامہ اقبال کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں کہ مولوی صاحب بصارت سے محروم اپنی دنیا کو ایک چار پائی کی وسعت تک محدود پاتے تھے۔ علامہ اقبال ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہو کر دہلی علاج کے لئے تشریف لے گئے۔ اس حالت میں کہ استاد خود مرض الموت کے پنجہ میں گرفتار ہو رہے تھے شاگرد کی علالت کی اس قدر تشویش تھی کہ ایک آدمی کا یہ فرض قرار دے رکھا تھا۔ کہ وہ اسٹیشن پر سے جا کر "انقلاب" خرید کر لاتا۔ اور مولوی صاحب کو علامہ اقبال کی علالت کے متعلق تاریں پڑھ کر سنایا کرتا۔ یہ تو استاد کی شاگرد نوازی کا تذکرہ تھا۔ اب شاگرد کی استاد پرستی بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

گورنمنٹ کی جوہر شناسی کہئے یا مصالح ملکی کا تقاضا سمجھئے۔ کہ جبیں سائی یا ناصیہ فرسائی کا کوئی خراج وصول کئے بغیر ڈاکٹر اقبال کو سر اقبال بنا دینے کی ٹھانی۔ گورنر پنجاب نے اس عنایت خسروانہ کے ایما کا اظہار فرمایا۔ اقبال نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ مگر ساتھ ہی ایک شرط بھی پیش کر دی کہ مجھے یہ خطاب بسر و چشم منظور ہے مگر اس شرط پر کہ میرے استاد کو شمس العلماء بنا دیا جائے +

استاد اور شاگرد دونوں نے صرف ایک موقع پر باہم طبع آزمائی کی جو سر سید مرحوم کی تاریخ وفات کے لئے تھی۔ شاگرد نے ایک پوری آیت قرآن شریف کی تلاش کی۔ اور مولوی صاحب نے "غفر لہ"

کے لفظ سے سال وفات نکالا۔ چنانچہ مولوی صاحب والی تاریخ ہی سر سید مرحوم کے لوح مزار پر کندہ ہے۔ یہ وہ موقع تھا کہ ہندوستان کے ہر مسلمان شاعر نے تاریخ کے لئے طبع آزمائی کی تھی ۔

آفتاب احمد

اقبال کی شاعری

(از جناب ڈاکٹر تلک راج انند ایم۔ اے صاحب مقیم انگلستان)

یہ مضمون رائل اکاڈیمی جرنل میں بہ زبان انگریزی شائع ہوا تھا۔

مشرق میں ایک معاشرتی۔ سیاسی اور ذہنی نشاۃ ثانیہ کی صبح طلوع ہو چکی ہے۔ اور اقبال اس دور احیا کے سب سے بڑے علمبرداروں میں سے ہیں۔ انہوں نے ایک جلیل القدر شاعر اور بالغ نظر فلسفی کی حیثیت سے ہندوستان کی وطنی اور ادبی تحریکوں کے احیا میں ہی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ ترکی۔ ایران۔ مصر۔ افغانستان۔ عرب۔ غرض تمام دنیائے اسلام کو جو حیات نو حاصل کرنے کی سعی میں مصروف ہے۔ شاعرانہ اور فلسفیانہ بلند نگاہی اور شعور و احساس کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔

اقبال کی ولادت ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ ہوئی۔ وہ متوسط طبقے کے ایک اسلامی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جسے تصوف سے خاص شغف و انہماک ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اقبال پر مولانا جلال الدین رومی اور دوسرے صوفی شعراء کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے سیالکوٹ کے گورنمنٹ اسکول میں تعلیم پائی۔ اور یہاں انہیں عربی اور فارسی کے صاحب ذوق فاضل شمس العلماء مولانا سید میر حسن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع ملا۔ مولانائے موصوف ان باقیات الصالحات میں تھے۔ جن کے دم قدم سے ملکہ وکٹوریا کے عہد میں مغل تہذیب و تمدن کی شمع اکناف ہند میں فروزاں رہی۔ اس شفیق استاد کے فیض صحبت سے شاعر کے قلب میں ایرانی ادبیات سے وہ شیفتگی پیدا ہوئی۔ جو ان کی پختہ سالی کے زمانے کی تصانیف میں جابجا نمایاں نظر آتی ہے۔

اس عہد کے نوجوانوں کی طرح اقبال کو غالب۔ ذوق۔ میر۔ حالی وغیرہ اردو شعرا کا کلام پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اردو نے مغلوں کے دربار میں جنم لیا۔ اور ارباب سیف و قلم کے خلا ملا سے فروغ پایا تھا۔ ان شعرا نے زبان کو

ان دنوں قدیم عہد کے تذکروں پر ایک سرسری عبارت تقیہ کی معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہیں یہ کلام پڑھ کر اقبال کو خیال آیا۔ چنانچہ انہوں نے اس عہد کے سب سے بڑے اردو شاعر اور نظام دکن کے استاد نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے پاس اپنے اشعار اصلاح کی غرض سے بھیجے۔ داغ نے یہ کہہ کر اشعار واپس کر دیئے۔ کہ ان میں اصلاح کی گنجائش نہیں

لیکن ڈاکٹر اقبال کے شاعرانہ کمال کا جوہر اس وقت چمکا۔ جب وہ لاہور آکر بی۔ اے میں داخل ہوئے۔ یہاں کے علمی ماحول اور نئی فضا کی بدولت ان کے تجربہ میں وسعت اور خیال میں پختگی پیدا ہوئی۔ انہیں ابتدا سے فلسفہ اور شعر کا ذوق تھا۔ کیونکہ انہوں نے تصوف کے آغوش میں پرورش پائی تھی۔ لاہور میں آئے تو انہیں آرنلڈ مرحوم سے استفادہ کا موقع ملا۔ جو اس زمانہ کے مشہور مستشرق تھے۔ اور اسلامیات سے خاص شغف رکھتے تھے۔ اس سے پہلے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں رہ کر ہندوستانی طلبہ کے دل میں مشرق کے فلسفہ و ادب کے مطالعہ کی تشنگی پیدا کر چکے تھے۔ وہ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم دے رہے تھے۔ اقبال نے ان کو اپنا خضر راہ بنایا۔ فاضل استاد کی شفقت نے شاعر کے دل میں احسان مندی اور شکرگزاری کے جو جذبات پیدا کئے ان کا مرقع دیکھنا ہو۔ تو وہ نظم پڑھئے۔ جس کا عنوان "آرنلڈ کے نام" ہے۔

اسی زمانے میں یعنی بیسویں صدی کے آغاز میں اقبال کی شاعرانہ سرگرمیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے وہ شعر لاہور آکر ہی کہا تھا ؎

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اس شعر کا اتنا اثر ہوا۔ کہ تمام اہل قلم کی نگاہیں یک لخت ان کی طرف پلٹ گئیں۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم نے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے شاعر کی خدمت میں یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

شاعر نے صرف ایک شعر میں جو درجہ نہایت لطیف ہے۔ نجات کے بعد روح کی ناکوئی انگیزی کی تشریح کر دی شعر کا مقصود یہ ہے۔ کہ خدا کی محبت انہیں لوگوں کے لئے ہے۔ جو اپنے گناہوں پر انفعال و ندامت ظاہر کرتے ہیں۔ موتیوں سے پسینے کے قطروں کی تشبیہ نہایت لطیف ہے۔ کیونکہ خوابیدہ ضمیر جب بیدار ہوتا ہے۔

تو اس کی پاکیزگی موتیوں سے پوری پوری مشابہت رکھتی ہے۔ جس شاعرانہ حسنِ تخیل سے روح انسانی کی عظمت ایسے لطیف پیرایہ میں پیش کی ہے کوئی شخص اس سے لطف اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ اکثر شاعروں اور نقادوں نے جب یہ سنا کہ یہ شعر ایک نوجوان نے کہا ہے۔ جو حال ہی میں لاہور آیا ہے۔ تو انہوں نے ارادہ کر لیا کہ شعر کہنا چھوڑ دیں۔ دوسرے کے متفق اللفظ ہو کر پکار اٹھے۔ کہ اقبال۔ غالب کے بعد اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔

اب اقبال کو ان کے دوست کھینچ کر مشاعروں میں لے گئے۔ سیالکوٹ میں تو وہ کبھی کبھار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ لیکن اب انہوں نے اس طرف زیادہ توجہ کی۔ ایک مشاعرے میں انہوں نے اپنی نظم ہمالیہ پڑھی۔ اس نظم میں ایرانی اور انگریزی شعرا کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ اب تک تو ان کی شہرت طلبہ تک محدود رہی تھی لیکن اب سارا ملک ان کے نام سے گونج اٹھا۔ "ہمالیہ" میں حب وطن کا جذبہ نظر آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نظم نے ہندوستانی شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح کر دیا

اقبال کو قدرت نے تغزل کی دولت عطا کرنے میں بہت فیاضی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ "ہمالیہ" کو محض متغزلانہ انداز بیان کی وجہ سے یہ قبول عام حاصل ہوا۔ اور ان کی بعض دوسری نظموں خصوصاً "ہندوستاں ہمارا" کی طرح جسے ہندوستان کے قومی گیت کی حیثیت حاصل ہے یہ نظم ہندوستان کے طول و عرض اور گوشے گوشے کی تیزی اور تندہی کے ساتھ پھیل گئی۔ ہر شہر، قصبے اور گاؤں کے گلی کوچوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی زبان سے یہی نغمہ سنائی دینے لگا۔ اور سارے ملک نے اقبال کو قومی بیداری کا پیمبر تسلیم کر لیا۔

اقبال کی شاعرانہ سرگرمیوں کا پہلا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک ہے ۱۹۰۱ء میں وہ لاہور آئے۔ اور ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے انگلستان روانہ ہو گئے۔ ان کی نظم ہمالیہ میں اگرچہ انگریزی اور ایرانی شعرا کا اثر بہت نمایاں نظر آتا ہے لیکن انہیں اس زمانے میں تخیل اور زبان و بیان پر اس قدر قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ جسے شاعری کی معراجِ کمال سمجھنا چاہیے۔ اس عہد کے نغمے جوش و اثر اور آہنگ و ترنم سے مالا مال ہیں۔

یہ ساری نظمیں تخیل اور زبان و بیان کے اعتبار سے رنگین و دلآویز ہیں۔ میرے نزدیک وہ اپنے ابتدائی

کلام میں جہاں جہاں بام رفعت پر جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ ان کی نظیر زمانۂ مابعد کی فارسی نظموں کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ درست ہے۔ کہ ان میں سے بعض نظمیں انگریزی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً "ہمدردی" کوپر کی ایک نظم کے تتبع میں ہے۔ "پیام صبح" میں لانگ فیلو کی پیروی کی گئی ہے۔ "عشق اور موت" پر ٹینی سن کا اثر ہے۔ اور "رخصت اے بزم جہاں"۔ اور "ایک پہاڑ اور گلہری" میں ایمرسن کی تقلید کی گئی ہے۔ لیکن زبان و بیان کی لطافت۔ استعارات۔ رنگینی اور خیالات کی نزاکت کے اعتبار سے یہ نظمیں خالص مشرقی، اور زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہیں۔ ان کا ترنم اور شیرینی پڑھنے والے کو اس طرح مسحور کر لیتی ہے کہ وہ ان کے ماخذ سے قطعاً بے نیاز ہو جاتا ہے +

اقبال کی ایک اردو نظم (یہ ایک شاعرانہ صحگاہی ہے جسمیں اپنے شعور و احساس کی بیداری کا راز بیان کیا ہے) بیحد لطیف ہے۔ اس کے الفاظ اسقدر مترنم ہیں۔ کہ اقبال کے اکثر مداحوں نے اس نظم کو حرز جاں بنا لیا ہے۔ وہ جب اس کے اشعار پڑھتے ہیں تو سرور و نشاط کی ایک غیر محدود کیفیت انہیں بیخود کر دیتی ہے۔ کون ہے جو اس دعا کو پڑھے اور بیخود نہ ہو جائے +

لیکن اقبال کو ابتدائً جو کامیابی ہوئی۔ اس کی وجہ زبان اور جذبات کی لطافت و نزاکت ہی نہیں۔ بلکہ ان کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ انہوں نے اردو میں موثر استعارے اور فارسی اور پنجابی اور ہندوستان کی دوسری بولیوں کے الفاظ داخل کر کے اس زبان کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اردو کو نئے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی آرزو ہے۔ کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کا پودا پروان چڑھے۔ اور اسکی ایک خاص زبان ہو۔ انہوں نے اس شعر میں اردو کی حالت بیان کی ہے ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے

انہوں نے شعرائے متاخرین میں دو بڑے شاعروں یعنی غالب اور داغ کے متعلق جو نظمیں لکھیں۔ ان میں انہوں نے اپنے آپ کو انکا صحیح جانشین ظاہر کیا ہے۔ اور ان شعرا کی طرح زبان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے +

یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے انہیں جو دشواریاں پیش آئیں وہ دورِ اوّل کے کلام سے ظاہر ہیں۔ لیکن وہ فطرت سے جد و جہد کا ذوق لے کر آئے ہیں۔ اس لئے ان موانع اور مشکلات کے باوجود ان کے قدم کو ذرہ بھر لغزش نہیں ہوئی۔ جب انہیں مشکلات کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا ذہن اس امر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ کہ ان کے پیشروؤں کو بھی اسی نوع کی مشکلات سے سامنا کرنا پڑا ہے۔ انہوں نے سر سید احمد خاں کے متعلق بھی ایک نظم لکھی ہے۔ سر سید ہندوستان میں تعلیم کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ انہوں نے مشرق کے قدیم مدرسوں اور آشرموں کے طریقوں کو مغربی یونیورسٹیوں کے طرزِ تعلیم سے ترکیب دیکر علی گڑھ کا دار العلوم قایم کیا۔ اور اردو میں جدید نثر کی داغ بیل ڈالی۔ یہ نظم اقبال کی مغربی نظموں میں سب سے اچھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اقبال کا ذہن اس قسم کی نظم کے لئے بہت موزوں واقع ہوا ہے اس زمانے میں یہ خیال عام طور پر دائر و سائر تھا۔ کہ مشرق و مغرب کا ربط و امتزاج بہتر فضا پیدا کرے گا۔ اور ڈاکٹر اقبال اس عقیدے کے پُر زور حامی ہیں۔ اقبال کو یقین ہے کہ مغربی اقوام خواہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے کچھ کریں یا نہ کریں۔ ہندوستان بہرحال اس چیز کی حمایت کرے گا۔ اور اس زمانہ میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہندوستان کے معاشری نقائص کی اصلاح اور قوم کے اجزائے مختلفہ کی شیرازہ بندی ضروری ہے۔ اقبال کو امید ہے کہ بالآخر اس سرزمین کے مختلف عناصر ایک سلکِ اتحاد میں منسلک نظر آئیں گے۔ چنانچہ وہ اپنی ایک نظم میں لکھتے ہیں ؎

ایران و مصر و روم دنیا سے مٹ گئے ہیں　　اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

یہ گیت سُن کر ہندوستانیوں کا قلب جذبۂ مفاخرت سے معمور ہو جاتا ہے۔ اور شاعر کا قلم انہیں مردانگی اور شجاعت کے ایسے ایسے نکتے سمجھاتا ہے۔ جو اُن میں احساسِ خودداری پیدا کر دیتے ہیں۔ نسلی اور جماعتی منافرت دور کرنے کے لئے وہ "نئے شوالے" کا گیت گاتے ہیں۔ جو ساری کائنات کا معبد ہوگا۔

(۳)

ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۵ء میں انگلستان روانہ ہو گئے۔ خوش قسمتی سے انگلستان میں پہنچتے ہی۔ انکی ملاقات

میک ٹگارٹ جیسے فلسفی سے ہوئی۔ جو ہیگل کا متبع تھا۔ اور اُس زمانے میں فلسفی کی حیثیت سے بعد شہرت حاصل کر چکا تھا۔ پھر ادب فارسی کے مشہور مورخ ای۔ جی۔ براؤن اور "اسرارِ خودی" کے مترجم ڈاکٹر نکلسن سے ملاقات ہوئی۔ عنفوانِ زندگی میں ڈاکٹر صاحب کو فلسفہ اور ادب فارسی سے بہت شغف تھا لیکن جب ان کا رجحان وطنیت اور قومیت کی طرف ہوا۔ اور وہ ان موضوعوں پر نظمیں لکھنے لگے۔ تو یہ شوق دب کر رہ گیا۔ اب یہ شوق پھر پیدا ہوا۔ اور ان لوگوں کے اثر و تربیت نے اُسے پختہ کر دیا۔ میک ٹگارٹ کے لیکچروں سے انہوں نے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا سائنٹفک انداز سیکھا۔ اور اس متاع سے اکثر ہندوستانی طلبہ جو کسب علم کے لئے ولایت جاتے ہیں۔ تہی دامن رہتے ہیں۔ براؤن اور نکلسن کی دوستی سے انہیں یہ فائدہ ہوا۔ کہ انہوں نے گھر پر فارسی کا جو وسیع علم حاصل کیا تھا۔ اس میں پختگی پیدا ہو گئی۔ الٰہیاتِ ایران میں اُنہوں نے اپنی ساری قابلیت صرف کر دی ہے۔ تو اس رسالے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے +

زمانۂ قیامِ یورپ میں اقبال نے بہت کم نظمیں لکھیں۔ لیکن اُس زمانہ کے کلام کا بہت بڑا حصہ فارسی شاعری کے اثر سے مالا مال نظر آتا ہے۔ یہ شاعر کی زندگی کا وہ زمانہ ہے، جب خواب و خیال کی دنیا کا حسن و جمال جو طفلی کے زمانے کی مخلوق ہے۔ دل کی پُرشوق آرزو کا آب و رنگ بنتا ہے۔ اور پھر یہ جذبہ قلب کی گہرائیوں سے نکل کر مادّی اشیاء کے ساتھ متحد ہو جانا چاہتا ہے۔ شاعر کے اس دور پر محبت کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ پہلے تو وہ نوجوان شاعروں کے عام انداز میں محبت کی گتھیاں سلجھاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے :۔ محبت کیا ہے؟ حسن کی حقیقت کیا ہے؟ محبت اور حسن میں کیا تعلق ہے۔ وصال کسے کہتے ہیں؟ اُس کی توجہ محبت کی عام واردات کی طرف جن سے ہر عاشق آشنا ہے۔ منعطف ہو جاتی ہے۔ "۔ ۔ ۔ ۔ کی گود میں بلی دیکھ کر" وہ پریشان اور بے ربط خیالات ظاہر کرتا ہے۔ اُس کی عظمت و شان کا ذکر کرتا ہے۔ محبت کے "پیغام" لکھتا ہے۔ ہجر پہ آنسو بہاتا ہے۔ چاند اور تاروں سے محبت کرتا ہے۔ صبح اُٹھتا ہے اور اپنے محبوبِ مجازی کے جمال کا مشاہدہ فطرت کے ہر ذرّے میں کرتا ہے۔ محبت کے طوفانی سمندر میں بے قرار لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ جو دھڑکتے ہوئے دل کو جھکولے دے

رہی ہیں۔ وہ اس کے زیر و بم کے ساتھ ہمنوا ہو کر گیت گاتا ہے +

جب اس سمندر کی گہرائیوں کو ناپنے اور اُس کی لہروں سے جدوجہد کرنے کی ناکام سعی ختم ہو جاتی ہے۔ پروازِ فکر کی راہ کھل جاتی ہے۔ وہ فرشِ خاک سے اُٹھتا ہے۔ اور عرش پر جا پہنچتا ہے۔ مشرقی شاعر ارضی محبت کو حقیقی نہیں تصور کرتے۔ وہ اسے فریب سراب سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے عقیدے کی رو سے مجاز میں بھی اسقدر حقیقت موجود ہے۔ جو انہیں محبوب حقیقی تک پہنچا سکتی ہے۔ اقبال کی نگاہوں نے اس رازِ حقیقت کی ایک جھلک دیکھ لی ہے۔ چنانچہ اس نے انیسویں صدی کے عارف باللہ سوامی رام تیرتھ کی یاد میں ایک نظم لکھی ہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے امریکہ میں مشرق کا پیغام پہنچایا تھا۔ اور جنہیں اس سرزمین کے باشندے ابھی تک یاد کرتے ہیں +

اقبال کی بعض نظموں مثلاً کلی سلیمی، تنہائی اور "دریائے نیکر کے کنارے ایک شام" سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمان و مکان کی زنجیریں کٹ گئی ہیں۔ عشق مجازی کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ اور وہ عشق حقیقی کی دنیا میں پہنچ گیا ہے +

لیکن جب جوانی کے عشق کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے عشق الٰہی کی چنگاری اس خاکستر سے سُلگ اُٹھتی ہے۔ تو یورپ کی فضا انہیں راس نہیں آتی۔ ان کی وہ نظم جس میں اُنہوں نے مغربی اقوام کو مادہ پرستی اور تعیش کے خطرات سے متنبہ کیا ہے۔ اسی جذبۂ بے اختیار کا نتیجہ ہے ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا الخ

یہ اقبال کی آخری نظم ہے۔ جو اُنہوں نے یورپ میں بیٹھ کر لکھی ہے۔ اس لئے اسے یورپ کے نام ان کا رخصتی پیغام کہنا موزوں ہوگا۔ اگرچہ اس میں یورپ کی مدح و ستائش کا عنصر زیادہ نہیں۔ تاہم اُس میں اُس کے امراض کی تشخیص کی سعی ضرور کی گئی ہے۔ وہ مغربی اقوام سے کہتے ہیں "تم نے اپنے تمدن میں مفاسد کا دروازہ کھول دیا ہے۔ تم اسی آلے سے خودکشی کرو گے جس سے تم نے اپنی قسمت کا محل تعمیر کیا ہے" ان کے قلم نے یورپ کا جو زائچہ کھینچا ہے۔ اس میں شک و شبہ کا عنصر قطعاً

نہیں۔ اسی طرح مشرق کے نام اُنہوں نے جو پیغام اُمید دیا ہے۔ اُس میں حیرت انگیز اذعان ویقین اور قطعیت پائی جاتی ہے۔ وہ پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں۔ کہ مشرق جلد پھر اقبال و کامرانی حاصل کرےگا وہ مشرق کے نبض شناس ہیں۔ اور محسوس کر رہے ہیں۔ کہ اس کی عظمت کا سیلاب پھر بڑھ رہا ہے۔ اس لئے وہ وثوق سے اس کے متعلق حکم لگا سکتے ہیں۔ وہ ایشیا کو بشارت دیتے ہیں۔ کہ ایک نئے دَور کی صبح طلوع ہونے والی ہے۔ وہ جدید بیداری کے نقیب ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ تمام عالم ایک میکدہ بن جائیگا۔ لوگ آئیں گے اور خیالات کی شراب کے ساغر لنڈھائیں گے۔ کیونکہ تمام انسان خدا کے حضور میں یکساں ہیں علم وعقل کے بارے میں کسی کو غصب حقوق کا حق نہیں رہے گا۔ مشرق کے تہذیب و تمدن کو وہ "ہوسبل مایہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ بالآخر اسی کو سروری حاصل ہوگی +

مشرقی تمدن کی اس نشاۃ ثانیہ کا مرکز حجاز ہوگا۔ کیونکہ یہی سرزمین ہے جہاں اسلام نے نشو ونما پائی اور خدا نے قرآن مجید میں اہل عرب سے جو وعدہ کیا ہے۔ اُس کی برکت سے مسلمانوں کے عزم میں حرکت پیدا ہو جائے گی +

اُن کا عقیدہ ہے۔ کہ اس آسمانی وعدے نے ساتویں صدی عیسوی میں عربوں کو تمام متمدن دنیا کا مالک بنا دیا۔ اور جب تک اُنہوں نے اس وعدے اور دوسرے احکام خداوندی کو مشعلِ ہدایت بنائے رکھا اُن کے اقبال کا ستارہ اَوج پر رہا۔ لیکن ادھر اُنہوں نے خود فراموشی اختیار کر لی۔ اُدھر ان کا مذہبی جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ خلفاء کے درباروں میں وہ مقاصد داخل ہوگئے جو تنعم اور زر و دولت کے ثمرات تلخ ہیں۔ اور وہ قرآن کریم کے اس فرمان کو بھول گئے:- "عادل بنو اور ایسے عمل کرو۔ کہ لوگ تمہارے شکر گزار ہوں"

ڈاکٹر اقبال مسلمانوں کو بشارت دیتے ہیں۔ کہ وہ پھر اس قدیم نصب العین کی حقیقت اُن پر روشن ہو جائیگی۔ اور وہ موجودہ سکوت و جمود کی زنجیروں سے آزاد ہو کر ایک صحیح اسلامی سلطنت قائم کر لیں گے۔ یہ نشاط و سرور کی دنیا ہوگی۔ جس کا مرکز مکہ معظمہ ہوگا۔ تمام مسلمان اسی سرزمین کو کعبۂ آمال بنا لیں گے۔ وہ ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھیں گے۔ خدا اور انبیاء علیہم السّلام کی محبت اور عقیدت ان میں اشتراک و وحدت پیدا کرے گی +

یہ نئے کعبے کے موذن کی آواز تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ارادہ کیا کہ مشرق میں پہنچ کر اسلام کی عظمت کے مینار سے فراموش کار مسلمانوں کو محبت اور زندگی کا پیغام دیں گے اور خدائے قدوس کی عبادت کیطرف بلائیں گے۔ اگرچہ ابھی تک اقبال کی دعوت پوری طرح دنیا کے سامنے نہیں آئی تھی۔ لیکن ۱۹۰۸ء میں جب وہ گھر پہنچے۔ تو اس لائحہ عمل کی تکمیل کا کام شروع ہو گیا۔ اس وقت سے آجتک اُن کے قلم سے جتنی کتابیں نکلی ہیں، اُن میں اسی نصب العین کے حصول کی سعی نظر آتی ہے جسے انہوں نے یورپ میں پیش نہاد خاطر بنالیا تھا۔

(۳)

ڈاکٹر اقبال نے ہندوستان اور انگلستان میں جو علم حاصل کیا۔ اس نے اُن کے قلب میں فارسی ادبیات کی محبت پیدا کر دی تھی۔ یہ ضروری تھا کہ یہ محبت کسی نہ کسی صورت میں جلوہ گر ہوتی۔ چنانچہ اس زمانہ میں انہیں احساس ہوا کہ اردو میں ابھی اتنی وسعت اور پختگی پیدا نہیں ہوئی کہ اس کے ذریعہ فلسفیانہ خیالات ظاہر کئے جاسکیں علاوہ ازیں وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے۔ کہ اُن کے لئے فلسفیانہ خیالات صرف مسلمانان ہند کے لئے مخصوص نہیں۔ بلکہ سارا عالم اُن کا مخاطب ہے۔ اس لئے انہوں نے فارسی کو دنیائے اسلام سے خطاب کا ذریعہ بنایا۔ ہاں کبھی کبھی وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے خیالات سے آگاہ کرنے کے لئے اردو میں بھی نظمیں لکھتے ہیں +

اب تک اُن کے فارسی اشعار کی چار جلدیں چھپ چکی ہیں۔ اسرار خودی۔ رموز بیخودی۔ پیام مشرق اور زبور عجم۔ بقول پروفیسر نکلسن۔ ان چاروں کتابوں میں ایک ہی آرزو انگیز گیت۔ ایک ہی افسوں ہے۔ جسے ایک پیمبر کی صدا کہنا چاہئے +

جب پروفیسر نکلسن نے اقبال کی پہلی فلسفیانہ نظم اسرار خودی کا ترجمہ کیا تو مسٹر ہربرٹ ریڈ نے مغربی شعرا کے کلام سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ اقبال کی نظم پر والٹ وٹمین کے فلسفۂ اقدام و عمل کا اثر پڑا ہے۔ وہ لکھتا ہے " وٹمین کا نصب العین اسی اعتبار سے بہت بااہمیت ہے۔ کہتا ہے کہ وہ نظری نہیں۔ بلکہ عملی ہے۔ صرف ایک شاعر ایسا ہے جس کے ہاں یہ چیز نظر آتی ہے۔ اور وہ بھی ہماری نسل اور قوم سے

نہیں۔ میری مراد محمد اقبال سے ہے۔ جن کی نظم اسرارِ خودی کا ترجمہ ڈاکٹر رینالڈ نکلسن نے کیا ہے۔ اور میکملن کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ ادھر ہمارے ملک کے شاعر تو کیٹس کے زمانہ کی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں۔ اور بلبلوں اور پرندوں یا دوسرے چھوٹے چھوٹے مضمونوں پر نظمیں لکھ رہے ہیں۔ اور ادھر لاہور میں ایک ایسی نظم شائع ہو رہی ہے جس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں پر پوری طرح تسلط کر لیا ہے۔ ایک نوجوان مسلمان لکھتا ہے۔ "اقبال اس عہد کا مسیح ہے۔ جس کی آتش نفسی نے مُردوں کو زندہ کر دیا ہے۔" تم پوچھو گے کہ آخر اس میں کونسی ایسی ظاہری کشش ہے جس نے لوگوں کے دل اپنی طرف کھینچ لئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ اس قسم کی کسی ظاہری کشش کا مرہونِ منت نہیں۔ جو مبلغوں اور دنیا کو نجات کا پیغام دینے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ اعجاز ایک نظم نے دکھایا ہے۔ جس کے حسن و جمال کے آئینے میں فلسفۂ جدید کے اکثر پہلو منعکس نظر آتے ہیں۔ اس میں خیالات کی فراوانی ہے۔ لیکن ان میں اتحاد پایا جاتا ہے۔ وہ اس کی منطق ساری کائنات کے لئے آوازِ غیب کا حکم رکھتی ہے۔"

مسٹر ریڈ کا شمار مغرب کے بہترین شاعروں اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کا یہ خراجِ تحسین ایسا ہے کہ اقبال کو اپنی کلاہِ فخر کا آویزہ سمجھنا چاہیئے۔

آج تک فلسفے کو نظم کے پیرائے میں بیان کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان میں اقبال کی یہ نظم بہت نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیش ہوتا ہے کہ اقبال کا فلسفہ کیا ہے؟ وہ کیا پیغام لیکر آیا ہے۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں اس سوال کا جواب شاعرانہ انداز میں دیا گیا ہے۔ اور اسکا اعادہ پیامِ مشرق اور زبورِ عجم میں بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال نے اسرارِ خودی کے مترجم کی درخواست پر خود اپنے فلسفے کی شرح بھی کر دی ہے۔ جسے اسرار کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں شامل کر لیا گیا ہے میں ذیل میں اقبال کے فلسفے کا ملخص بیان کرنے کی سعی کرتا ہوں:-

حقیقت دراصل تکوین و تغیر کے عمل سے عبارت ہے۔ وہ صرف حالتِ وجود یا مقید و معین وجود کا نام نہیں ہیگل کا مطلق۔ ویدانت کا برہما اور صوفیوں کا خدا سب محض ذہن کی افسانہ طرازی اور خیال کی لغزشیں ہیں۔ ہیگل کے

منطق کے مقابلے میں تجربہ کے لئے۔ وہ یقین رکھتے ہیں پر بشرطیکہ اس سے قابلِ اعتنا سمجھا جاسکے کیونکہ وہ انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک کائنات کے بنیادی اور اساسی حقائق ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی انفرادی چیز ہے۔ وہ ایسی زندگی پر یقین نہیں رکھتے۔ جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اُن کے نزدیک خدا ایک اعلیٰ ترین فرد ہے۔ افراد اوصافِ خداوندی سے متمتع ہوتے ہیں۔ انسان جس طرح مادی دنیا پر قبضہ کرکے اُسے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اسی طرح صفاتِ الٰہی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ محبت کی اعلیٰ ترین صورت بھی آرزوؤں اور خواہشوں کی مخلوق ہے۔ اور اُس کے حصول کی سعی منتہائے حیات۔ خواہشات کی نیکی اور بدی کا معیار یہ ہے۔ کہ جو خواہشات خودی کے جذبے کو ضعیف کرتی ہیں۔ وہ بُری ہیں۔ اور جو اُسے تقویت دیتی ہیں وہ اچھی ہیں۔ افراد کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو جائیں۔ کیونکہ یہی ایک جماعت ہے جو معیارِ کمال پر پوری اُترتی ہے۔ اور اسی میں شامل ہو کر وہ کمال حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اسلام غیر فانی ہے۔ اور جو شخص اس سے کامل عقیدت رکھے گا وہ خدا کی ارضی بادشاہت میں جس کا وعدہ اسلام نے کیا ہے اپنے آپ کو کھو دے گا۔

اقبال کے فلسفے کے یہ مبادی و اصول الٰہیات کی پیداوار ہیں۔ اُس نے اسرار و رموز میں ان گوہر ہائے آبدار کی ایسی لڑیاں پروئی ہیں۔ کہ اُن سے دماغ کے بجائے دل متاثر ہوتا ہے۔ وہ اب منطق کے خشک مسائل نہیں رہے۔ بلکہ ان میں پھولوں کی تابش اور رنگینی پیدا ہو گئی ہے۔

شاعر کو اپنے بلند مرتبے کا احساس ہے۔ چنانچہ اپنے آپ کو پیغمبر اور پیغمبرِ فردا کہتا ہے ؎

انتظارِ صبح خیزاں می کشم — اے خوشا زرتشتیانِ آتشم
نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم — من نوائے شاعرِ فرداستم

پھر ایرانیوں کے عام انداز میں ساقی سے خطاب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے ؎

خیز و در جامم شرابِ ناب ریز — بر شبِ اندیشہ ام مہتاب ریز
تا سوئے منزل کشم آوارہ را — ذوقِ بیتابی دہم نظارہ را

گرم رو از جستجوئے نو شوم روشناس آرزوئے نو شوم

پھر اپنے خیالات کا ماخذ بتاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ایران کے صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی نے مجھے راہ ہدایت دکھائی ہے ؎

شب دل من مائل فریاد بود خامشی از یا ربم آباد بود
شکوۂ آشوب غم دوراں بدم از تہی پیمانگی
این قدر نظارہ ام بیتاب شد بال و پر بشکست و آخر خواب شد
روئے خود بنمود پیر حق سرشت کو بحرف پہلوی قرآں نوشت
گفت اے دیوانۂ ارباب عشق جرعۂ گیر از شراب ناب عشق
بر جگر ہنگامۂ محشر بزن شیشہ بر سر دیدہ بر نشتر بزن

اور اگرچہ اقبال خود کہتا ہے ؎

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست بت پرستی بت گری مقصود نیست

تاہم اسرار میں انہوں نے رومی کا ہی تتبع کیا ہے۔ اور اس میں ایک موقع پر انہوں نے اس طرح اُستاد کے حضور میں خراج عقیدت پیش کیا ہے ؎

باز بر خوانم ز فیض پیر روم دفتر سر بستۂ اسرار علوم
جان او از شعلہ ہا سرمایہ دار من فروغ یک نفس مثل شرار
شمع سوزاں تاخت بر پروانہ ام بادہ شبخوں ریخت بر پیمانہ ام
پیر رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

انہوں نے اپنے فلسفے کے اصول یوں بیان کئے ہیں ؎

پیکر ہستی ز آثار خودی ست ہر چہ می بینی ز اسرار خودی ست

زندگی کی تکمیل کے لئے نہایت ضروری ہے ؎

می شود از بہر اغراض عمل   عامل و معمول و اسباب و علل

کہتے ہیں ۔   از شراب مقصدے مستانہ خیز

کیونکہ ۔   ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم   از شعاع آرزو تابندہ ایم

ان کے نزدیک محبت تمام مقاصد کا سرچشمہ اور ان کے حصول کا ذریعہ ہے ۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است   زیر خاک ما شرار زندگی است

از محبت می شود پائندہ تر   زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

از محبت اشتعال جوہرش   ارتقائے ممکنات مضمرش

فطرت او آتش اندوزد ز عشق   عالم افروزی بیاموزد ز عشق

وہ ناتوانوں سے کہتے ہیں کہ خستہ و ضعیف نہ بنو [illegible]

ہمچو گوہر [illegible]   بین دریا چوں حباب آب گول پیدا کر

وہ خیال پرستی پر بڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ افلاطون کو

راہب دیرینہ افلاطون حکیم   از گروہ گوسفندان قدیم

کہتے ہیں ؛

شیخ و برہمن والی حکایت میں شیخ کی زبانی یہ الفاظ کہلوائے ہیں۔

گفت شیخ اے طائف چرخ بلند   اندکے عہد وفا با خاک بند

تا شدی آوارۂ صحرا و دشت   فکر بے تاب تو از گردوں گذشت

اسرار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر آزاد روح اور وسیع نظر رکھنے والے انسانوں کا سچا عاشق ہے۔ اس مجموعہ کی آخری نظم ایک نہایت پرجوش دعا ہے۔ ان سولہ پاکیزہ اشعار کا جن میں تقلید کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے جہاد کیا گیا ہے۔ نہایت موثر ٹکڑا ہے

اے چو جاں اندر وجود عالمے   جان ما باشی و از ما می رمی

نغمہ از قیس و درخورد حیات　　موت در راہ تو محسود حیات

باز تمکین دل ناشاد شو　　باز اندر سینہ ہا آباد شو

باز از ما خواہ ننگ و نام را　　پختہ تر کن عاشقان خام را

(۴)

پیام مشرق گوئٹے کے دیوان مشرقی کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔ جنہیں دیوان مشرقی کے اسلوب پر ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ زبور عجم ایک طویل نظم ہے جس کے دو حصے ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں اسرار و رموز کا فلسفہ زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اور دوسرے فلسفیانہ عقاید سے ان کا جو تعلق ہے۔ اسکی بھی شرح کی گئی ہے +

اقبال کا تخیل اسقدر بلند اور ان کے خیالات اسقدر پیچیدہ ہوتے ہیں۔ کہ انکی نظموں کا سمجھنا مشکل ہو گیا ہے ان کے ایک دوست نے ان کے نام خط لکھا ہے جس میں ان دشواریوں کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے وہ لکھتے ہیں:-

"آپ لوگوں کو اپنے ساتھ تخیل کے جس بام بلند پر پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہاں تک انہیں کی رسائی ہو سکتی ہے جن کا مطالعہ وسیع ہو۔ اکثر مسائل پر فکر و نظر کرتے رہے ہوں۔ اور انکا ذہن بعض امور کے متعلق تشکک کی جولانگاہ بنا رہا ہو۔ آپکا کلام انہیں لوگوں کے لئے ہے۔ جو اپنے ذہن کو پیچیدگیوں میں ڈالنے کے عادی ہو چکے ہیں یا جن کے نزدیک دماغ کو ایک پھندے سے رہا کر کے دوسرے پھندے میں مبتلا کر دینا محبوب مشغلہ ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دائرۂ فکر سے باہر نہیں۔ آپ کے متعلق یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔" است از یک بند تا افتاد در بند دگر" لیکن ہم لوگوں نے اپنے حواس اور مشاہدہ سے اسقدر کام نہیں لیا۔ اور ہم میں نہ اسقدر ہمت ہے نہ قابلیت کہ اس دنیا میں جو عالم ملکوت سے بھی ماورا ہے۔ آپ کے ہم سفر بن سکیں۔ ہاں کبھی کبھی ہم جھانک کر ان اسرار کی ایک جھلک دیکھ لیتے ہیں +

ملک راج آنند

اقبال اور اسلامی دنیا کے دیگر شعراء

(از جناب ملک عبدالقیوم بی۔ اے (علیگ) بیرسٹرایٹ لا۔ لاہور)

بیسویں صدی کے بیشتر اہل الرائے کا یہ خیال ہے کہ دورِ حاضرہ اہل مشرق کی انتہائی نکبت اور پستی کا زمانہ ہے۔ اس خیال کی تصدیق میں وہ دنیائے مغرب کی سیاسی جہانگیری۔ اقتصادی تمومندی اور معاشرتی ترقی کو پیش کرتے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ بہ استثنٰی جاپان و چین ایشیا کا کوئی ملک یا اس برِ اعظم کی کوئی جماعت حقیقی معنوں میں آزاد یا ترقی یافتہ کہلانے کی مستحق نہیں۔ حالانکہ ان حالات کے بالمقابل اہل یورپ نے عین اسی زمانہ میں اس حیرت انگیز تحرکات جدوجہد کا ثبوت دیا ہے جس کی مثال خود یورپ کے کسی گذشتہ دور میں نہیں ملتی۔ سطحی نقطۂ نظر سے اس بیان کی حقیقت کچھ بھی ہو۔ اس میں ہرگز کلام نہیں کہ گذشتہ صدی کے آخری ربع بلکہ قرن وسطیٰ سے لیکر آج تک جو کچھ جہد للقوۃ اور کشمکش حیات کے آثار شرقی اقوام سے ظاہر ہوئے ہیں وہ مغرب کے مقابل میں کچھ کم قابل ستائش نہیں۔ اور اہل مشرق نے بھی اپنے تخیل سے ہر گونہ ایک عہد جدید کی بنیاد رکھی +

اس عہد جدید کی بنیاد قایم کرنے والوں میں ایک ممتاز حیثیت سے حضرت اقبال بھی ہیں۔ جنہوں نے کمال جرأت سے دیرینہ روایات ملی و مقامی کا بطلان کر کے اہل ایشیا بالخصوص اسلامی دنیا کو اس شاہراہ پر گامزن ہونے کی دعوت دی جو مادی و روحانی کامیابی کا منبع ہے +

وسعت اثر اور مضامین کی رفعت کے باب میں ایشیائی شعراء میں سے کم افراد کو حضرت اقبال کی سی ہمہ گیری نصیب ہوئی ہوگی۔ حالانکہ عین اسی زمانہ میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ایشیا کی عمرانی روایات کی دیگر نمائندہ سرزمینوں میں نامور شعرا اور باکمال ادیب پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنے حدود اثر کے اندر

نظم ہماری نصب العین کی تبلیغ کی جو صاحب اسرار خودی و رموز بیخودی کا طغرائے امتیاز قرار پا چکا ہے گویا یہ حقیقت ہے کہ جو راہیں حضرت اقبال نے بتائی ہیں۔ وہ کسی اور شاعر کے کلام میں اس خوبی سے بیان نہیں ہوئیں۔ مشرقی شعرا کی صف میں ہندوستان سے باہر سب سے زیادہ مقبول کلام نامق ترکی شاعر نامق کمال بے کا ہے جس کے خوشہ چیں نہ صرف بلاد ترکیہ کی حدود و اطراف میں پھیلے ہوئے۔ بلکہ تورانی دنیا یعنی دیوار چین سے لیکر جمہوریہ قایم تک پائے جاتے ہیں۔ اگر نامق کمال کو ترکی قومیت و وطنیت کا رنگ ترین علمبردار کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مگر زبان کی روانی اور محاورات کی بندش سے قطع نظر کر لے اگر قادر الکلام ترکی شاعر کے علمی کارناموں کو معنوی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوگا۔ گویا ترکی کے ماسوا دنیا اور اُس میں رہنے والوں کا وجود ہی نہیں۔ نامق کمال کی دنیا ترکی دنیا ہے۔ اسکی وطنیت، حب ترکی تک محدود ہے۔ اس کا قومی مطمح نظر ہلاکو اور چنگیز کی جنگجویانہ روایات ہیں۔ اور دنیائے مستقبل کی فلاح و نجاح کے باب میں تورانی نسل انسانی کے قومی بازو کی رہین منت ہیں۔ نامق کمال کے نزدیک توران ستان ربع مسکوں کا خلاصہ ہے اور ترکی قلب اس کا مرکز ہے۔ جس شدت اور کامیابی سے نامق کمال نے ترکی وطنیت کی تبلیغ کی ہے۔ اور ترکوں کو اپنے مقاصد میں ناکام ظاہر ہونے کی تلقین کی ہے اس کی مثال حب وطن سے سرشار کسی اور قوم کے جنگی ترانوں میں نہیں ملتی۔ نامق کمال کی شاعری شاعری نہیں بلکہ ایک طبل جنگ ہے۔ جس کی اصوات رعد ترکی قوم کو حصول آزادی کے لئے انتہائی قربانی کی دعوت دیتے ہیں۔ نامق کمال اپنے خیالات کا ذیل کے الفاظ میں اظہار کرتا ہے:-

اے تورانی نسل کے فرزند!
کیا تو اپنی خودی سے بے بہرہ ہے۔
کیا تجھے معلوم نہیں کہ تو اسے
ذو دماں کی اولاد ہے۔
جس نے اپنے جبروت کا

ڈنکا چہار دانگ عالم میں بجا دیا۔
کیا تیرے پرچم ظفر مندی کے سامنے
دنیا کے علم سرنگوں نہیں ہو گئے۔
کیا تو بے خبر ہے
کہ دنیا کی حیات و ممات تیری
زندگی سے وابستہ ہے

نامق کمال ایک اور آتشین گیت گاتا ہے:-

میں مادر ترکی کا فرزند ہوں
میں اس محبوب سرزمین کی آغوش میں پلا ہوں۔
میں اسی میں رہ کر جوان ہوا ہوں۔
یہ سرزمین میرا گہوارہ ہے
تورانی بہادروں کے نیزے اسکا حصار ہیں۔
ان کی تلواروں کا سایہ میری جائے پناہ ہے۔
میں مادر ترکی کا فرزند ہوں +

ناظرین نامق کمال کے چند اشعار کے اس ترجمہ سے اس نتیجہ پر ضرور پہنچے ہوں گے کہ تلواروں کی جھنکار، آتشین اژدر کی شعلہ فشانی اور خارا شگاف تیروں کی سنسناہٹ کسی محب وطن کے نزدیک کیسی ہی خوش آیند ہو۔ مگر ایک عہد ماضی کی صدائے بازگشت ہے۔ اور انسانیت اور سلامت روی سے کوسوں دور ہیں۔ حقیقی شاعر وہ ہے جس کی زبان میں شیرینی ہو اور تفکرات میں خوش بینی اور تلقین جہاد کرے تو تزکیہ نفس کے لئے۔ چنانچہ حضرت اقبال فرماتے ہیں ؎

در اطاعت کوش اے غفلت شعار می شود از جبر پیدا اختیار

ناکس از فرمان پذیری کس شود   آتش ار باشد ز طغیان خس شود

بدقسمتی سے ایشیائی دنیا کے اس دور جدید میں کیا تورانی اور کیا عربی یا ایرانی ارباب فکر نے نام کمال کی تقلید کی ہے اور اپنے اپنے طریق پر وطنیت پرستی کی داد دی ہے۔ چنانچہ مصر جدید کا مشہور قومی شاعر شیخ التنالا سمجا ... نشۂ حب وطن سے سرشار ہو کر یوں گویا ہوتا ہے:-

اے میرے مصر! اے میرے مصر

تو میرا پوست، میرا خون، میری ہڈیاں ہے

میں تجھی میں رہ کر جوان ہوا

اور مر کر بھی تیری ہی آغوش میں رہونگا

حالانکہ جو مودت، صلح جوئی اور سلامت روی اقبال کے ملکی اور قومی ترانوں سے ہویدا ہے۔ وہ نہ صرف حقیقی حب وطن سے بلکہ حب عالم اور بین الاقوامی رواداری کے بہترین مظہر ہیں۔ تو گویا علامہ اقبال کی شاعری نہ صرف تہذیب سخن بلکہ تزئین اخلاق کا ذریعہ ہے۔ اور اسلامی اخلاق کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اسرار خودی خود اسلامی فلسفہ ہے۔ اور یہی ایک چیز ہے جو اسلامی اخلاق اور اسلامی تعلیم کا جوہر ہے۔ گو صدیاں گذر گئیں اور اگرچہ بعض ارباب دانش و بینش نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی مگر جس دلکش پیرائے میں حضرت اقبال نے تسلسل حیات کے حقیقی راز کو منکشف کیا ہے۔ وہ انہیں کا حصہ ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:-

پیکر ہستی ز آثار خودی است

ہرچہ می بینی ز اسرار خودی است

خویشتن را چون خودی بیدار کرد

آشکارا عالم پندار کرد

صد جہان پوشیدہ اندر ذات او

غیر او پیداست از اثبات او
در جہاں تخم خصومت کاشت است
خویشتن یا غیر خود کاشت است

پھر ایسے مقاصد کی تکمیل کے متعلق جو خلائق کی ایذا رسانی اور غصب حقوق پر مبنی ہو بیان کرتے ہیں ؎

طبع مسلم از محبت قاہر است
مسلم ار عاشق نباشد کافر است
تابع حق دیدنش نادیدنش
خوردنش نوشیدنش خوابیدنش
در رضایش مرضیٔ حق گم شود
ایں سخن کے باور مردم شود
خیمہ در میدان انّ اللہ زدست
در جہاں شاہد علی النّاس آمدست
شاہد حالش نبی انس و جاں
شاہد صادق ترین شاہداں
قال را بگذار و باب حال زن
نور حق بر ظلمت اعمال زن
در قبائے خسروی درویش زی
دیدۂ بیدار و خدا اندیش زی
قرب حق از ہر عمل مقصود دار

تا ز تو گردد جلالش آشکار
صلح شر گردد چو مقصود است غیر
گر خدا باشد غرض جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند
جنگ باشد قوم را نا ارجمند

کیسا پاکیزہ اور اعلیٰ نصب العین ہے۔ خودی اور تحقیق خودی کی ہر گونہ تلقین کی گئی ہو۔ مگر خالص مادی اغراض۔ انسانیت سوز دنیوی مصالح اور کورانہ نفس پرستی کی دلپذیر تلقین موجود ہے۔ اقبال کی شاعری محض لفظوں کا رکھ رکھاؤ ہی نہیں۔ بلکہ اس غیر فانی حقیقت کی مدلل اور مبرہن تفسیر ہے۔ جسے اسلامی مذاق کہتے ہیں۔ تو کیا حضرت اقبال کو دنیائے اسلام کے جملہ ارباب کمال پر بہ لحاظ مقاصد و بہ لحاظ معانی فوقیت حاصل نہیں ہے؟

ملک عبد القیوم

پیامِ اقبال

(از جناب قاضی عبدالغفار صاحب رئیس مرادآباد)

اے زمین کے سورما بیٹے!
اُسے نئی شان سے تعمیر کر!
اپنے سینہ میں اپنے دل میں
اُس کی پھر سے بنیاد رکھ!
زندگی کا ایک نیا دور
روشن ضمیری سے شروع ہو
اور اُس کی تہنیت میں
نئے گیت گائے جائیں! (گوئٹے)

شعر ایک الہام ہے ـــــ جو الہام نہیں وہ شعر نہیں محض نظم ہے۔ قافیہ۔ ردیف۔ لَے اور ترنم کی ایک ترکیب۔ استعداد فطرت کے میٹھے چشموں سے جس سمندر کی گہرائی لبریز ہوتی ہے وہ سمندر شاعر ہے! وہ مفسّرِ فطرت ہے۔ وہ مصوّرِ فطرت ہے۔ وہ مدبرِ فطرت ہے۔ نبی اور پیغمبر کے بعد فطرتِ الٰہی کا وہی ایک ترجمان ہے!

اقبال کی شاعری کے متعلق کہنے کو لوگوں نے کیا کیا نہ کہا۔ اور کیا کیا نہ کہیں گے۔ مگر مجھے اقبال کے سرود مستانہ کے جس تار کی آواز سب سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اُس کا کچھ حال مجھ سے سُن لیجئے اقبال کی شاعری تغزل بھی ہے۔ ترنم بھی ہے۔ شوکتِ الفاظ بھی رکھتی ہے۔ اس کی بندشیں بھی چُست ہیں خیالات کی بلندی اور گہرائی بھی اُس کے دامن سے وابستہ ہے۔ اس میں داغ کی "زبان" بھی ہے۔ غالب کا فلسفہ بھی ہے۔ شبلی و حالی کی "قومیات" بھی ہیں۔ سب کچھ ہے جو ہونا چاہیے۔ مگر اس "سب کچھ" کے اندر جو ایک پیامِ عمل ہے۔ جو فلسفۂ حرکت و حیات ہے۔ جو دعوت ہے۔ وہی اس سب کچھ کی جان ہے۔ ملت کے وجودِ اجتماعی میں شاعر کا وجود سرتا پا پیامِ عمل نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ اس کا وجود ہی بیکار ہو جاتا ہے۔ وہ قوالی کی محفلوں کی زینت اور کتب خانوں کی آرایش ہو سکتا ہے۔ مگر اور کچھ نہیں ہو سکتا!

اقبال کی شاعری کا ہر دور ایک ہی فلسفۂ حیات کا حامل ہے۔ ابتدائی دور میں خیالات کی حدت و شدت قوی تھی۔ مگر گیرائی بہت کم تھی۔ دوسرے دور میں شاعر کا شعر اپنے لئے ایک وسیع میدان مانگنے لگا۔ اُس کے افکارِ عالیہ اردو ادب کی زنجیروں کو توڑ کر ہوا میں بلند ہونے لگے۔ اقبال کے بیتاب جلوؤں پر اردو کا لباس تنگ ہو چلا تھا۔ جو پہاڑی چشمہ وادیوں اور کہساروں میں بہ رہا تھا۔ وسیع اور طویل میدان ڈھونڈتا ہوا نکلا۔ اسی دور میں اقبال نے "کنارِ آبِ رُکناباد" کے ترک شیرازی سے کسبِ سعادت شروع کیا اور چند ہی روز میں شاعر کا شعر فضائے زندگی میں اس طرح پھیلنے لگا جس طرح کہ ہندوستان میں کسی اردو اور فارسی کے اُستاد کی شاعری کبھی نہ پھیلی تھی!

اقبال کے سینہ میں دو روحوں کا آشیانہ تھا۔ ایک شاعر کی حُسن پرست اور عشق پرور روح اور ایک مسلمان کی۔ ہنگامہ خیز اور شورش انگیز روح۔ آخری دور میں حُسن پرست روح ساکن اور مسلمان کی روح اس طرح ہنگامہ آرا ہوئی کہ شاعر اپنا پیام بن کر ہر طرف چھا گیا۔ اب سُننے والے یہ نہیں دیکھتے کہ زبان اردو ہے یا فارسی۔ اقبال کی شاعری

نے زبان اور طرز ادا کے امتیازات سے قطع نظر کر لی ہیں۔ کہے جاتا ہے۔ کہے جاتا ہے۔ جو اُس کو کہنا ہے!! "ہرڈر" کے اس نظریہ کی وسعت کو کہ "شاعری نوع انسان کی مادری زبان ہے" اقبال کی شاعری نے واضح کر دیا۔ اُس کے لئے اردو اور فارسی کا امتیاز ایک قصۂ پارینہ ہے •

اقبال کی شاعری یاس اور شک سے پاک ہے۔ وہ نہ خود مایوس ہوتا ہے نہ دوسروں کو مایوس ہونے دیتا ہے۔ وہ مایوس ہونے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور تنبیہ و توبیخ کے چند لفظ کہہ کر ٹھکراتا ہوا گذر جاتا ہے۔ اُس کو اپنے پیام کی قبولیت اور اپنے ایمان کی استواری میں ذرہ برابر شک نہیں ہے جس راستہ پر اُس کا تخیل اُس کو لئے جاتا ہے اُس راستہ کی صحت پر شاعر ایمان کامل رکھتا ہے۔ یاس و شک سے اقبال کے تخیل کی یہ کامل آزادی اقبال کے پیام کو طاقت پرواز اور اثر بخشتی ہے! پھر اگر اس کامل آزادی کا جو زلف و رخ کے استعارات سے اکثر بے نیاز ہو کر اپنے جلوے بے حجاب کر دیتی ہے۔ زمانہ کی سیاسی اصطلاحوں میں ترجمہ کیا جائے۔ اور اقبال جس "جرأت رندانہ" کے ساتھ "مشاہدہ حق" کی گفتگو کرتا ہے اُسکی تفسیر ادنیٰ سیاسیات کے رنگ میں لکھی جائے تو بہت ممکن ہے کہ اقبال کی ساری شاعری بحق سرکار فرنگ ضبط ہوجائے! لیکن شاعر کے پیام کو ادنیٰ سیاسیات کی اصطلاحوں سے آلودہ کرنا ایک شرک جلی ہے!

یہ بحث بھی فضول ہے کہ اقبال شاعری کے کس "درس" سے تعلق رکھتے ہیں میری رائے میں ہندوستان یا ایران کی شاعری کا کوئی "درس" بھی اقبال کا درس نہیں ہے۔ صہبا و خم خانۂ قدیم سے لائے۔ صہبا بھی انگوری نہیں بلکہ عرب کی کھجور کا افشردہ۔ جام و مینا انہوں نے اپنے لئے خود ہی بنایا۔ داغ و حالی و شبلی سے الگ انہوں نے اپنی دنیا آباد کی۔ اب نہ داغ ہیں نہ حالی ہیں نہ شبلی۔ اقبال بجائے خود اقبال ہے۔ بیس برس پہلے وہ وقت تھا جب اقبال کا "درس" قایم نہ ہؤا تھا۔ اور وہ ہنوز "امیدواری" کے دور سے گذر رہے تھے۔ جس طرح پیغمبر کے لئے ایک زمانہ امیدواری کا مقرر ہے۔ کبھی پہاڑوں پر۔ کبھی حجروں اور غاروں میں جب وہ خاموشی کے ساتھ

کسب سعادت کرتے ہیں۔ اسی طرح شاعر کو بھی کچھ عرصہ امیدواری کرنی پڑتی ہے۔ پھر جب وہ اپنا پیام تیار کر چکے، اس "اعتکاف" سے باہر آتا ہے تو ایک مستحکم ایمان اور غیر متزلزل پیام لے کر آتا ہے ؛

اقبال کے ابتدائی دور میں ایک بے چینی۔ بے اطمینانی اور جھجک تھی ؎

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلک سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں

ہاں آشنائے لب نہ ہو رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

اقبال منبر زد رازے کہ نباید گفت
ناپختہ بروں آمد از خلوت میخانہ

لیکن چند ہی سال بعد "امیدواری" کا وہ دور ختم ہوا۔ اور اقبال کا وجدان روحانی اُن کو "قصۂ دارورسن" کے جواز میں لے جانے لگا! وہی شاعر جو خلوت میخانہ سے ناپختہ آیا تھا۔ اب حیات ملی کے جلوت خانہ میں ایک حقیقت مسلمہ ہے۔ ایک زندہ پیغام عمل ہے۔ اب وہ "سخن نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم" کی منزل پر آ گیا! دس برس پہلے کے ڈھکے ہوئے اشارے۔ دھیمی آوازیں۔ ایک کھلا پیام بن کر گرجنے لگیں۔ اور شاعر نے اب دنیا کو اپنی طرف یوں بلانا شروع کر دیا :-

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی ۔۔۔ برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

ز شاعر نالۂ مستانہ در محشر چہ میخواہی — تو خود ہنگامۂ ہنگامہ دیگر چہ میخواہی
بہ بحر نغمہ کردی آشنا طبع روانم را — ز چاک سینہ ام دریا طلب گوہر چہ میخواہی

وہی شاعری جو بقول اقبال :۔ "پریشاں جلوۂ چوں ماہتاب اندر بیابانے" تھی اب ایک شعلہ بن کر چھا گئی اپنی شاعری اور اپنے پیام کی تشریح یوں فرماتے ہیں :۔

یوسف گم گشتہ را باز کشیدم نقاب — تا بہ تنک مایگاں ذوق خریدن دہم

بہ سواد دیدۂ تو نظر آفریدہ ام من — بہ ضمیر تو جہانے دگر آفریدہ ام من
ہمہ خاوراں بخوابے کہ نہاں ز چشم انجم — بہ سرود زندگانی سحر آفریدہ ام من

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑونگا — لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑونگا

اس عزم مستحکم کے ساتھ، وہ شاعر ازلی جو اقبال کے اندر تھا "کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا" کرنے کا مدعی ہو کر اپنے خلوت خانہ سے باہر آیا +

ترے سینہ میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہدے — مسلماں سے حدیث سوز و ساز زندگی کہدے

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا مجھے — مشت خاک ایسی نہاں زیر قبا رکھتا ہوں میں
جستجو گل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں تجھے — حسن بے پایاں ہے درد لادوا رکھتا ہوں میں
فیض ساقی شبنم آسا ظرف دل دریا طلب — تشنۂ دائم ہوں آتش زیر پا رکھتا ہوں میں

وہ دعائیں دیتا ہوا آتا ہے۔ اور اس کی دعائیں بھی اس کے پیام سے لبریز ہوتی ہیں :۔

نوجواں بسام سوزے تخم تمام سوزے غزلے کہ می سرایم بتو سازگار بادا
چو بجان من درآئی دگر آرزو نہ بینی مگر ایں کہ شبنم نویم بے کنار بادا
نشود نصیب جانے کہ دلے قرار گیرد تب و تاب زندگانی بتو آشکار بادا

اقبالؔ جذبات اسلامی سے مست ہے۔ از خود رفتہ ہے۔ اُس کی شاعری میں سب کچھ یہی ہے!

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

کبھی بارگاہِ رسالت میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو لے کر حاضر ہوتا ہے کبھی بیتاب ہو ہو کر دعائیں مانگتا ہے ؎

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے
پھر وادیِ فاراں کے ہر ذرہ کو چمکا دے پھر شوق تماشا دے، پھر ذوق تقاضا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے!

ابھی مسافران حجاز کے قافلہ کے ساتھ ساتھ اپنی آبلہ پائی سے ایک پیام عمل دیتا چلا جا رہا ہے!

خوف کہتا ہے کہ "یثرب کی طرف تنہا نہ چل" شوق کہتا ہے کہ "تو مسلم ہے بیباکانہ چل"
بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا؟ عاشقوں کو روز محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا؟
خوف جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز ہجرت مدفون یثرب میں یہی مخفی ہے راز

مگر اقبالؔ کا پیستانہ جذبۂ اسلامی محض جذبہ ہی نہیں ہے۔ اُس نے تعلیمات اسلامی کے گہرے مطالعہ کے بعد اپنی زندگی کا ایک فلسفہ وضع کر لیا۔ احساسِ خودی کا فلسفہ اقبالؔ کا بنیادی فلسفہ ہے۔ اقبالؔ کی نظر میں

ملت اور افراد کی زندگی کچھ بھی نہیں ۔ اگر وہ اس فلسفہ میں بیگانہ ہیں ÷

چوں کلیمے شد بروں از خویشتن　　　دست او تاریک و چوب او رسن!

شاید کہا جائے گا کہ یہ ایک عظیم الشان اور اختلافی مسئلہ ہے ۔ اور اس لئے یہ اوراق اس بحث کا تحمل نہ کر سکیں گے! قطع نظر اس امر کے یہ فلسفۂ خودی ایک اختلافی مسئلہ ہے یا نہیں ۔ میں ان اوراق میں اس بحث کو کیوں چھیڑوں جبکہ ان اوراق کا یہ موضوع ہی نہیں ہے بہرحال اقبال کی شاعری کے دو ثالث کی تمام بنیاد اسی فلسفہ پر ہے ۔ جس کے لئے اس نے اپنے زورِ قلم کو وقف کر دیا ۔ اُسی فلسفہ کی فضا میں اقبال کی شاعری نے نشو و نما پائی ۔ بلندی پائی حوصلہ پایا ۔ نظر پائی ۔ اور ایمان پایا! وہی فلسفہ اقبال کو اُس دنیا میں لے گیا ۔ جہاں ڈھونڈنے والوں کے لئے حیاتِ ملی اور مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی ایک نئی جنت کا دروازہ سامنے آتا ہے ۔ شراب بلاشبہ پرانی ہے ۔ قدیم ہے ۔ مگر مینا نئی ہے ۔ اقبال نے اُس مینا کو بہت مزین اور منقش کر دیا ہے ۔ وہ اپنے فلسفہ کی چٹان پر کھڑا ہو کر عصرِ جدید کو ایک عام چیلنج دیتا ہے ۔ اُس چیلنج کے ساتھ ساتھ ایک پیامِ زندگی بھی ہے!

اقبال "وطنیت" اور ملت اسلامی کی جغرافی حدبندی کا دشمن ہے ÷

آں چناں قطع اخوت کردہ اند　　　بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند　　　نوعِ انساں را مقابل ساختند

وہ مغربی باطل پرستوں کے اُس تخیل کی اپنے ہر صفحہ پر اور ہر سطر میں تحقیر کرتا ہے جس نے "وطنیت" کو دنیا کا معبود بنا کر

طرحِ تدبیرِ زبوں فرجام ریخت　　　یک خسک در بادۂ ایام ریخت

تیرہ سو برس پرانی "وطنیت" کا تخیل آج بھی اقبال کا تخیل ہے

نرالا سارے جہاں سے اُس کو عرب کے معمار نے بنایا　　　بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی ‌ ‌ ‌ رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی ‌ ‌ ‌ دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے!

دورِ حاضر کی جدتوں کا اقبال قایل نہیں ہے۔ وہ ابھی تک قدیم تخیل کا دامن مضبوط پکڑے ہوئے ہے۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ‌ ‌ ‌ ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور ‌ ‌ ‌ تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مغرب کے تہذیب و تمدن کو وہ "فسونگری خرد" سے تعبیر کرتا ہے۔ عقل و دانش کی کارفرمائیوں سے بے نیاز ہو کر وہ ایک جرعۂ "عرفان" مانگتا ہے۔ وہ تہذیب و علوم جدیدہ سے اسقدر بیزار ہے۔ کہ مصوری اور موسیقی کو بھی "فنون لطیفہ غلاماں" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور شکوہ کرتا ہے کہ ان کے اندر موت ہے زندگی نہیں ہے۔

می چکد از خامہ ہا مضمون موت ‌ ‌ ‌ ہر کجا افسانہ و افسون موت
بے یقیں را لذت تحقیق نیست ‌ ‌ ‌ بے یقیں را قوت تحقیق نیست

مغنی اور مصور اس کی نظر میں بازاری مذاق کے غلام ہیں۔

رہبر او ذوق جمہور است و بس

تقلید اقبال کے مذہب میں کفر سے کم نہیں۔ اور ہر مجتہد کے مذہب میں ایسی ہی سمجھی جاتی ہے۔ تہذیب جدیدہ کی تقلید اس کی نظر میں مرگ ملت ہے۔

قیمت شمشاد خود نشناختی ‌ ‌ ‌ سرو دیگر را بلند انداختی

مثل نے خود را از خود کردی تہی　　بر نوائے دیگراں دل مے نہی
اے گدائے ریزہ از خوانِ غیر　　جنس خود می جوی از دکان غیر
بزم مسلم از چراغِ غیر سوخت　　مسجد او از شرارِ دیر سوخت
از سواد کعبہ چوں آہو رمید　　ناوک صیاد پہلویش درید

اقبال ملت اسلامی کی خرابی کا بڑا سبب اسی تقلید کو سمجھتا ہے۔ اور اسی لئے بار بار "فسونگری خرد" کی عمارتوں پر تیشہ چلاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس خس و خاشاک سے میدان صاف ہو لے تو اس کا پیام سنا جائے۔ جو بھٹکے ہوئے ہیں وہ راستہ پائیں اور جو آہو "سواد کعبہ" سے دور چلے گئے ہیں اُن کے پہلو ناوکِ صیاد سے محفوظ رہ جائیں۔

اے کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق　　نخرد بادہ کس از کارگہ شیشہ گراں
خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ　　سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں
برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل تست　　اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں!

بخاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست　　تجلی دگرے درخور تقاضا نیست
اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت　　تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

اقبال کی شاعرانہ زندگی کا سب سے بڑا جہاد "عقل فسوں پیشہ" کے خلاف ہے۔ وہ پہلے مسلمانوں کے دلوں میں یہ احساس خودداری پیدا کرنا چاہتا ہے کہ "تجلی دگرے درخور تقاضا نیست" پھر وہ راستہ بتاتا ہے کہ "از خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست" اور طرح طرح سے قدم قدم پر کبھی بحث کے ساتھ کبھی طنز کے انداز میں۔ کبھی استہزا کے لہجہ میں۔ کبھی تحقیر کے پیرایہ میں وہ تہذیب فرنگ کے بتوں کو سرنگوں کرنا چاہتا ہے۔ اور بار بار اُس تہذیب کے دلدادوں کو اپنی طرف بلاتا ہے:—

ترسد فسوں گری عصر بہ تپش دل زندہ　　نہ گشت غیاں درآ بجسم سوز و گداز من

اقبال فلسفۂ فرنگ کے بت خانہ کا بڑا عالی حوصلہ اور بلند نظر غزنوی ہے! تمدن جدیدہ کے ہر تخیل کو جو عصر حاضر کے بت خانہ کا بت ہے وہ تحقیر کی انگلی سے اشارہ کر کے دکھاتا ہوا کہتا ہے۔۔

بتان تازہ تراشیدۂ دریغ از تو　　درون خویش نکاویدۂ دریغ از تو
چناں گداختۂ از حرارت فرنگ　　زچشم خویش تراویدۂ دریغ از تو
گرفتم ایں کہ کتاب خرد فرو خواندی　　حدیث شوق نفہمیدۂ دریغ از تو
طواف کعبہ زدی گرد دیر گردیدی　　نگہ بخویش نپیچیدۂ دریغ از تو

"کتاب خرد" اور "حدیث شوق" ——— کتاب خرد کی خامیاں اور حدیث شوق کی گرمیاں— کس کس انداز سے وہ مغرب پرست مشرق کے سامنے پیش کرتا ہے۔ "عشق" اور "عقل" کے اس مجادلہ میں-اقبال عشق ہی عشق ہے۔ ذوق ہی ذوق ہے۔ اس کا تفکر سراپا مشرقی ہے وہ مغرب کی ترقیوں کو دیکھتا ہے اور ایک ہی مصرعہ میں ختم کر دیتا ہے ع عقل تا بال کشود است گرفتار تر است + وہ "عشق" کی قوت کو محسوس کرتا ہے اور ایک ہی مصرعہ میں فیصلہ کر دیتا ہے ع عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است + علوم و سائنس کی تمام ترقی اس کے خیال میں ایک مشت خاک ہے جو "پسر مریم" کی آنکھ میں جھونکی گئی! شاعر کی نظر میں مغربی تمدن کا سرمایہ کس قدر حقیر ہے!

جلوہ اُو بے کلیم و شعلہ اُو بے خلیل!

وہ ہر جلوہ میں ایک کلیم ڈھونڈتا ہے۔ اور ہر شعلہ میں ایک خلیل مانگتا ہے۔ کہاں تک شاعر کا یہ "مذہب عشق" تو تہذیب و تمدن و سائنس و علوم کے اٹھتے ہوئے طوفان کا حریف ہو سکیگا— یہ بحث ایک اور فرصت چاہتی ہے ——— اس وقت تو صرف شاعر کی نظر اس کا حوصلہ اور اس کا بیان، زیر بحث ہے۔ وہ اسلام اور مشرقیت کا ترجمان بنکر ——— مدعی بنکر ——— دنیا

کے سامنے آتا ہے۔ اُس کے ادّعا کو دیکھئے اور اُس کے "ترجمہ" کو دیکھئے۔ ۰ وہ مغرب کی عقل سے آزاد ہو کر "مشرق" کے عشق میں مبتلا ہے ـــــــ اُس کو مبتلا رہنے دیجئے اور اُس کے سمندر کی اُٹھتی ہوئی لہروں کی موسیقی سے لطف اندوز ہو جیئے جہاں تک کہ آپ سے ہو سکے ـــ اُن چٹانوں سے قطع نظر کیجئے جن سے یہ لہریں ٹکرا رہی ہیں۔ "عشق" تنقید و تبصرہ سے بے پروا ہے۔ عاشق اپنے کیف تمام سے ہمیشہ نا جنا اور مجبور رہے:-

چہ کنم چہ چارہ گیرم کہ زخویش علم و دانش　　نہ دمید ہیچ خارے کہ بدل نشانم اورا

قدحے خرد فروزے کہ فرنگ داد ما را　　ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر ندارد

شاعر اس منزل میں ہے جہاں آفتاب کتنا ہی چمکے۔ وہ "اثر سحر" مانگتا ہے! انقلاب مانگتا ہے! عقل کا انکار نہیں سننا چاہتا اور "عشق" کا اقرار چاہتا ہے! اقبال کا یہ وجدان اُسی کے قلم سے کس بیتابی اور درد کے ساتھ بیان کرتا ہے:-

اے مسلمانان فغاں از فتنہ ہائے علم و فن　　اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

گوئٹے کا "فاوسٹ" کچھ اسی رنگ میں عاجز آکر چلاتا تھا:-

"لعنت ہو ان بلند خیالات پر!

جن سے ہمارا ذہن اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے۔

لعنت ہو۔ مظاہر کی نظر بندی پر!

جو ہمارے حواس پر قبضہ کر لیتی ہے۔

لعنت ہو شہرت اور ابقائے دوام کے فریب پر!
جو ہمیں خواب زر خوشامد کی لوری دیتے ہیں +
لعنت ہو مال و حشم پر ۔

اقبال کی شاعری کا ملخص بھی کچھ ایسا ہی ہے:-

لعنت ہو عقل فسوں پیشہ پر!
لعنت ہو نیرنگ فرنگ پر!
لعنت ہو فلسفہ ہائے علم و فن پر!
لعنت ہو کتاب خرد پر اور حکیمان فرنگ پر!
لعنت ہو وطنیت پر ۔
لعنت ہو دانش مغربیان پر و فلسفۂ مشرقیان پر!

رحمت ہو اس ادارۂ ملت پر جو تیرہ سو برس پہلے عرب کے "امی" نے قائم کیا تھا +
رحمت ہو اس ادارہ پر اور جو کچھ اس کے اندر ہے اس پر!

رموز بیخودی۔ اسرار خودی۔ طلوع اسلام۔ شمع و شاعر۔ بانگ درا۔ پیام مشرق۔ زبور عجم۔ جاوید نامہ۔ ان سینکڑوں صفحات میں وہی ایک "اہرمن" ہے اور وہی ایک "یزدان" ہے جو ہزاروں ناموں سے۔ لاکھوں اشاروں سے۔ استعاروں سے۔ تلمیحات سے۔ بار بار۔ بار بار بیان کیا گیا ہے! وہ ایک ہی "حدیث عشق" ہے، کہ کہنے والا کہے جاتا ہے۔ کہے جاتا ہے!! لیکن یہ سوال کہ اقبال کے "دریائے تخیل" کی یہ "موج خون" "دانش مغربیان" کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا تھک جائے گی یا پھر ایک دن یہ سمندر ان چٹانوں کو بہا لے گا — یہ سوال ایسا ہے کہ شاید اس کے حریف یہ اوراق نہیں ہو سکتے! شاعر بہر حال اپنا کام کر رہا ہے۔ اور پیغمبری کر رہا ہے۔ اور



شمع اور شاعر

A Pencil Sketch by
Shahabuddin Rahmat Ullah,
PATNA

پیغمبروں کی طرح پیشینگوئی کرتا ہے کہ اے " دیارِ مغرب کے رہنے والو"
" تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی!"

جو دیکھ سکتے ہوں، وہ دیکھیں۔ جو سمجھ سکتے ہوں، وہ سمجھیں۔ شاعر کو اس سے بحث نہیں کہ تم کیا سمجھے اور کیا نہ سمجھے۔ وہ تو اپنے میخانہ میں کسی خم کے سہارے بیٹھا اپنی فطرتِ حساس کے نقوش بے محابا دنیا کے سامنے پھینک رہا ہے!

پیرِ مغانِ فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھکو تو خانہ ساز دے

وہ اس کیفِ غم اور اس "خانہ ساز" کی گہرائیوں میں کھویا جاتا ہے ——— گم ہو جاتا ہے!

خودی کے فلسفے سے "رجعیت" (عقل و علم کی تمام سحرکاریوں کو ٹھکراتا ہوا) شاعر اپنے مذہب کا بنیادی پیام دنیا کو پہنچاتا ہے۔ اُس کے مذہب کا رکن "امید" کا ایک جلوۂ مستحکم اور خوف اور مایوسی کا انکارِ قطعی ہے:-

مرگ را سامان ز قطعِ آرزو است
زندگانی محکم از لاتقنطوا است

ناامید از آرزوئے پیہم است
ناامیدی زندگانی را سم است

زندگی را یاس خواب آور بود
این دلیل سستی عنصر بود

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لاتحزن بگیر

گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو!

اقبال کی نظر میں مسلم کے لئے بیم و خوف شرکِ قطعی ہے۔ وہ ایمان کی نفی ہے۔ زندگی میں موت کی ظلمت ہے۔ بیداری میں غفلت کا پیام ہے۔ بیم و خوف کا دروازہ بند کر کے شاعر ضمیرِ مسلم میں وہ چراغِ "آرزو" روشن کرنا چاہتا ہے:-

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

یہی شاعر کا پیام ہے۔ جو آج بیس برس سے ایک "چراغِ آرزو" ظلمت خانۂ حیات میں روشن کئے ہوئے ہے۔ ہر دفعہ نئے لباس میں شاعر کی روح اپنا پیام لے کر آتی ہے۔ ہر دفعہ نئے الفاظ میں وہی ایک خطابِ زندگی یہ پیامبر لاتا ہے۔ ہر دفعہ نئے رنگ میں نئی آواز سے نئے منتر سے وہ سوتوں کو جگانا چاہتا ہے۔ کبھی کہتا ہے:-

اسرارِ ازل جوئی بر خود نظرے وا کن   یکتائی و بسیاری پنہانی و پیدائی
برخیز که فروردیں افروخت چراغِ گل   برخیز و دمے بنشیں با لالۂ صحرائی

کبھی کہتا ہے:-

بیا که تازه نوا می‌تراود از رگِ ساز   مئے که شیشه گدازد به ساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازه دہیم   بنائے میکدہ ہائے کہن براندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لاله کشیم   به بزمِ غنچه و گل طرحِ دیگر اندازیم

بطوفِ شمع چو پروانه زیستن تا کے؟
ز خویش این ہمه بیگانه زیستن تا کے؟

سفر کرتا، آوازیں لگاتا، چلا جا رہا ہے۔ مغرب کی وادیوں میں، مشرق کے صحراؤں میں، یورپ کی آبادیوں میں، ایشیا کے ویرانوں میں کہتا چلا جا رہا ہے جو کچھ اُس کو کہنا ہے۔ لیکن اقبال ہر حال میں اور ہر منزل پر وہی تیرہ سو برس پہلے کا حدی خوان شتربان، عرب بدوی ہے۔ وہ اپنے اونٹ کی نکیل ہاتھ میں لے کر مغرب اور مشرق کے آسمانوں کے نیچے سربلند گزرنا چاہتا ہے۔ اور اپنی ملّت کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہے:-

مغرب ز تو بیگانه مشرق همه افسانه   وقت است که در عالم نقشِ دگر انگیزی

آں کس کہ بہ سر دارد سودائے جہانگیری ۔۔۔ تسکین جنونش کن با نشتر چنگیزی

ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام ۔۔۔ خون حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را

درون لالہ گذر چوں صبا توانی کرد ۔۔۔ بہ یک نفس گرہ غنچہ وا توانی کرد
حیات چیست؟ جہاں را اسیر جاں کردن ۔۔۔ تو خود اسیر جہانی کجا توانی کرد
مقدر است کہ مسجود مہر و مہ باشی ۔۔۔ مگر ہنوز ندانی چہا توانی کرد
اگر ز میکدۂ من پیالۂ گیری ۔۔۔ ز مشت خاک جہانے بپا توانی کرد

مانند صبا خیز و وزیدن دگر آموز ۔۔۔ دامان گل و لالہ کشیدن دگر آموز
اندر دل یک غنچہ خزیدن دگر آموز
تخت جم و دارا سر راہے نفروشند ۔۔۔ ایں کوہ گران است بکاہے نفروشند
با خون دل خویش خریدن دگر آموز
نالیدی و تقدیر ہماں است کہ بود است ۔۔۔ آں حلقۂ زنجیر ہماں است کہ بود است
نومید مشو نالہ کشیدن دگر آموز

حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا ۔۔۔ تری نسبت براہیمی ہے معمار جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی ۔۔۔ جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

*

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا ۔۔۔ خودی کا رازداں ہو جا۔ خدا کا ترجماں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر　　شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بنکے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں میں　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر　　زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

بلاشبہ اقبال کی لذّتِ فریاد سے کہا جا سکتا ہے کہ

زمیں پر تو ہے اور تیری صدا ہے آسمانوں میں

لیکن اگر تمدّنِ حاضرہ کے موجودہ دورِ ابتلا میں جب ایک لعنت وجودِ انسانی پر مسلط ہے، شاعر کی صدا نہ سنی گئی ہو تب بھی ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ شاعر نے اپنا فرض انجام نہیں دیا۔ آج سے کچھ کم بیس برس پہلے اس نے ہندی مسلم کی نئی نسل کو جو پیام دیا تھا، وہی آج تک اس کے ساز کے ہر تار سے ادا ہو رہا ہے :-

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے　　عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے
آتی ہے کوہ سے صدا، رازِ حیات ہے سکوں　　کہتا ہے مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے
موت ہے عیشِ جاوداں، ذوقِ طلب اگر نہ ہو　　گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے
شمعِ سحر یہ کہہ گئی، سوز ہے زندگی کا ساز　　غمکدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمالِ شانِ سکندری سے　　تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمالِ پائے ہلال تیرا　　جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو، ادا مثالِ نماز ہو جا

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر　　بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق   سنگ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں   تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو   کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا   جہان رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کر لے

طرب آشنائے خروش ہو تو نوائے محرم گوش ہو   وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ   کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئنہ ساز میں

شاعر اپنی زندگی کے آئینہ میں قوموں کی زندگی کو دیکھتا ہے۔ وہ مٹھی بھر مٹی اٹھاتا ہے اور اس مٹھی میں ایک پارۂ الماس ڈھونڈتا ہے۔ وہی جو اس کے جسد خاکی میں ہے۔ ہر مشت خاک میں ایک چنگاری۔ ایک انگارا تلاش کرتا ہے --- وہی جس نے آپ کے وجود خاکی میں حیات زندگی قایم رکھی ہے۔ اس کے سوا وہ کچھ دیکھتا ہی نہیں --- کچھ چاہتا ہی نہیں۔ آہستہ کہتا ہے پھر لوگ سنتے نہیں تو چیخ اٹھتا ہے :-

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر   کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ   پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار   اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار   تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات — تیرے سینہ میں اگر ہے تو مسیحائی کر
کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم — اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

اے ہما از یمنِ دامت ارجمند — آشیانے ساز بر کوہِ بلند
تا شوی در خوردِ پیکارِ حیات — جسم و جانت سوزد از نارِ حیات

تو شمشیری ز کامِ خود بروں آ — بروں آ از نیامِ خود بروں آ
نقاب از ممکناتِ خویش برگیر — مہ و خورشید و انجم را بہ بر گیر
وگرنہ آتش از تہذیبِ نوگیر
بروں خود بیفروز اندروں میر !

کتنے مایوسوں کو وہ راستے بتاتا ہے۔ کتنے گم کردہ راہ مسافروں کو وہ منزل کا پتہ دیتا ہے۔ جو عالمِ خاکی میں مقید ہیں اُنہیں فضائے بسیط میں پروں کو پھیلانے کا نکتہ سمجھاتا ہے۔ خود آگے بڑھتا جاتا ہے اور پیچھے آنے والوں کو بلاتا جاتا ہے :-

بگذر ز سراب و بہ پہنائے ہوا ساز — ایں نکتہ نہ بیند مگر آں دیدہ کہ بیناست
گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں — ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است
چمن خوش است ولیکن چو غنچہ نتواں زیست — قبائے زندگیش از دمِ صبا چاک است
بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی — چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

باز خلوت کدۂ غنچہ بروں زن چو شمیم — با نسیمِ سحر آمیز و وزیدن آموز

اگرت خار گل تازہ رسے ساختہ اند　　پاس ناموس چمن دار و خلیدن آموز
باغباں گر ز خیابان تو بر کند ترا　　صفت سبزہ دگر بار دمیدن آموز
تا کجا در تہ بال دگراں می باشی　　در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

اپنی ملت کے ہر فرد، ہر طبقہ کے لئے شاعر ایک دستور العمل اور ایک نصب العین پیش کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس کی بلند آہنگی۔ عوام و خواص کی کمزوریوں اور مشکلات کو نظر انداز کر دیتی ہو کتنا ہی کمزور اور بے عمل کوئی فرد ہو شاعر نے اس کی اہلیت کے اندازہ سے اس کے لئے ایک راہ عمل تجویز کر دی ہے۔ "خلوت کدۂ غنچہ" کے آسودہ مکین نسیم سحر کے جھونکوں کے ساتھ اپنی خلوت سے نکل چلیں ——— اگر وہ باد تند و گرم سے گھبراتے ہیں! جو کمزور انسان شبنم کی افتادگی اپنی فطرت میں رکھتے ہوں وہ کم از کم "داغ دل لالہ" سے اپنا واسطہ قایم رکھیں ——— اگر کانٹوں سے گھبراتے ہیں! جو کوئی باغ کے پھولوں میں کانٹے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، وہ کچھ خلش ہی پیدا کرنا سیکھ لے!

جو غیروں کے دامن کے سایہ میں پرورش پا کر بے عمل ہو گئے ہیں وہ اپنے بازوؤں کی طاقت سے اڑنا سیکھ لیں! مگر دوا سب کے لئے وہی ہے، پیام سب کے لئے یکساں ہے۔ البتہ بہ اندازۂ اہلیت۔

بہ ہر مرض کہ بنالد کسے شراب دہند!

وزن کم و بیش ہے۔ نسخہ وہی ہے! جس کو ہزار طرح سے، ہزار عنوانوں کے تحت میں اقبال نے بیان کیا ہے

ز نیل و صید نہنگاں حکایتے آور　　مگو کہ زورق ما روشناس دریا نیست
شریک حلقۂ رندان بادہ پیما باش　　حذر ز بیعت پیرے کہ مرد غوغا نیست

در جہاں مانند جوئے کوہسار — از نشیب و ہم فراز آگاہ شو

یا مثالِ سیلِ بے زنہار خیز — فارغ از پست و بلند راہ شو!

کوئی تشبیہ، کوئی استعارہ، کوئی اشارہ، کوئی کنایہ باقی نہیں جس سے کہ سر اقبال نے اپنا پیام نہ لکھا ہو۔ پھول کی پنکھڑی میں، کانٹے میں، دریا کی روانی میں، صحرا کے بگولوں میں، پہاڑ کی بلندی میں، میخانہ کے خم میں، ساقی کے ساغر میں، مغنی کے ساز میں، ساز کے تار میں، ستاروں میں، آسمانوں میں۔

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست؟

یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے!

وہی ایک بزمِ شوق ہے، وہی ایک شاعر ہے، وہی اُس کا پیام ہے!!

جب کوئی قوم زندگی کی آسائشوں کو ڈھونڈھنے لگے، جسم و جان کی راحتوں کو عزیز رکھنے سمجھ لیجئے کہ وہ اب غلام رہنے یا بننے والی ہے۔ اُس کا طبل جنگ تہی اور اُس کا میخانۂ حیات خالی ہے۔ شاعر اُس وارثِ ملت سے کہتا ہے:-

مرا ز لذتِ پرواز آشنا کردند — تو در فضائے چمن آشیانہ می خواہی

جنوں نہ داری و [illegible] نگار شہر — سبو شکستی و بزمِ شبانہ می خواہی

تو ہم بہ شیوۂ [illegible] کوشش و دلبری آموز — اگر ز من غزلِ عاشقانہ می خواہی

اے کہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز — کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز

از سرِ تیشہ گذشتن ز خردمندی نیست — اے بسا لعل کہ اندر دلِ سنگ است ہنوز

تاکِ خود در گریہ ہائے نیم شب سیراب دار کز دروں او شعاعِ آفتاب آید بروں
ذرّۂ بے مایۂ ترسم کہ ناپیدا شوی پختہ تر کن خویش را تا آفتاب آید بروں
در گذر از خاک و خود را پیکرِ خاکی مگیر چاک اگر در سینہ ریزی آفتاب آید بروں
گر بروے تو حریمِ خویش را در بستہ اند سر بسنگِ آستاں زن لعلِ ناب آید بروں

لاچاریوں اور مجبوریوں کا علاج بتاتا ہے۔ محرومیوں اور معذوریوں کی دوا تجویز کرتا ہے کمزوریوں اور پست حوصلگی کو دور اڑاتا ہے :-

گرفتم ایں کہ غریبی و رہ شناس نۂ بکوئے دوست بہ اندازِ محرمانہ گذر

غبار گشتۂ آسودہ نتواں زیستن اینجا بہ بادِ صبحدم در پیچ و منشیں بر سرِ راہے

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے!

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

علاج بتاتا ہے۔ ہمتیں بڑھاتا ہے اس طرح کہ گویا بس نہیں چلتا کہ سننے والے کو اپنے ساتھ لے کر ہوا میں بلند ہو جائے! اُس کو اپنے علاج پر اتنا وثوق ہے کہ دین اور دنیا کی تمام نعمتوں کو ہمراہ رو کے سامنے رکھ دیتا ہے:

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن　　چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!

بخورشید سحر پیدا نگاہے می تواں کردن　　ہمیں خاک سیہ را جلوہ گاہے می تواں کردن
نگاہ خویش را از نوک سوزن تیز تر گرداں　　چو جوہر در دل آئینہ راہے می تواں کردن
تو در زیر درختاں ہمچو طفلاں آشیاں بندی　　بہ پرواز آ کہ صید مہر و ماہے می تواں کردن

غلام ہمت بیدار آں سوارانم　　ستارہ را بہ سناں سفتہ در گرہ بستند

جہد بقا کے میدان میں شاعر اپنی قوم میں ایسے افراد مانگتا ہے جو مہر و ماہ کو شکار کر لیں۔ اور آسمان کے ستاروں کو نیزے کی نوک پر اٹھا لائیں! اقبال زمین کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ اُس کی نظر ہمہ وقت آسمان پر ہے! گویا آسمان ہی اُس کی زمین ہے! وہ اپنی تمام زندہ کاویوں اور تراوشوں کو پہلو میں لے کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اور اپنا وہی ایک خواب دیکھے جاتا ہے۔ جو اُس کو لاکھوں بیداریوں سے زیادہ عزیز ہے۔ اُس خواب میں بھی اُس کا راگ وہی ایک راگ ہے!

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز　　بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز　　دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش
نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں　　ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

اُسی کیف بیخودی میں وہ "بربطِ عالم" کو اُٹھا لیتا ہے۔ اور اپنی زندگی کا ایک شاہکار، شمع و شاعر

کے نام سے دنیا کے سامنے پھینک دیتا ہے۔ پڑھ لے جس کو پڑھنا ہو۔ سمجھ لے جو سمجھ سکتا ہو!

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار — نکہت خوابیدہ غنچہ کی نوا ہو جائیگی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک — یعنی گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائیگی
شبنم افشانی مری پیدا کریگی سوز و ساز — اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائیگی
دیکھ لو گے سطوت رفتار دریا کا مآل — موج مضطر ہی اُسے زنجیر پا ہو جائیگی
نالۂ صیاد سے ہونگے نوا ساماں طیور — خون گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائیگی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

قاضی عبدالغفار

مثنویاتِ اقبال

(اسرار و رموز)

{علامہ عبد الرحمٰن مرحوم بجنوری پی ایچ ڈی کے فاضلانہ مضمون کا ترجمہ}

(از جناب مالک رام صاحب ایم۔ اے)

[جن لوگوں نے ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم کا دیباچۂ دیوان غالب (نسخۂ حمیدیہ) جو علیحدہ کتابی صورت میں بھی بعنوان محاسنِ کلامِ غالب چھپ چکا ہے۔ پڑھا ہے۔ وہ اس سے موصوف کے عمقِ فکر اور پہنائیِ خیال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مرحوم ان لوگوں میں سے تھے۔ جن سے علم و ادب اردو کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ بدقسمتی سے اجل نے انہیں فرصت نہ دی۔ کہ وہ کچھ مستقل خدمت ادب زبان کر سکتے۔ انہوں نے سوائے چند مضامین کے کوئی اپنی زیادہ پائدار یادگار نہیں چھوڑی۔ مگر جو تھوڑا بہت بھی اُن کے قلم سے نکلا ہے کافی ہے۔ کہ ہم اس سے ان کے وسعتِ مطالعہ۔ دقتِ نظر اور اصابت رائے کی نسبت ایک صحیح رائے قایم کر سکیں ◆

ایک برخود غلط ادیب کی رائے میں دیباچۂ مذکور میں "سوائے شرح اشعار کے اور جو کچھ ہے سب واہی تباہی ہے"۔ یہ رائے اردو کے ایک شاہکار مضمون کی نسبت ہے، اور ہر شخص کا حق ہے کہ وہ کسی چیز کی نسبت جو رائے چاہے قایم کرے۔ مگر کیا اچھا ہو کہ تنقید اور رائے قایم کرنے سے پہلے جذبۂ تنقیص و تفضیح دل سے نکال دیا جائے۔ پندار اور تفاخر

کوئی اچھی چیز نہیں۔ اور جب کسی نقاد کے دل میں۔ چیزیں راہ پکڑ لیں۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے۔ کہ وہ صراط مستقیم سے بھٹک جاتا ہے۔ اور ۔وارودی میں ایسے خیالات کا اظہار کر جاتا ہے جو کسی دوسری حالت میں غالباً وہ زبان پر نہ لاتے گا +

اگر ادیب ممدوح نے ذرا یہ سمجھنے کی کوشش کی ہوتی۔ کہ مضمون لکھتے وقت ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی نفسیاتی کیفیت کیا تھی۔ تو شاید وہ اس فیصلہ پر نہ پہنچتے۔ میرے نزدیک اس مضمون میں جو والہانہ جوش دکھایا گیا ہے۔ اُن کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل۔ غالب سے پہلے اردو زبان کا جو سرمایہ تھا۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ یہ ایسا پامال اور فرسودہ مضمون ہو چکا ہے۔ کہ اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ غالب وہ پہلا شخص ہے۔ جس نے ہمیں بتایا۔ کہ اردو زبان میں ترقی کی کتنی صلاحیت ہے۔ اس میں وسعت کی کتنی گنجایش ہے۔ اور اس میں کیسے کیسے خیالاتِ جدید اور مضامین عالیہ کا اظہار ممکن ہے۔ بجنوری مرحوم کے پیش نظر غالب بھی تھا۔ اور اُس کے پیشرو معاصرین بھی انہیں حیرت ہوئی کہ اس آذر کدے میں یہ ابراہیم پیدا کیونکر ہوا؟ جواب ایک ہی تھا۔ جوہر صالح اور ذہانت خداداد۔ اس امر نے اُن کے دل پر غالب کے تفوق کو منقوش کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی قدرتی طور پر کچھ خوش اعتقادی کا شائبہ بھی پیدا ہو گیا +

دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ اس مضمون میں مرحوم نے آئینۂ غالب میں اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا اپنا تخیل اتنا بلند۔ اور علم اتنا وسیع تھا۔ کہ لکھ تو وہ رہے تھے دیوان غالب پر تبصرہ لیکن جا بجا اپنی روح اور دماغ کے نقوش کی تعبیر دیوان غالب سے ڈھونڈ رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنے مرغوبات کو غالب پر چسپاں کر دیا۔ لازماً اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مضمون زیر بحث میں ایسے مبحث بھی آ گئے ہیں۔ جو نفس موضوع سے بے تعلق سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ واہی تباہی ہے۔ یقیناً اس میں بھی اتنا سامان بصیرت موجود ہے۔ کہ ہم اس سے غالب کی دھندلی تصویروں کو زیادہ اُجاگر کر سکتے ہیں۔ اور غیر ممالک کے مصنفین کے ساتھ موازنہ کرکے

ایک راستے (خواہ وہ کتنی ہی غیر مکمل کیوں نہ ہو) قائم کر سکتے ہیں۔

[مندرجہ ذیل مضمون بھی ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ اسرارِ خودی سب سے اوّل ۱۹۱۶ء میں اور رموزِ بیخودی ۱۹۱۸ء میں شایع ہوئیں۔ مرحوم نے جب یہ مضمون انگریزی رسالہ ایسٹ اور ویسٹ میں لکھا تھا۔ جب ایک زبان کے خیالات دوسری زبان میں منتقل کئے جائیں۔ تو وہ اپنی شگفتگی اور زیبائی کا اکثر حصّہ کھو بیٹھتے ہیں۔ اس وجہ سے جیسا کہ ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے۔ میں نے لفظی ترجمہ سے احتراز کیا ہے۔ تاکہیں بھی اصل مضمون کی روح کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ نوٹ سارے کے سارے میں نے خود بڑھائے ہیں۔ اور کوشش کی ہے کہ متعلقہ اشعار درج کر دیئے جائیں لیکن پھر بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ایک مضمون پر کے تمام اشعار دیدیئے گئے ہیں۔ مثنویوں میں ایک ایک موضوع پر طرح طرح سے بحث کی گئی ہے۔ جگہ جگہ نئے نئے انداز سے اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر تمام متعلقہ اشعار درج کرتا تو بلا مبالغہ دونوں مثنویاں ساتھ چھپ جائیں۔ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ ناظرین اسرار و رموز کا خود غائر مطالعہ کریں۔ اور ان کے مضامین کو سمجھنے کی سعی کریں۔ فقط تلوک رام]

جب نقد و تبصرہ کا موضوع کوئی زندہ مصنف ہو، تو نقاد کے لئے لازم ہے۔ کہ قدم پھونک پھونک کر اٹھائے کیونکہ یہ ممکن ہے۔ کہ مصنف اور نقّاد کے درمیان کوئی رنگین پردہ حائل ہو جائے۔ یا قربِ مکانی ہی مصنّف کے خط و خال کی تفاصیل کو دھندلا کر دے۔

ہندوستان کے اسلامی ادب میں روح کا ملاءِ اعلیٰ کی جانب صعود میرزا غالب کے زمانہ سے بدستور جاری ہے۔ غالب۔ حالی اور اقبال ایک مقدس اقانیم ثلاثہ کے ارکان ہیں۔ غالب نے اس سکون و جمود کا خاتمہ کر دیا۔ جو انحطاط کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے۔ کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کر دئے۔ مگر وہ کوئی غیر معقول متشکک نہیں تھا۔ جسے اپنے شک

کی صحت پر بھی یقین نہ ہو۔ اس کا شک ایک چنگاری تھی جس نے دنیا میں آگ سی لگا دی۔ دہلی کی سلطنت اس کی شاعری کی متحمل نہ ہو سکی۔ اور اس کی ایک نگاہ نے اسے ملیامیٹ کر دیا +

حالی نے جس کے خون میں شعرائے عرب کی سی گرمی تھی۔ دیکھا کہ دنیا اپنی ظاہری حسن و نمائش کے باوجود تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ اس نظارہ نے اسے بہت متاثر کیا۔ مگر اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کی اس نے غم و یاس کے ساتھ ساتھ تخلیقی قوت کی مسرت کا احساس کیا۔ اور اپنے استاد کی ناخوشی کردہ عمارت کے کھنڈرات پر ایک نئی دنیا کی تعمیر ٹھانی۔ اور اسے اپنے سینہ میں نشو و نما دی۔ امید کی جھلک نے اسے نئی زندگی دی اور یوں تن مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی +

اقبال کی شاعری یاس و قنوط کی زنجیروں سے آزاد ہو گئی ہے۔ اس نے اس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اور نئی عمارت کو رجائی بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ اس کا نام وعدہ اور بشارت کا مترادف ہے۔ اس نے زمانۂ حاضرہ کے غیر ملکی اثر پر قابو پا لیا ہے۔ جو فضا سے ہند پر چھایا جا رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس نے اس اخلاقی قوت کی مدد سے کیا ہے جس کا منبع اور مبداء خالص اسلامی ہے۔ اس کی روحانی تعلیم نے اس انانیت کو فتح کر لیا ہے۔ جو اس مادی دور کی پیداوار ہے۔ اقبال اسلامی کارواں کا سالار ہے جس کی منزل مقصود حرم محترم ہے +

اقبال کے ساتھ ادب نوجوانوں کے ہاتھ میں آ جاتا ہے اور خود بھی جوان ہو جاتا ہے۔ اسکی شخصیت اس کی دونوں مثنویوں سے (اسرار خودی و رموز بیخودی) پوری طرح نمایاں ہے۔ ان میں وہ زندگی ہے۔ وہ طاقت ہے جس کے لئے ہماری نئی نسل پرانے غزل گو شعرا کے دواوین کو بے سود کھنگالتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر باک نہیں۔ کہ اقبال ہمارے درمیان مسیحا بن کر آیا ہے جس نے مردوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دیئے ہیں۔ زمانہ پر اس کے پیغام کی اہمیت رفتہ رفتہ واضح ہو گی۔ جو زمانہ حاضرہ کی ان دونوں معرکۃ الآرا نظموں میں پنہاں ہے +

مثنویاں ایک ایسے غیر فانی کام کا جزو ہیں جو تکمیل کے بعد اسلامی دنیا کے خواب کی صحیح تعبیر ہو گا۔ اقبال

کے نظریہ کے مطابق موجودہ اسلامی ممالک کے تنزل کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ مسلمانوں نے عمل کی زندگی کی بجائے افلاطونی بے عملی کو اختیار کر لیا ہے۔ افلاطونیت جدیدہ اور حافظ۔ نے ان سے وہ احساس مسرت چھین لیا ہے۔ جو "کچھ کرنے" کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اور اس کی جگہ اس دماغی تفتیش نے لے لی ہے۔ جو ایک تن بیمار کا خاصہ ہے۔ مسلمانوں میں سنگ خارا کی سختی کی بجائے کوئلہ کی سی نرمی آگئی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی جگہ مخلوقِ خدا کا خوف ان پر حاوی ہو گیا ہے[1]۔

مگر زندگی کا ایک نصب العین بنا لینے سے سب خوف دور ہو جاتے ہیں۔ ترقی و عروج اسلام کے لئے خدا نے ولیعت کر رکھے ہیں۔ پس توحید الٰہی پر کامل اعتقاد ہمیشہ خوف کو زائل کرتا ہے[2]۔ اور دل میں دعزم

---

[1] اس مضمون کو علامہ ممدوح نے "حکایت طائرے کہ از تشنگی بیتاب بود" اور حکایت "الماس و زغال" میں بیان فرمایا ہے۔ موخر الذکر میں جب کوئلہ الماس سے پوچھتا ہے۔ کہ باوجودیکہ ہماری پیدائش ایک کان سے ہوئی ہے کیا وجہ ہے کہ تو سرِ تاجِ شہنشاہاں ہوتا ہے اور میں انگیٹھی میں جلتا ہوں۔ تیری قدر ہوتی ہے اور میں ہر جگہ ذلیل ہوں

گفت الماس اے رفیقِ نکتہ بیں   تیرہ خاک از پختگی گردد نگیں
تا بہ پیرامونِ خود در جنگ شد   پختہ از پیکار مثلِ سنگ شد
پیکرم از پختگی ذوالنور شد   سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد
خوار گشتی از وجودِ خامِ خویش   سوختی از نرمیِ اندامِ خویش
فارغ از خوف و غم و وسواس باش   پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش
می شود از وے دو عالم مستنیر   ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
مشتِ خاکے اصلِ سنگِ اسود است   کو سر از جیبِ حرم بیروں زد است
البتہ از طور بالاتر شد است   بوسہ گاہِ اسود و احمر شد است
در صلابت آبروئے زندگی است   ناتوانی، ناکسی، ناپختگی است   (اسرار صفحہ ۶۴)

[2] تا عصائے لا الٰہ داری بدست   ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست   (بقیہ اگلے صفحہ پر)





صمیم پیدا کرتا ہے۔ جو خلاقی کا طغریٰ ہے جسکا حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیر[1] اندر قفس اور تیسری[2] کا مانی نہیں ہے، اسلام کی روح مساوات کی روح نہیں ہے۔ بانیان سلطنت کا خون بانیانِ مکانات آب و گل سے زیادہ قیمتی نہیں۔ شریعت کے معتوب کے لئے کوئی پناہ نہیں۔ اور جس کا محافظ قرآن کریم ہے اُسے خوف سے کوئی واسطہ نہیں[3]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۴:-

هر که حق باشد چو جان اندر تنش خم نگردد پیش باطل گردنش
خوف را در سینهٔ او راه نیست خاطرش مرعوب غیر الله نیست
هر که در اقلیم لا آباد شد فارغ از بند زن و اولاد شد
می کند از ما سوی قطع نظر می نهد ساطور بر حلق پسر
با یکی مثل هجوم لشکر است جان به چشم او ز باد ارزان تر است

(اسرار صفحہ ۴۲)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

ای که در زندان غم باشی اسیر از نبی تعلیم لا تحزن بگیر
این سبق صدیق را صدیق کرد سرخوشش از پیمانهٔ تحقیق کرد
از رضا مسلم مثال کوکب است در ره هستی تبسم بر لب است

گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیال بیش و کم آزاد شو

قوت ایمان حیات افزایدت ورد لا خوف علیهم بایدت
چون کلیمی سوی فرعونی رود قلب او از لا تخف محکم شود
بیم غیر الله عمل را دشمن است کاروان زندگی را رهزن است

بیم جاسوسی است از اقلیم مرگ اندرونش تیره مثل میم مرگ
هر شر پنهان که اندر قلب تست اصل او بیم است اگر بینی درست
هر که رمز مصطفیٰ فهمیده است شرک را در خوف مضمر دیده است

(رموز۔ صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱)

یہی مضمون محاورہ "تیر و شمشیر" اور حکایت "شیر و عالمگیر" میں بیان کیا گیا ہے۔ آخرالذکر کے دو شعر درج ذیل ہیں:

عشق را آتش زن اندیشه کن روبه حق باش و شیری پیشه کن
خوف حق عنوان ایمان است و بس خوف غیر از شرک پنهان است و بس

(رموز صفحہ ۱۱۴)

شاه عالمگیر گردون آستان اعتبار دودمان گورگان
درمیان کارزار کفر و دین ترکش ما را خدنگ آخرین
در صف شاهنشهان یکتاستی فقر او از تربتش پیداستی
روزی آن زیبندهٔ تاج و سریر آن سپهدار و شهنشاه و فقیر
صبحگاهان شد به سوی بیشه‌ای با پرستاری وفا اندیشه‌ای

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اقبال ایک محدود زمانہ کے اندر اسلامی نظام کو از سرِ نو حیاتِ تازہ اور شباب بخشنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بلکہ جس طرح ایک مہوّس مادۂ خام سے سونا نکال لیتا ہے۔ وہ موجودہ زمانہ کا ہے مگر اس کی نظر مستقبل پر بھی ہے اور موجودہ زمانہ کا نکتہ چیں بھی ہے +

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵

سرخوش از کیفیت بادِ الست — طائراں تسبیح خواں بر ہر شجر
شاہِ مرداں آں امیر ذوالخمار — خیمہ بر زد در حقیقت از مجاز
شیر برآمد بپا از طرفِ دشت — از خروش او فلک لرزندہ گشت
بوئے انساں دادش از انساں خبر — پنجۂ عالمگیر را زد بر کمر
دست شہ نادیدہ خنجر برکشید — شورشِ شیرے را شکم از ہم درید
دل بخود راہے نداد اندیشہ را — شیر تا الیہ رگ و ریشہ را
باز سوئے حق رہِ آں نامجو — بود معراجش نماز با حضور
ایں چنیں دل خود نما و خود شکن — دارد اندر سینۂ مومن وطن
تو ہم اے ناداں دلے آور بدست — شاہدے را محملے آور بدست

(رموز صفحہ ۱۱۲ تا ۱۱۴)

۲ اندروقلس اور شیر کی کہانی مشہور ہے:۔

اندروقلس روما کا ایک رم خوردہ غلام تھا۔ اس نے ایک غار میں پناہ لی۔ اچانک اس غار میں ایک شیر بھی داخل ہوا اور بجائے غلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے اپنا پاؤں اس کے سامنے رکھ دیا جس میں کانٹا چبھا تھا۔ غلام نے وہ کانٹا نکال دیا۔ اور شیر چلا گیا۔ بعد میں غلام گرفتار ہوا۔ اور حسب قانون اسے شیر سے کشتی لڑنے کا حکم ہوا۔ حسن اتفاق کہ اس کے مقابل وہی شیر چھوڑا گیا جس کا کانٹا اس نے نکالا تھا۔ جب شیر اس پر جھپٹ کر آیا تو اسے پہچانتے ہی فوراً اس کے قدموں میں گر پڑا۔ اور اس کے پیر چاٹنے لگا جب حکام نے یہ نظارہ دیکھا۔ تو غلام کو آزاد کر دیا۔ ایک اسی طرح کا واقعہ برطانوی سفیر روما سر جارج ڈیوس کا بھی ہے لیکن طوالت سے خالی نہیں۔ اس لئے چھوڑتا ہوں۔

۳ مساوات اسلامی کا مضمون نہایت تفصیل سے رموز کے باب رسالت میں درج ہے۔ میں صرف "حکایت سلطان مراد و معمار" سے چند اشعار درج ذیل کرتا ہوں۔

بود معمارے ز اقلیم خجند — در فنِ تعمیر نام او بلند
ساخت آں صنعت گر فرہاد زاد — مسجدے از حکم سلطان مراد
خوش نیامد شاہ را تعمیر او — خشمگیں گردید از تقصیر او
آتش سوزندہ از چشمش چکید — دست آں بیچارہ از خنجر برید
جوئے خوں از ساعدِ معمار رفت — پیش قاضی ناتوان و زار رفت
آں ہنرمندے کہ دستش سنگ سفت — داستانِ جور سلطاں باز گفت

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایمرسن[1] افلاطون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ ہیملیٹ بالکل افلاطونی ہے۔ اقبال اپنے ہم مذہبوں کو افلاطون کے ہیملٹ پن (متشائم پسندی) کے خلاف خبردار کرتا ہے۔ اس متشائم پسندی اور اخلاقی ضعف نے کئی قوموں کو بلندی سے دے ٹپکا ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ مسلمان اس زمین پر رہیں اور یہاں کے کاموں کی نکوکاری پر توجہ دیں۔ افلاطون اس پرندۂ صبح کی مانند ہے۔ جو ایک اثیری دنیائے خواب وخیال میں پرواز پر قانع ہے۔ برخلاف اس کے اقبال ایک بحری عقاب کی طرح ہے۔ جو بحر حیات کی طوفان خیز موجوں پر سوار ہو۔ اقبال کا فلسفہ خودی اور عمل کا فلسفہ ہے +

اقبال کو سب سے بڑا اعتراض اس یونانی فلسفی کے مسئلہ عیان[2] پر ہے۔ جسے جدید افلاطونیوں نے مرتب

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶ :-

قاضی عادل بدندان خستہ لب　　کرد شہ را در حضور خود طلب
رنگ شہ از ہیبت قرآں پرید　　پیش قاضی چوں خطاکاراں رسید
گفت شہ از کردہ خجلت بردہ ام　　اعتراف از جرم خود آوردہ ام
گفت قاضی فی القصاص آمد حیات　　زندگی گیرد بایں قانون ثبات
عبد مسلم کمتر از احرار نیست　　خون شہ رنگیں تر از معمار نیست
چوں مراد ایں آیۂ محکم شنید　　دست خویش از آستیں بیروں کشید
مدعی را تاب خاموشی نماند　　آیۂ بالعدل والاحسان خواند
گفت از بہر خدا بخشیدمش　　از برائے مصطفےٰ بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر　　سطوت آئین پیغمبر نگر
پیش قرآں بندہ و مولا یکیست　　بوریا و مسند دیبا یکیست

(رموز صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۵)

[1] رالف والڈو ایمرسن (۱۸۰۳ تا ۱۸۸۲ء) امریکہ کا مشہور مصنف۔ انیسویں صدی کے اخلاقیات پر اس کی تصنیفات اور تعلیم نے نہایت گہرا اثر ڈالا۔ اسکا فلسفہ خود اعتمادی و خودداری اور اس کا روح کے احکام کی پابندی پر زور دینا بہت موثر ثابت ہوا اور تا حال اسکے خیالات کا دائرہ اثر ترقی پذیر ہے +

[2] راہب دیرینہ افلاطوں حکیم　　از گروہ گوسفنداں قدیم
گفت سر زندگی در مردن است　　شمع را صد جلوہ از افسردن است
بر تخیلہائے ما فرمانرواست　　جام او خواب آور و گیتی رباست
گوسفندے در لباس آدم است　　حکم او بر جان صوفی محکم است
عقل خود را بر سر گردوں رساند　　عالم اسباب را افسانہ خواند
کار او تحلیل اجزائے حیات　　قطع شاخ سرو رعنائے حیات
فکر افلاطوں زیاں را سود گفت　　حکمت او بود را نابود گفت

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کرکے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ افلاطونیت جدیدہ پر بدترین ضعف طاری ہے۔ اور وہ ضعف فقدان جذبۂ عمل سے ہے۔ ان کا مابعد الطبیعیات قاطع حیات ہے۔ اور مقصد زندگی کا محو کنندہ۔ کیا یہ تباہی کا راستہ نہیں؟ اقبال کے نزدیک زندگی ایک حقیقت ہے۔ اسلامی زندگی سے بڑھ کر اور کوئی معراج نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تحقیق میں زمین پر ایک نائب قائم کرنے والا ہوں"[1]

اقبال میں جان ہے، چستی ہے۔ حلاوت ہے۔ قناعت ہے۔ تفاؤل ہے۔ خون تازہ ہے۔ حقیقت پسندی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اسلام ہے۔ وہ نہیں دیکھ سکتا کہ ملت ابراہیمی دار الفنا میں داخل ہو۔ خواہ اس کا راستہ دکھلانے والا خود افلاطونِ اعظم ہی کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کی فنادگی اور گوسفندی اُسے غضبناک کر دیتی ہے۔ وہ اسے روحانیات اور تصوّفِ جدید پر محمول کرتا ہے۔ یہاں وہ ایک مبارز کی حیثیت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور جانتا ہے کہ اس کا مدمقابل کون ہے؟ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں۔ وہ حافظ شیراز ہے۔ اقبال کا قلم تلوار سے کم کاٹ نہیں کرتا۔ میرا ذاتی عقیدہ ہے۔ کہ یہ روحانیات یا تصوّف بعد کی پیداوار ہے۔ اور ہمارے مذہب کی روح کے منافی ہے۔ اسلام کا اساسی اصول توحید ہے۔ اور تصوّف کی بنیاد "ہمہ اوست" پر قائم ہے۔ توحید مثبت ہے۔ اور "ہمہ اوست" منفی۔ ہارٹن کا خیال ہے کہ تصوفِ جدید بہت حد زرتشتی اور بدھ مت کے خیالات سے متاثر ہے۔ فان کریمر اس میں ویدانت کے آثار دیکھتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں صداقت افلاطونیت جدیدہ اور آزادنشو و ارتقا کے بین بین ہے +

تصوّف کے رویتِ حق اور افلاطون کے اعیانِ ناشہود میں مماثلت ہے۔ صوفیوں کا رقص مستانہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱:-

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود ۔۔۔ جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت ۔۔۔ خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است ۔۔۔ مردہ دل را عالمِ اعیاں خوش است
آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام ۔۔۔ لذّتِ رفتار بر کبکش حرام
شبنمش از طاقتِ رم بے نصیب ۔۔۔ طائرش را سینہ از دم بے نصیب
ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش ۔۔۔ از تپیدن بے خبر پروانہ اش
قوم ہا از سکرِ او مسموم گشت ۔۔۔ خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

(اسرار صفحہ ۲۴ تا ۲۶)

[1] وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرہ ۳۰)

در حقیقت نقل ہے۔ فلاطونی روح کی جو ایک متحرک دائرہ ہے۔ اپنے مرکز قدیم کے گرد اور ہیں۔ اور یہ مرکز خود خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔ افلاطونیت جدید اور تصوف جدید ان دونوں کی تفاصیل اور ظواہر میں بہت حد تک تطابق موجود ہے۔ براؤن لکھتا ہے کہ فلاطینوس[1] کی تحریرات صاحب[2] الفہرست اور شہرستانی[3] سے مخفی نہیں تھیں +

عا: بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں افلاطون۔ اس کے فلسفہ اور فلاطینوس اور افلاطونیت جدیدہ (اشراق) کی نسبت کچھ تھوڑا سا لکھ دیا جائے کیونکہ یہ لفظ مضمون میں اکثر استعمال ہوئے ہیں (ا) افلاطون (۴۲۹ - ۳۴۷ ق ۔ م) وہ سقراط کا شاگرد تھا۔ اس کا اصلی نام ارسطاقلیس تھا مگر اس کے چوڑے چکلے سینہ کی وجہ سے سقراط نے اسکا نام افلاطون رکھا۔ اس نے فلسفہ کو تین شاخوں میں تقسیم کر دیا۔ اخلاقیات منطق (مابعد الطبیعیات) اور الہیات۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے تمام مخلوق کو اپنی شکل پر بنانے کا خیال کیا۔ اس نے پہلے روح کو بنایا جو محسوس اور معقول کے درمیان توصل کا کام دیتی ہے۔ اس روح کے ساتھ اس نے جسد خاکی کو ملایا۔ روح جسم کے تین حصوں میں رہتی ہے۔ دماغ دل اور انتڑیاں۔ اور ان سے بالترتیب عقل حوصلہ اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ وہ خدا کی طرح مادہ کو بھی ازلی مانتا ہے۔ اس کے نزدیک تمام علم اپنی انتہا میں واحد اور آزاد ہے۔ خدا تمام چیزوں کا معیار ہے۔ اور اس میں ہی ہمت اور عقل کا اجتماع ہوتا ہے۔ اور تمارت میں جو کچھ اصلی ہے اور جو خیالات و قوانین کا مجموعہ ہے خدا سے نکلا ہے۔ اس کا مسئلہ اعیان ثابتہ بہت مشہور ہے۔ اس کی کتاب الجمہوریت اردو میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔ اور اسکے نصب العین سیاسیات کو واضح کرتی ہے

(ب) فلاطینوس (۲۰۳ یا ۲۰۴ میں پیدا ہوا اور ۲۶۲ اور ۲۷۰ کے درمیان فوت ہوا) نے افلاطونیت جدیدہ کو مرتب کیا اپنے خیال میں وہ افلاطون کا شارح اور متبع تھا۔ مگر اس کے خیالات اپنے پیشرو سے کچھ اس قدر مختلف ہیں کہ افلاطون سے انکی نسبت بھی غلطی ہے۔ فلاطینوس کے فلسفہ کی قدر و قیمت اس کے خیالات کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ بوجہ اپنی تاریخی اہمیت اور بعض انسانی طبائع کے تجزیہ کی وجہ سے ہے۔ فلاطون کے نزدیک عقل میں جو کچھ بہترین اور اعلیٰ ترین ہے۔ اس کا نام خیر ہے۔ فلاطینوس خیر کو تجربہ محض خیال کرتا ہے۔ فلاطون انسانی اخلاق کی معراج عقل انسانی کے ذریعہ تتبع خداوندی قرار دیتا ہے۔ فلاطینوس تتبع اور خود صفات اللہ کو بنگاہ حقارت دیکھتا ہے اور انسانی مطمح نظر ادغام بہ ایزد یقین کرتا ہے۔ فلاطینوس کے نظریہ کے مطابق روح اپنے مبداء سے ایسے ہی نکلی ہے جیسے سورج سے شعاعیں۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اسلام ان تمام بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ خدا ربّ العالمین ہے۔ اور مادّہ کی علّت سے مبرّا۔ اس کی مخلوق سراب نہیں۔ جس طرح خدا لکڑی اور پتھر سے تراشا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح اس کی رؤیت بھی مادّی یا روحانی آنکھوں سے ناممکن ہے۔ شیخ احمد سرہندی[1] اپنے ملفوظات میں تحریر فرماتے ہیں " اگر کوئی صوفی یا مجذوب خیال کرتا ہے۔ کہ اس نے خدا کا دیدار کیا ہے چشمِ ظاہر سے یا چشمِ باطن سے۔ تو اس نے اپنے واہمہ یا اپنے دماغ کی متصوّرہ شکل کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ خداوند تعالیٰ بے مثال ہے۔ یکتا ہے اور نظر سے اوجھل۔ خدا تک پہنچنے کا راستہ شریعت کا راستہ ہے[2]۔ جدید تصوف کے خیالات باطلہ 'مغضوب' اور 'ضالّین' کے راستہ پر چلاتے ہیں۔ اقبال کے فلسفہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے۔ کہ اسلامی عقائد و شعائر کو افلاطون اور ارسطو کے تاثرات سے آزاد کر دے۔ تاثرات جن کا لازمی نتیجہ رہبانیت و تباہی ہے۔ تصوف جدید رہبانیت ہے۔ یہ اس دنیا کو خواب

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹ - اور اب غیر ارادی طور پر پہنچ کر دیکھنے کے لئے گہرے غور کرتی ہے۔ اس حرکت میں اس سے تصوّر اور تصوّر سے خیال پیدا ہوتا ہے یہ خیال انسانی روح کا آفرینندہ۔ اور تخیر کا زرین ترین مقام ہے اور اسی کی ارتقائی حالت تخیل ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان بلا واسطہ عشق کا تعلق ہے۔

ع۲ ابو النعیم - ع۳ ابو الفتح محمد الشہرستانی مصنف کتاب الملل و النحل جس میں مختلف مذہبی فرقوں کا حال بتفصیل درج ہے۔ کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہوچکا ہے۔ سال وفات ۱۱۵۳ء مطابق ۵۴۸ھ۔

ع۱ - شیخ احمد سرہندی کا لقب مجدد الف ثانی تھا۔ شیخ عبدالاحد فاروقی سرہندی کے فرزند ارجمند تھے۔ سرہند میں ۱۵۶۳ء مطابق ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے مشہور ولی اللہ خواجہ باقی باللہ کے مرید تھے۔ ان کا یقین تھا۔ کہ ہر ہزار سال کے بعد ایک شخص ایسا پیدا ہوتا ہے۔ جو تمام علوم اسلامیہ میں کامل اور طاقت و شوکت اسلام کا بڑھانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ دعویٰ کرتے تھے۔ کہ دوسرے ہزار سال کا مجدد میں ہوں ۱۶۲۴ء مطابق ۱۰۳۴ھ میں وفات پائی۔ مقبرہ سرہند میں ہے۔

ع۲ در شریعت معنی دیگر مجو غیر ضو در باطن گوہر مجو

این گہر را خود خدا گوہر گر است ظاہرش گوہر باطنش گوہر است

علم حق غیر شریعت ہیچ نیست اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

فرد را شرع است مرقات یقین پختہ تر از وے مقامات یقین

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

درخوابِ ما یقین کرتا ہے۔ یہ زندگی کے حقائق کا مقابلہ کرنے سے کتراتا ہے۔ اس نے اسلام کی تعلیمِ عمل کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور عمل ہی اصلِ اسلام ہے۔ اقبال اپنے ہم مذہبوں کو پھر اسی عمل کی طرف واپس بلاتا ہے۔ اس کی حقیقی روحانی تعلیم، اخلاقی قوت، جوش، فکر، سرگرمی اور عمل میں مضمر ہے۔ مگر وہ حافظ سے کیوں برسرِ پیکار رہے؟ اور مولانا جلال الدین رومی کے خلاف صف آرا نہیں ہوتا۔ حالانکہ موخر الذکر تمام متصوفانہ شاعری کا باوا آدم ہے۔ سبب ظاہر ہے۔ صوفی جب اپنے تجربات بیان کرتے ہیں۔ تو انہیں قدرتاً الفاظ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۰

ملت از آئینِ حق گیرد نظام   از نظام محکمے خیزد دوام
با تو گویم سرِ اسلام است شرع   شرع آغاز است و انجام است شرع
شارعِ آئین شناس خوب و زشت   بہر تو این نسخۂ قدرت نوشت
از عمل آہن عصب می سازدت   جانے خوب تر جہاں اندازدت
خستہ باشی استوارت می کند   پختہ مثل کوہسارت می کند
ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات   شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا   آنچہ حق می خواہد می سازد ترا

صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دلِ آہن رباید زنگ را

(رموز صفحہ ۱۴۶ تا ۱۴۸)

عہ فلسفۂ عمل علامہ کا بڑا دل پسند موضوع ہے۔ انہوں نے اپنی تمام کتابوں میں اس کی تعلیم دی ہے۔ اور ہر جگہ نئے انداز سے دی ہے۔ اگر جگہ تنگ نہ ہوتی تو دوسری کتب سے حوالہ جات پیش کرتا۔ مگر ظرفِ دامن نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار۔ صرف مواد و موضوع ہی پر اکتفا کیا ہوں [illegible] جگہ سے۔ ضرورت ہے کہ ناظرین کتاب کو خود بھی [illegible] مطالعہ کریں۔

اے ز جورِ چرخِ ناہنجار تنگ   جامِ تو فریادیِ بیدادِ سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا   سینہ کوبی ہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات   لذتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو   شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن   ہست در میداں سپر انداختن
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار   با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں   می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را   می دہد ترکیبِ نو ذرات را
می کند از قوتِ خود آشکار   روزگارِ نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست   ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست
آزماید صاحبِ قلبِ سلیم   زورِ خود را از مہماتِ عظیم

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ جو عوام کے فہم و ادراک کے مطابق ہوں۔ خیالات خواہ آسمانی ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر ذریعۂ اظہارِ خیالات زمینی الفاظ ہوں گے۔ عشق جب 'مے' اور 'نغمہ' کے پردوں میں بیان کیا جائیگا۔ تو عجب نہیں۔ کہ اس سے مادّی اور ہیجانی لذّات مراد لی جائیں۔ سنائی، عطّار اور رومی باوجود اس کے ایسی زبان میں لکھتے ہیں۔ جو ان کی حقیقی سطح کو صاف نمایاں کر دیتی ہے۔ اور ان کی نظموں کو مادّی تاویل کے جال میں نہیں پھنسنے دیتی۔ ممکن ہے وہ اپنے ناظرین کو دنیا سے پرے لے جائیں۔ مگر وہ اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچاتے۔ برخلاف اس کے حافظ نے ان کے نشہ آور جرعہ میں اصلی شراب ٹپکا دی ہے۔ اس کا دیوان بصیرت سے زیادہ سُکر آور ہے۔ بلا ریب سقراط[1] کی مانند حافظ مخربِ اخلاق نہیں۔ تاہم وہ ان کے خراب کرنے میں ممد و معاون ضرور ہوا ہے۔ اس سے بہتوں نے شرابِ حقیقت کی بجائے شرابِ مجازی پی ہے۔ اقبال کا حملہ در اصل اس اپیکوری[2] رد کے خلاف ہے۔ نہ کہ شعرا کے مادی تصوفِ جدیدہ پر۔

جیسے کہ نکلسن دیوانِ شمس تبریز کے دیباچہ میں لکھتا ہے "تصوف جدید کے انحطاط کی انتہا ہے۔ کہ اس نے پیر کو الوہیتی صفات سے متصف کر دیا ہے۔ پیر کے سب دشنام۔ اور بداخلاقیوں بلکہ اس کے جرائم کی نہ صرف

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۰

عشق با دشوار، ورزیدن خوش است | چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
حربۂ دوں ہمتاں کین است و بس | زندگی را ایں یک آئین است و بس
زندگانی قوتِ پیدا ستے | اصلِ او از ذوقِ استیلاستے
عفو بیجا سردیٔ خونِ حیات | سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات
ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است | ناتوانی را قناعت خواندہ است
ناتوانی زندگی را رہزن است | بطنش از خوف و دروغ آبستن است

(رموز ۵۴ تا ۵۶)

ع۱ سقراط (۴۶۹-۳۹۹ ق م) یونانی فلسفی۔ افلاطون کا استاد۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ اپنے نفس کو جانو یعنی اپنی واقفیت کا اندازہ کرو۔ روح کی تعریف وہ یوں کرتا ہے "ہمارے اندر چیز جو علم بھی رکھتی ہے اور بے علمی بھی۔ خیر بھی اور شر بھی" اپنی خدا پرستی کی وجہ سے زہر سے ہلاک ہوا۔

ع۲ اپیکورس (۳۴۲-۲۷۰ ق م) یونانی فلسفی۔ اسکی تعلیم کا بنیادی اصول یہ تھا کہ چونکہ خوشی اور غم ہی دنیا کے خیر اور شر ہیں اسلئے فلسفہ کا مقصد اولی حصول مسرت اور انعدام کلفت ہونا چاہئے اس کے نزدیک سکونِ قلب بھی بمراقبۂ خیر پر منتج ہوتا ہے۔ آجکل جو مشہور ہے کہ اسکی تعلیم تھا "پیو اور خوش رہو" یہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اسکی ...

یہ کہ تاویل کی جاتی ہے۔ بلکہ ان کو متبرک سمجھا جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ایسے نظریوں کا جو برا اثر سادہ لوحوں پر پڑتا ہے اُس کے نتائج سے کون آگاہ نہیں" یہ دوسری وجہ ہے۔ اقبال اور آجکل کے صوفیوں کے درمیان جنگ کی جب اسرارِ خودی شایع ہوئی۔ تو بعض صوفی پیر جنہیں روایات باطلہ کی پابندی اور شریعتِ حقہ سے ناوابستگی کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا[1]۔ اقبال کے خلاف کھڑے ہو گئے "اسے دار پر کھینچ دو۔ یہ مسلمانوں کو مغربی مادیت کی تعلیم دیتا ہے" اقبال کی آواز شور و شغب سے بلند سنائی دی۔ "جاہل اور بر خود غلط! خدا کی شان۔ کہ آج افلاطونی او ہمہ اوستی مجھے مغربی مادیت کا شایع کرنیوالا خیال کر رہے ہیں"

آج ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے اہم ترین سوال مسئلہ وطنیت ہے۔ اسلام قیدِ مکانی سے آزاد ہے۔ اور وطنیت بستۂ حدود و جہات ہے۔ اقبال بھی اپنے آپ کو اسلام اور وطن کے درمیان گھرا ہوا پاتا ہے اس کی شاعری ان خیالات کی تصویر ہے۔ جو آج ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں گزر رہے ہیں۔ وہ میکیاولی[2]

۱؎ حضرت علامہ نے ایک جگہ ایسے پیروں کی نہایت صحیح شکل کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں:-

شیخ در عشقِ بتاں اسلام باخت رشتۂ تسبیح از زنار ساخت
پیرہا پیر از بیاضِ مو شدند سخرۂ بہر کودکان کوشدند
دل ز نقشِ لا الٰہ بیگانۂ از صنمہاے ہوس بتخانۂ
می شود ہر مو درازے خرقہ پوش آہ ازیں سوداگرانِ دیں فروش
با مریداں روز و شب اندر سفر از ضرورت ہاے ملت بیخبر
دیدہ ہا بے نور مثلِ نرگس اند سینہ ہا از دولتِ دل مفلس اند
واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست اعتبارِ ملتِ بیضا شکست
واعظِ ما چشم بر بتخانہ دوخت مفتیِ دینِ مبیں فتویٰ فروخت
چیست یاراں بعد ازیں تدبیرِ ما
رخ سوئے میخانہ دارد پیرِ ما

(اسرار صفحہ ۷۹)

۲؎ میکیاولی (۱۴۶۹ء تا ۱۵۲۷ء) اطالوی مورخ و سیاسی۔ وہ فلارنس میں پیدا ہوا۔ اور وہاں مدتوں ریاست میں مناصب جلیلہ پر سرفراز رہا۔ آخر معطل کیا گیا۔ اور اپنے جاگیری بندوبست میں بقیہ عمر بسر کی۔ اس کی "کتاب الملوک" سب سے پہلے ۱۵۳۲ء میں پوپ کلیمنٹ ہفتم کی اجازت سے شایع ہوئی۔ اس میں اس نے سیاسیات اور اخلاقیات کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کی۔ اور اس میں زمانۂ حال کے کئی سیاسیین نے اس کی تقلید کی ہے۔ جو اپنی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کو مجرم گردانتا ہے۔ اور اسے "مقامی ریاست" کے خیال کا بانی قرار دیتا ہے۔ اقبال اس فلارنساوی کو مورد طعن ٹھہراتا ہے جس نے دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس کی کتاب الملوک شاہنشاہوں کا لائحہ عمل بنی۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی تعلیم دانتے[۲] اور مارسیلیس کے "ریاستِ عالمگیر" کے خیال کو زائل

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۳

سیاسی اغراض و مقاصد میں اصولِ اخلاق کو دخل نہیں دینا چاہئے

حضرتِ علامہ اس کی نسبت فرماتے ہیں:-

دہریت چوں جامۂ مذہب درید — مرسلے از حضرتِ شیطاں رسید
آں فلارنساوی باطل پرست — سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
نسخۂ بہرِ شہنشاہاں نوشت — در گلِ ما دانۂ پیکار کشت
فطرت او سوئے ظلمت بردہ رخت — حق ز تیغِ خامۂ او لخت لخت
بتگری مانندِ آزر پیشہ اش — بست نقشِ تازہ اندیشہ اش
مملکت را دینِ او معبود ساخت — فکرِ او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد — نقدِ حق را بر عیارِ سود زد
باطل از تعلیمِ او بالیدہ است — حیلہ اندازی فنے گردیدہ است
طرحِ تدبیرِ زبوں فرجام ریخت — ایں خسک در جادۂ ایام ریخت
شب بہ چشمِ اہلِ عالم چیدہ است — مصلحت تزویر را نامیدہ است

(رموز صفحہ ۱۱۴)

۲۔ دانتے (۱۲۶۵-۱۳۲۱) اٹلی کا بزرگ ترین شاعر ہے۔ اس کی ڈیوائن کومیڈی (طربیۂ الٰہی) مشہور و معروف چیز ہے۔ اس میں مصنف نے طبقاتِ علوی کی سیر کا حال بیان کیا ہے۔ اسے اس نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دوزخ۔ دار الکفارہ اور جنت۔ وہ خواب دیکھتا ہے کہ میں ایک گھنے جنگل میں جا نکلا ہوں۔ جہاں ورجل (اس سے پہلے کا ایک اطالوی شاعر) ہیولیٰ ظاہر ہوتا ہے۔ اور دوزخ اور دار الکفارہ میں اس کی رہنمائی کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ دوزخ کے جو نظارے دانتے نے بیان کئے ہیں۔ بلحاظ وقتِ نظر۔ اعتقادنامہ اور جدتِ خیالات کردار نگاری غالباً بے نظیر ہے اور شاید کسی ایک مصنف کے کلام میں اتنی خوبیاں بیک وقت نہیں ملینگی۔ دار الکفارہ میں نظارے تقریباً وہی ہیں۔ البتہ سزا و عقوبت عارضی ہے۔

جنتِ سماوی میں اس کا رہبر اس کی معشوقہ بیطرس ہے سات طبقوں کی سیر کے بعد وہ آٹھویں طبقہ میں پہنچتا ہے۔ جہاں حضرت یسوع مسیح کو اپنے صاحبِ عظمت حواریوں کے حلقہ میں دیکھتا ہے۔ نویں طبقہ میں وہ اپنے آپ کو روحِ کل کی موجودگی میں محسوس کرتا ہے۔ اور ارواحِ مرحومہ کو ایک لامحدود دائرہ میں تختوں پر بیٹھا ہوا دیکھتا ہے۔ خداوند تعالیٰ خود دسویں طبقہ میں جلوہ افروز ہے جسے وہ فرطِ نور کے باعث نظارہ نہیں کر سکتا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کرنے اور عیسائیت رومانیہ کی حدود اغالیہ میں قیام کرنے پر منتج ہوتی۔ اقبال نہیں چاہتا کہ اسلام ملکوں کی چہار دیواری میں قید ہو کر قومیت کا تختہ بن جائے۔ اقبال کی سیاست اخلاق پر مبنی ہے نہ کہ خود غرضی پر۔ مذہب سیاسی زندگی کا حقیقی پاسبان ہے۔ وطن یا ملک۔ ایک عارضی اور جغرافیائی چیز ہے۔ تاریخی حوادث و واقعات اس کے حدود اور نصب العین کو متواتر بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی سیاست عارضی ہوتی ہے۔ اور وہ چند صدیوں کے لئے بھی ایک نہج پر قائم نہیں رہتا۔ اقبال کی "ریاست عالمگیر" مذہبی ہے خدائی ہے۔ آفاقی ہے۔ اور ابدی ہے مگر یاد رہے اقبال یہ نہیں کہتا کہ حب وطن حب الایمان کی تشنیع ہے۔ کل میں جزو ہوتا ہے۔ عالمگیر اخوت میں حب وطن پوشیدہ ہے۔ اسلامیان ہند کے راستے پر دو نشان ہیں اسلامیت محض اور وطنیت۔ اور دونوں زندگی کی ایک ہی منزل کی جانب راہ نمائی کرتے ہیں۔ اگرچہ راہیں الگ الگ ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴

ان تمام روحانی تجربات کی بنا پر در اصل اعتقاد حسن خیر و زشت شر اور محبت کی عالمگیری اور قدرت عظیمہ ہے۔ اور یہ سب کچھ اس جوش و خروش اور صحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ کہ الہام معلوم ہوتا ہے چنانچہ دنوں سے پہلے ہمیشہ ان کا یہ خیال رہا کہ یہ تمام حالات الہامی تھے۔

۱؎ جوہر ما با مقامی بستہ نیست — بادۂ تندش بجامی بستہ نیست
ہندی و چینی سفال جام ماست — رومی و شامی گل اندام ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست — مرز و بوم او بجز اسلام نیست
زانکہ ما از سینہ جاں گم کردہ ایم — خویش را در خاک او گم کردہ ایم
مسلم استی دل باقلیمی مبند — گم مشو اندر جہان چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم — در دل او یاوہ گردد شام و روم

عقدۂ قومیت مسلم کشود — از وطن آقای ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملت گیتی نورد — بر اساس کلمہ تعمیر کرد
تا ز بخششہای آن سلطان دین — مسجد ما شد ہمہ روی زمین
آنکہ در قرآن خدا او را ستود — آنکہ حفظ جان او موعود بود
دشمنان بی دست و پا از ہیبتش — لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش
پس چرا از مسکن آبا گریخت؟ — تو گمان داری کہ از اعدا گریخت
قصہ گویان حق ز ما پوشیدہ اند — معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئین حیات مسلم است — این ز اسباب ثبات مسلم است
صورت ماہی بہ بحر آباد شو — یعنی از قید مقام آزاد شو

از فریب عصر نو ہشیار باش
رہ فتد ای راہرو ہشیار باش

(رموز صفحہ ۱۶۱ تا ۱۶۲)

درحقیقت اقبال ایں مذہب کے غائر مطالعہ اور عمیق جذبۂ حب الوطنی کا امتزاج کامل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کا سیاسی مطمح نگاہ اس کے بلند مذہبی نصب العین کے ماتحت ہے۔ سیاسی نقطۂ خیال اور مذہبی مقصد نظر کے امتزاج نے اس کے سیاسی فلسفہ کو ایک نئی حیثیت دیدی ہے ؛

فریڈرک نیٹشے[1] کے خیال میں فن کی دو شکلیں ہیں - (۱) اپالونی اور (۲) ڈایونیسنی + اپالونی یہ وقار اور سنجیدہ تفکر ہے ۔ ڈایونیسنی طوفان اور ہیجان کا دوسرا نام ہے۔ نیٹشے کا " ارشاداتِ زرتشت " جو عہدِ حاضر کے جرمنی کا شاہکار ہے - بلحاظ ہر دو موضوع اور طرز تحریر ڈایونیسنی ہے ۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی بھی جو دونوں اسلام کی حیاتِ ثانیہ کے نشانات ہیں ۔ اسی قبیل سے ہیں - کیا اقبال نیٹشے کے زیر اثر ہے ؟ اس کا جواب اثبات میں ہے ۔ اگرچہ وہ ہمیشہ مستعار چیز کو جلا دیکر ایک نئی اور عجوبہ چیز بنادیتا ہے ۔ نیٹشے میں اس کے ماخذ حکایتِ " الماس و زغال " (اسرارِ خودی) سے دیکھے جاسکتے ہیں ۔ جو تصنیفِ مندرجۂ بالا کی حکایت[29] (پتھر و کوئلہ سے ماخوذ ہے) مگر چونکہ اقبال نیٹشے سے بزرگ تر شاعر ہے ۔ اس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل

---

[1] فریڈرک نیٹشے (۱۸۴۴ - ۱۹۰۰) جرمن شاعر اور فلسفی - لیکن چونکہ وہ اصل میں شاعر تھا - اس لئے اُسکے نزدیک فلسفہ بھی زندگی اور فکر کی تنقید ہی ہے ۔ اسکے خیال میں تمام مخلوق میں جس میں انسان بھی شامل ہے - آرزوئے حیات سب سے زیادہ ہے جس کے معنی ہیں کہ طاقت حاصل کی جائے اور تمام رکاوٹوں کا قلع قمع کیا جائے - جو زندگی کو مشکل بناتی ہیں - موجودہ انسان مخلوق خداوندی کا منتہائے مقصود نہیں - بلکہ جیسے جانور کی ارتقائی صورت انسان ہے ۔ ایسے ہی انسان بھی عارضی ہے - اور اس کے بعد مکمل انسان (فوق البشر) ہوگا - جسمیں حسن و طاقت عقل و اخلاق - قوت ارادی و عمق نگاہ بدرجۂ کمال ہونگے - اور ان الفاظ کے معانی بھی ان کے موجودہ مطالب سے کچھ زیادہ وسیع ہونگے - محبت - رحم اور ہمدردی اسکے لئے بے معنی الفاظ ہیں - اس کے نزدیک فطرت ان الفاظ سے مبرا ہے - اور مندرجۂ بالا مقصود کی طرف بغیر دائیں بائیں دیکھے جاری ہے +

اس طرح گویا اس نے تمام دنیا کی انفرادیت کی تعلیم دی جس میں زندگی کی محبت مقصد حیات گنا جاتا ہے - اسی وجہ سے وہ اشتراکیت اور فضولیت - مساوات سیاسی اور حکومت عوام کالانعام کے سخت خلاف ہے +

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جرمنوں کی موجودہ ذہنیت کے لئے بہت حد تک وہی ذمہ دار ہے - اور گذشتہ جنگ عظیم کی تہ میں اسی کی تعلیم تھی

کیا ہے۔ لہٰذا اس اس کا اپنا بن گیا ہے۔

نیٹشے کی طرح اقبال بھی حریتِ فکر و فعل کا حامی ہے۔ اس نے نوجوانوں کو مقابلہ کرنے کی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی حیات افروز مثنویوں کا حیرت انگیز اثر ہوا ہے۔ وہ شاندار مستقبل کا پتہ دیتا ہے:

"میں اس طرح مرد و عورت کو چاہتا ہوں۔ ایک جنگ کے قابل اور دوسری امومت کے لائق" نسائیت اقبال کے نزدیک امومت کے ہم معنی ہے۱ "اے لوگو! ڈرو اپنے خدا سے جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا۔ اور تمہارے جوڑے پیدا کئے۔ اور پھر ان دونوں سے کئی مرد اور عورتیں پیدا کیں۲" اور نسائیت کے لئے اسوۂ کاملہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ وہ دخترِ رسولؐ ہیں۔ بتولِ علیؓ اور امِ حسینؓ شہید کربلا ہیں۔ جب شاعر کی آنکھ عورت پر پڑتی ہے تو وہ اس سے پرے خاتونِ جنت کو دیکھتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کی آنکھیں دن رات اپنی اولاد کو دیکھتی ہیں اور اسلامی دنیا پر بارش ضیا و نور کر رہی ہیں۳

۱ـ یا ایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة و خلق منها زوجها و بث منهما رجالا کثیرا و نساء (نساء آیت ۱)

۲ـ نغمہ خیز از زخمۂ زن ساز مرد — از نیاز او دوبالا ناز مرد
پوشش عریانی مرداں زن است — حسن دلجو عشق را پیراہن است
آنکہ ناز بر وجودش کائنات — ذکر او فرمود با طیب و صلوٰۃ
نیک اگر بینی امومت رحمت است — زانکہ او را با نبوت نسبت است
از امومت پختہ تر تعمیر ما — در خطِ سیمای او تقدیر ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے — حرفِ امت نکتہ ہا دارد بسے
ملت از تکریم ارحام است و بس — ورنہ کار زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتار حیات — از امومت کشف اسرار حیات
از امومت پیچ و تاب جوی ما — موج و گرداب و حباب جوی ما

۳ـ سیرت فرزندہا از امہات — جوہر صدق و صفا از امہات
مزرع تسلیم را حاصل بتولؓ — مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت — با یہودے چادر خود را فروخت
نوری و ہم آتشی فرمانبرش — گم رضایش در رضائے شوہرش
آں ادب پروردۂ صبر و رضا — آسیا گرداں و لب قرآں سرا
گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز — گوہر افشاندے بداماں نماز
اشکِ او برچید جبریل از زمیں — ہمچو شبنم ریخت بر عرش بریں
رشتۂ آئین حق زنجیر پاست — پاس فرمانِ جنابِ مصطفیٰؐ است
ورنہ گرد تربتش گردیدمے — سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمے
اسی سلسلہ میں "خطاب بہ مخدراتِ اسلام" بھی زیر نظر رہے۔
(رموز بیخودی [illegible])

عفت و عصمت استوار ہے۔ وہ بنیادی پتھر ہے جس پر مذہب اور سیاست کی دیواریں قائم ہیں۔ آجکل کی نام نہاد آزاد عورت جو ایک محدود خاندان میں یقین رکھتی ہے۔ سلطنت کے زوال اور مذہب کے ادبار کی نشانی ہے۔[1] اقبال نے ایک نہایت اہم سوال کو چھیڑا۔ مگر اس نے اس بحث کو طول دینے سے احتراز کیا۔ اور اس کے جملہ پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ بہت پر لطف ہوا اگر وہ نسائیات کے بعض مسائل کی توضیح کر دیں۔ مثلاً مرد اور عورت کے لئے غیر مساوی شرائط طلاق۔ یا پھر فقہائے قدیم کے اصولوں کی کوئی نئی تاویل و توجیہ پیش کریں ۔

اقبال بعض معاملات میں روسو[2] کی مانند ہے وہ چاہتا ہے کہ پھر سے عہد نبوی کے شاندار شب و روز آجائیں۔ اس کے تمام خیالات اسی ایک خواب کی تعبیر ہیں۔ روسو فطرت کی طرف جانا چاہتا ہے۔ اقبال دشت حجاز پر مٹا ہوا ہے۔ اس کا دل دکھتا ہے جب وہ دیکھتا ہے۔ کہ مسلمان تہذیب حاضرہ کے تصنع اور چمک دمک سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں جس میں سطحیت اور تعیش کے سوا کچھ نہیں۔ اسلامی روایات عربی ہیں اس لئے انہیں اپنے شریفانہ جذبات اور قدرتی فطانت کو برقرار رکھنا چاہئے۔ یورپ کی نقل کسی طرح سود مند

---

[1] آں تہی آغوش نازک پیکرے خانہ پرورِ نگاہش محشرے
فکر او از تاب مغرب روشن است ظاہرش زن باطن او نازن است
بند ہائے ملت بیضا گسیخت تا ز چشمش عشوہ ہا حل کرد و ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا و آزاد کیش از حیا نا آشنا آزادیش
علم او بار امومت بر نتافت بر سر شامش یکے اختر نتافت
ایں گل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ
(رموز صفحہ ۱۷۰)

[2] روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸) ایک عجیب انقلابی دل و دماغ کا مالک تھا۔ فرانس میں جب حکومت نے اسکو جلا وطن کیا تو انگلستان پہنچا۔ یہاں بھی ہوا اس نہ آئی۔ تو واپس فرانس آیا۔ اور عمر تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ وہ موجودہ تہذیب و تمدن کے سخت مخالفین میں سے تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کی ابتدائی فطرتی حالت بہترین تھی۔ اس میں عجیب طور پر سرگرم جذبہ محبت و رافت کے ساتھ تمام قائم شدہ اصول و قواعد کے خلاف سخت مخالفانہ و جارحانہ خیالات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کے لئے وہ بھی بہت حد تک ذمہ دار گردانا گیا ہے ۔

نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ایرانی اسلاف و اطوار سے ماضی میں کچھ فائدہ نہیں پہنچا یا۔ غیر ملکی خیالات کا مبالغہ آمیز اور غلامانہ تتبع ہر ایک قوم کے لئے مہلک ثابت ہوا ہے[1]۔

لیکن اسلامی سوسائٹی ان پرانی روایات پر پھر سے کیسے قائم کی جا سکتی ہیں؟ تاریخ قوم کے لئے وہی کام دیتی ہے جو حافظہ فرد کے لئے۔ مسلمانوں کی تمام حیات ماضی اُن کے تمام محسوسات و مزعومات عزائم اور کامیابیاں۔ اس دن سے جب ان میں قومی مذہبی زندگی کا احساس پیدا ہوا۔ اوراقِ تاریخ میں غیر فانی طور پر محفوظ ہیں۔ اور تاریخ کو اپنے آپ کو دہرانا چاہئے[2]۔ زندگی کو سادہ بناؤ۔ اس میں جھوٹے تصنع۔ فرقہ وارانہ

سلہ اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن | بر عیار زندگی او را بزن
فکر روشن بیں عمل را رہبر است | چوں درخش برق پیش از تندر است
فکر صالح در ادب می بایدت | رجعتے سوئے عرب می بایدت
دل بسلمائے عرب باید سپرد | تا دمد صبح حجاز از شام کرد
از چمن زار عجم گل چیدۂ | نو بہار ہند و ایراں دیدۂ
اندکے از گرمی صحرا بخور | بادۂ دیرینہ از خرما بخور
سر یکے اندر بر گرمش بدہ | تن دمے با صرصر گرمش بدہ

(اسرار صفحہ ۴۲)

مگر رموز میں اس سے اور بھی صاف اور واضح الفاظ میں فرماتے ہیں۔

اشعار مصطفیٰ از دست رفت | قوم را رمز بقا از دست رفت
آں نہال سربلند و استوار | مسلم صحرائی اشتر سوار
آنکہ کشت شیر را چوں گوسفند | گشت از پامال مورے دردمند
آنکہ عزمش کوہ را کاہے شمرد | با توکل دست و پائے خود سپرد
گوسفندش با قناعت ساز کرد | تا بکشکول گدائی ناز کرد
شیخ او مست تا گردوں خراب | کاسب نور از ضمیر آفتاب
گل کہ می پوشد مزار پاک او | لالہ گویاں دمد از خاک او
با مریدے گفت اے جان پدر | از خیالات عجم باید حذر
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت | از حد دین نبی بیروں گذشت
اے برادر ایں نصیحت گوش کن | پند آں آقائے ملت گوش کن

قلب را زیں حرف حق گرداں قوی
با عرب درساز تا مسلم شوی

(رموز صفحہ ۱۴۸-۱۴۹)

سلہ چیست تاریخ اے ز خود بیگانۂ | داستانے قصۂ افسانۂ؟
ایں ترا از خویشتن آگہ کند | آشنائے کار و مرد رہ کند
روح را سرمایۂ تاب است ایں | جسم ملت را چو اعصاب است ایں
ہمچو خنجر بر فسانت می زند | باز بر روئے جہانت می زند

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

خیانت اور غیر مخلصانہ و خود غرضانہ تواضع و خوشامد کا کوئی نہ ہو۔ اخلاقی، دماغی اور سیاسی بزدلی جو آج اسلام کی انفرادی حیثیت کی جڑیں کاٹ رہی ہے۔ اسے دور کیا جائے +

اس کے معنی جمعیت نہیں، جمہوری نہیں، مصلح کا کام ماضی کے شاندار عہد کی جانب رہنمائی کرنا ہے۔ اس سے مراد سادہ اخلاق، سادہ زندگی یا پاک مردانہ فکر اور عرب کی شجاعانہ جانبازی کے ذریعہ مسلمانوں میں مذہبی عصبیت پیدا کر کے ان کے دلوں کو گرمانا ہے۔ اقبال کا مقصد یہ ہے کہ ہر طرح کی بزدلی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکو!

جب مثنویوں کا تمام کلام ہر جگہ سمجھ میں آجائے گا۔ تو تمام اسلامی دنیا میں وہ لہر چلے گی جس کا نتیجہ نہایت شاندار ہے۔ اقبال ایک پیغمبر ہے۔ وہ اسلام کے شاندار اور بے نظیر زرین ماضی اور مستقبل میں اس کی معاودت کا نظارہ کرتا ہے۔ مگر یہ مستقبل ایسا ہے۔ جیسے اس کے ہر طرف دھند چھائی ہے۔ اگرچہ دھند گہری نہیں ہے۔

بعض دفعہ اس ملک میں یہ سوال پوچھا جاتا ہے۔ کہ آخر مثنویوں کو اردو کی بجائے فارسی میں لکھنے سے کیا فائدہ مترتب ہوتا؟ اقبال ان لوگوں میں سے ہے جو سمجھتا ہے ایک پیغام اور ایک مقصد لیکر منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ اس کا پیغام تمام اسلامی دنیا کے لئے ہے۔ اس کی مثنویاں بچوں کے مدارس میں سعدی کی گلستان اور دہلی، کابل، طہران، قازان، قاہرہ، استنبول، مدینہ اور مکہ کی جامع مسجدوں کے منبروں پر مثنوی مولانا روم کی جگہ استعمال کرنے کے لئے ہیں +

مثنویاں بحر رمل مسدس مقصور میں لکھی گئی ہیں۔ بحر رمل میں یہ تبدیلی غزل اور مثنوی میں متداول ہے۔ مثنوی معنوی بھی اسی بحر میں لکھی ہوئی ہے۔ پہلی مثنوی (اسرار خودی) زیادہ حقیقی ہے۔ دوسری (رموز بیخودی) زیادہ تخیلی ہے۔ رموز میں اگر تھوڑی سی حکایتیں اور ہو جاتیں۔ تو دماغ پر اس کی بھی وہی حقیقی گرفت ہوتی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹

شمع او بخت امم را کوکب است — روشن از وے امشب و هم دیشب است
چشم پرکارے، کہ بیند رفتہ را — پیش تو باز آفریند رفتہ را
ضبط کن تاریخ را پایندہ شو — از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
سرزند از ماضی تو حالِ تو — خیزد از حالِ تو استقبالِ تو
موج ادراک تسلسل زندگی است — مے کشاں را شور قلقل زندگی است

(رموز صفحہ ۱۰۲-۱۰۳)

جو اسے یارکی ہے۔ یہ کمی رموز کے نصف آخر میں خصوصاً بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ کوئی ایسا نقص نہیں جو مصنف دور نہیں کر سکتا۔

اقبال نے فارسی ادبیات کی جھوٹے اور مصنوعی ادب القدماء سے اصلی ادب القدماء کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ صائب وغیرہ کے شعراء محض زبان کی ایک غیر شعوری اور مدھم سی گونج رہ گئے تھے۔ اقبال کا پھر سے اساتذہ قدیم کی روش اختیار کرنا اس وجہ سے ہے کہ بیدل اور اس کے متبعین کی شاعری کے خلاف ہے جو رنگین پردوں میں لپٹی ہوئی ہے جس میں کوشش تو ہے۔ مگر قوت عمل نہیں۔ اس کا طرز تحریر سادہ اور مردانہ ہے لیکن الفاظ ایسے ہیں جیسے کسی مرصع تلوار کے دستے میں موتی جڑے ہوں۔ لیکن باوجود اپنے اس عظیم الشان ہیئت کی تقلید کے اقبال یقیناً بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ نیا بیدار مشرق کی روح ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اور اقبال کی شاعری نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس نے ایرانی شاعری کی واماندہ رگوں میں خون تازہ دوڑا دیا ہے۔ اور حسن صوری کے ساتھ قوت معنوی کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔ مثنویوں کی زبان بہت پُرشوکت ہے لیکن اس مردانگی کے باوجود اس میں لوچ اور لچک ہے۔ آج جبکہ فارسی زبان خود اپنے وطن میں اس قدر بدنما ہو گئی ہے۔ اقبال اس کے شباب کی یاد دلاتا ہے۔ فارسی ادب ایک خطرناک دور سے گزر رہا ہے۔ ایک طرف جب خود ایران میں ادبی انحطاط نمایاں ہے۔ دوسری طرف ایک موسیٰ نے اپنے عصا سے چٹان کو ضرب لگائی ہے۔ اور ایک نیا کوثر پھوٹ بہا ہے۔ جو بنی اسرائیل کے بارہ چشموں سے کسی طرح کم نہیں[1]۔

مالک رام ایم۔ اے

---

[1] وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ
(البقرہ ۶۰)

اقبال اور سیاسیاتِ عالیہ

(از جناب سید زبیر صاحب ایم۔ اے ہزاروی)

لٹریچر میں شاعری کا درجہ

ارباب علم نے لٹریچر کو مختلف انواع میں تقسیم کیا ہے۔ آرنلڈ بینیٹ کے نزدیک لٹریچر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ نوع ہے جو ہم میں انسانی جذبات پیدا کرتا ہے۔ اور دوسری نوع وہ ہے جو ہمیں نئی نئی معلومات بخشتا ہے۔ ایمرسن نے بھی تقریباً اسی انداز میں لٹریچر کی دو قسمیں بتلائی ہیں۔ قوت اور حرکت پیدا کرنے والا لٹریچر اور علم پیدا کرنے والا لٹریچر۔ گیبریل ویلز نے ان میں تفریحی لٹریچر کا بھی اضافہ کیا ہے +

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ "معلومات" کے اضافہ کرنے والے لٹریچر میں تاریخ معاشیات، سائنس وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے۔ روح کو تازہ کرنے والے علوم میں مذہب، اخلاق اور فلسفہ شامل ہیں۔ شاعری ڈراما۔ رومان وغیرہ تفریحی لٹریچر کی انواع و اقسام میں سمجھے جاتے ہیں +

شاعری کی ضرورت

شاعری کے ساتھ یہ سلوک صرف گیبریل ویلز ہی نے نہیں روا رکھا بلکہ اس سے پہلے بھی شاعری کو ایک غیر منفعت بخش اور تفریحی شعبۂ انسانی سمجھتے ہوئے افلاطون انہیں اپنی ری پبلک میں جگہ دینے سے انکار کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود شعرا نے بھی افلاطون کے اس فیصلہ کی مختلف طریقوں سے تائید کی ہے۔ میکالے نے لکھا ہے۔ "غالباً کوئی شخص شاعر نہیں بن سکتا۔ یا شعر کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ تاوقتیکہ اس میں تھوڑا سا خلل دماغ موجود نہ ہو" سب سے بڑا اعتراض جو شاعری کے خلاف پیش کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ ایک بیکار جنون ہے جس سے ملک و قوم کو کوئی فائدہ

نہیں پہنچا۔ خود مولانا حالی نے اسی بناء پر شاعروں کی مذمت کی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ مولانا حالی جس زمانے میں گذر رہے ہیں۔ اس میں شاعری صرف الفاظ کی الجھنوں۔ قافیہ و ردیف کی بحثوں اور گل و بلبل کے قصوں سے لبریز تھی۔ اور فطرت انسانی کی عمیق گہرائیوں اور حقائق عالیہ کی وسیع نکتہ آفرینیوں سے بالکل خالی تھی۔ دلی اور لکھنؤ کی گلیوں میں بجز شعر و شاعری نوجوانوں کا کوئی مشغلہ ہی نہ تھا۔ حالانکہ قوم ایک انحطاط کے دور میں سے گذر رہی تھی۔ اور ظاہر ہے۔ کہ ایسے وقت میں شعر و شاعری کی بجائے زیادہ اور علمی علوم کی ضرورت تھی انہیں ان واقعات کی بناء پر نہ تو تمام شعرا کے خلاف ایک قلمی جہاد کی ضرورت ہے۔ اور یہ کہنے کی کہ شاعری کا دنیا میں کوئی فائدہ ہی نہیں۔ سر جان لبوک نے کیا خوب لکھا ہے۔ کہ "رفاہ عام کے نقطۂ نظر سے یہ کہا جاتا ہے۔ کہ سوسائٹی میں اکثر کے فائدہ عام پر نظر ہونی چاہئیے۔ تو اسی اصول کے ماتحت شاعری کو بھی شمار کرنا چاہئیے۔ جو انسانوں کے کثیر حصے کے لئے غموں کی گھڑیوں میں تفریح کا سبب بنتی ہے۔ اور ان میں نئی زندگی اور نئی قوت پیدا کرتی ہے۔ سر فلپ سڈنی نے ایک دفعہ افلاطون کے غیر منصفانہ فیصلہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

"اگر تم شاعروں کے وجود کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ تو میں تمہیں اس حالت کے متعلق تمام شاعروں کی جانب سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ جب کہ تم کسی کی لغت میں گرفتار ہو۔ لیکن ایک شعر بھی نہ لکھ سکو۔ اور جب تم اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ۔ تو تمہاری یاد بھی تمہارے ساتھ رخصت ہو جائے۔ کیونکہ تمہاری قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہوگا"؛

ہمارا شاعر | ہم جس زمانے میں گذر رہے ہیں۔ اس میں بیسیوں شاعر موجود ہیں۔ جن میں ایک شخص "اقبال" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس کے اشعار ہر خاص و عام کی زبان پر موجود ہیں۔ اگرچہ قوم مردہ ہو چکی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی ترنم ریزیاں صدائے قم بن کر بعض بے جانوں میں حرکت پیدا کر رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ اقبال شاعر ہے۔ کوئی کہتا ہے اقبال حکیم فلسفی ہے

کوئی کہتا ہے اقبال سیاست و مذہبیات کا علمبردار ہے۔ اس کے خلاف ایک ایسا طبقہ بھی ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ اقبال نہ شاعر ہے نہ فلسفی ہے نہ سیاست کا مرد میدان ہے۔ بلکہ بعض جانباز تو یہاں تک کہہ اٹھتے ہیں۔ کہ وہ تو مسلمان بھی نہیں ہے۔ میں ان سب کے جواب میں صرف ایک بات کہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ اقبال نہ شاعر ہے نہ فلسفی ہے۔ نہ سیاست داں۔ نہ ماہر ما بعد الطبیعات بلکہ وہ ایک "مرد خود آگاہ" ہے۔ جسے عوام کی زبان میں مسلمان کہا جاتا ہے۔ شاعر اس لئے نہیں کہ اس کے کلام میں مروجہ شاعری کے بہت کم عناصر پائے جاتے ہیں۔ فلسفی اس لئے نہیں کہ وہ شک گمان کا دشمن ہے۔ بلکہ ایمان و ایقان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ سیاست داں اس لئے نہیں کہ وہ سیاسیات کے اولین میدان میں ہی ناکام رہ چکا ہے۔ برخلاف اس کے وہ ایک مسلمان ہے۔ جس کی شاعری جس کا فلسفہ جس کی سیاست سب اسلام کے گرد جمع ہو جاتی ہیں۔ اور جس کا منتہا و مقصود صرف یہ ہے کہ دنیا میں فطرت کا مسلک عام ہو جائے۔ اور لوگ وقت ضائع کرنے سے پہلے تھوڑے ہی وقت میں اس نکتے کو پالیں۔ کہ دنیا میں اسلام ہی "فطرت کا مسلک" ہے۔ اور اس میں جو رجحانات اور امیال پنہاں رکھے گئے ہیں۔ ان ہی میں دنیا کی نجات ہے۔ اور بدیر و بزود زمانہ ان کی طرف چلے گا جب اقبال کا متن دنیا میں یہ ہو۔ تو کیا ہم اقبال کو حالی کے ہم شعراء میں شمار کر سکتے ہیں؟

اقبال اور سیاسیات

آج کے اس شذرے میں ہم اقبال کو اس کے سیاسی افکار کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کہ سیاسیات عالیہ کے بعض اہم مباحث کے متعلق اقبال کی کیا رائے ہے؟

اقبال کو سیاست کے میدان میں لانے سے بعض لوگوں کو ضرور رنج ہوگا۔ اور وہ فی الفور یہ کہہ اٹھیں گے۔ کہ اقبال کے قول و عمل میں بہت تفاوت ہے۔ جیسا کہ بمبئی کرانیکل کے نمائندے نے بھی حضرت علامہ سے ایک انٹرویو میں کہدیا تھا۔ لیکن تمام معترضین کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ پہلے تو جناب ممتاز حسن صاحب کے قول کے مطابق۔ قوموں کو عمل پر ابھارنے والا قول بھی تو حسن عمل سے کم نہیں

اقبال اور گوئٹے

اس کے علاوہ اگر ہم دنیا کے بعض عظیم الشان مصلحین کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں۔ تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ ان میں سے اکثر ہنگاموں سے پرے حیات سے دور رہنے کے باوجود اپنی اپنی جماعتوں میں زندگی پیدا کرنے کا بہت بڑا سبب بنے رہتے ہیں۔ والٹیر، روسو، گوئٹے یورپ کے مجتہدین فکر میں سے شمار ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات نے فرانس اور جرمنی میں انقلابات عظیم پیدا کئے۔ لیکن یہ کام زیادہ تر انہوں نے اپنی تحریروں سے لیا۔ جہاں تک وطنیت کا تعلق ہے۔ گوئٹے وطن پرستی کا مخالف تھا۔ اور امن و امان میں رہنے کی عادت کو پسند کرتا تھا۔ اس کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے۔ –

"وہ امن کا فرزند تھا۔ اور اپنی زندگی کے کسی حصے میں بھی وہ ہنگاموں میں آنے کو پسند نہ کرتا تھا۔ وہ ریفارمیشن کو بہت برا سمجھتا تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعے ارتقا کا پرامن عمل رک گیا۔ گوئٹے ہنگامی واقعات سے بہت کم متاثر ہوتا تھا۔ اور بیرونی زندگی کے حوادث سے چنداں سروکار نہ رکھتا تھا۔ اس کا فکر رسا عالی الدماغ۔ حیات کی اندرونی گہرائیوں تک جانے کا شیدا تھا۔ . . . اس کے خلاف یہ اعتراض پیش کرنا کہ وہ سیاست کے ہنگامی واقعات میں حصہ کیوں نہ لیتا تھا۔ اس بات کے مرادف ہے کہ ہم وزیر اعظم کو یونانی آرٹ اور علوم میں دلچسپی نہ لینے کے لئے مطعون کریں۔ یہ کہا گیا ہے کہ گوئٹے سیاسیات سے الگ ہو کر آرٹ اور سائنس کے میدان میں پناہ گزین اس لئے ہوا۔ کہ اس میں دوسروں کے معاملات میں حصہ لینے کی بجائے خود غرضی کا مادہ بہت تھا لیکن یہ اعتراض بیہودہ اور بے معنی سا ہے۔ کیونکہ خود دنیا کی سیاسیات بھی ایک خود غرضی کا ہی کھیل ہے . . . ."

اقبال نے ہمیشہ اپنے آپ کو گوئٹے کا ہم نوا اور ہم مشرب قرار دیا ہے۔ جہاں تک ہنگامی حوادث میں شامل ہونے کا تعلق ہے۔ یہ دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ اقبال نے ایک مصلح اور مبلغ ہونے کی حیثیت سے دنیا کی سیاسیات کی خامیوں کی اصلاح کرنے اور انہیں فطرت اللہ کی سیاست کی طرف متوجہ کرنے کی جانب مائل کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ اقبال کی شاعری کو ہم سیاسیات سے بالکل الگ نہیں

کو سکتے۔ بس طرح کہ زمانے کو فلارنس کی سیاسیات سے جدا رکھنا محال ہے +

اقبال کا پیش رو

اقبال اسلام کا فرزند ہے جس زمانے میں وہ پیدا ہوا۔ اس میں اسلام کی سیاسی قوت کامل طور پر رو بہ انحطاط ہو چکی تھی مسلمانوں کے قلوب نت نئے صدموں سے پاش پاش ہو رہے تھے۔ وطنی اور غیر وطنی دشمنوں کی یورشیں ان کے حوصلوں کو پست کر چکی تھیں۔ اور کوئی نہ تھا۔ جو ان کی رگوں میں پھر زندگی کے خون کو ہیجت دے۔ غالب مرحوم کی آنکھوں کے سامنے دلی برباد ہو گئی۔ لیکن حالات کا اقتضا تھا۔ کہ اُنہوں نے صرف ع

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

پر اکتفا کیا۔ حالی نے مسلمانوں کے ذہنی امراض کی طرف توجہ کی۔ مولانا شبلی اگرچہ قافلہ سالار تھے۔ اور اُن کے نغموں نے پہلے پہل جمود و سکون کی خاموشی میں جنبش پیدا کی۔ لیکن ان کا میدان "تاریخ" تھا قدرت کو یہی منظور تھا۔ کہ یہ کام سیالکوٹ کے جواں عمر اور روشن دل فلسفی کے ہاتھ سے ہو چنانچہ یہی ہوا۔ اور آج کون ہے۔ جو یہ کہہ سکتا ہو۔ کہ ہندوستان کی سیاسی جد و جہد کے بڑے بڑے علمبردار اقبال سے متاثر نہیں ہوئے؟

اقبال بطور ایک سیاسی مفکر کے

سیاسی مفکر کی حیثیت سے "اقبال" کے خلاف ایک زبردست اعتراض یہ بھی ہے۔ کہ وہ ہمیشہ اپنا مسلک تبدیل کرتا ہے۔ اور ہر عشرہ کے بعد اس کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے کبھی تو وہ کہتا ہے:-

آ جاڑا ہے تمیز ملت و آئین نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کبھی وہ چاہتا ہے۔ کہ دیر و حرم کی قیود سے آزاد ہو کر ایک نیا شوالہ تعمیر کرے۔ خود اس میں پجاری بن کر بیٹھے اور دوسروں کو بھی اس نوساختہ صنم کدے میں آنے کی دعوت دے۔ لیکن کبھی یہ عالم ہے کہ وطنیت کو لعنت قرار دیتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے :-

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

پھر سرمایہ و محنت کی جنگ چھڑتی ہے۔ تو مزدور کی حمایت میں آواز بلند کرتا ہے۔ اور اسے سرمایہ دار حیلہ گر کی عیاریوں سے متنبہ کرتا ہے ؂

ارتقا کی کارفرمائیاں

حقیقت یہ ہے کہ اقبال زندگی کے احساس میں ارتقا کے قانون کا تابع رہا ہے۔ پیغمبر اور شاعر میں یہی فرق ہے کہ پیغمبر فطرت کے اسرار سے قبل از وقت خبردار کر دیا جاتا ہے۔ لیکن شاعر واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے نتائج و استنباط کے لئے ایک موجود فی الخارج ہستی کی ضرورت ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شاعر کا احساس عوام الناس سے تیز تر ہوتا ہے۔ اقبال یورپ جانے سے پہلے ہندوستان میں وطنیت کے غلغلوں سے بہت متاثر تھا۔ لیکن مغربی زندگی اور مغربی جمہوریت کے عیوب اس پر مشاہدہ کی بنا پر نمایاں ہوتے گئے۔ تفریح کی ظاہری دلبستگیاں لاکھ باصرہ فریب ہوں۔ لیکن حقیقت بیں نگاہیں پس پردہ جب نظر اٹھا کر دیکھتی ہیں تو انہیں "اندرون قہر خدای عزوجل" کا مصداق معلوم ہوتا ہے۔ نیشنلزم کی ظاہریت اپنے اندر بے شمار علمی دلائل خوبی پنہاں رکھتی ہے۔ لیکن دول یورپ کی ہوس کاریاں اور نیشنلزم سے متاثر اقوام کی تباہ کاریاں ایک حساس قلب کے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ اقبال نے جب نیشنلزم کے سرچشمۂ اولین کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اسے اس کا پانی گدلا، بدبودار اور ناصاف

نظر آیا۔ فی الفور اس کی نگاہیں ایک بلند ترین منتہا اور اعلیٰ ترین آئیڈیل کی جانب اٹھیں۔ اور وہ اسلام کا پرستار حقیقی بن گیا ♦

اقبال کی بت شکنی

اقبال کی ایک قابل الذکر خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ اپنے سیاسی افکار میں "بت شکن" واقع ہوا ہے۔ وہ مروجہ خیالات کے طلسم باطل کو توڑتا ہے۔ اور ان اوہام و خرافات کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔ جو انسانی اذہان کے مطلع کو مکدر کئے ہوئے ہیں۔ خواہ اس کام میں اسے بڑے بڑے متقدمین و متاخرین کے مقابلے میں کبھی کیوں نہ کھڑا ہونا پڑے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے۔ کہ اقبال تمام افکار و اعمال کو اسلام یا فطرۃ اللہ کے معیار اور نکتہ نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اس یقین و ایمان کے لئے کہ فطرۃ اللہ عین اسلام ہے فلسفیانہ اور حکیمانہ دلایل و براہین بھی اپنے پاس رکھتا ہے۔ عقل و عشق کی جنگ میں عشق کی گیرائی اور قوت تسخیر میں کامل یقین جہاد کی حقیقی غرض و غایت اور اس کی ضرورت حکومت کے مختلف طریقوں میں اسلامی طریق حکومت کا انتخاب نیشنلزم کے بجائے انٹرنیشنلزم کا عقیدہ اور اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں جن میں ہمیں اقبال یورپ کے بڑے بڑے فلسفیوں اور حکیموں کے سامنے صف آرا نظر آتا ہے۔ اقبال کا ذہن منفعل اور مرعوب نہیں کہ وہ میزنی۔ کارل مارکس۔ نیٹشے۔ روسو۔ برگسان اور ہیگل کے پر ہیبت ناموں سے مرعوب ہو جائے۔ وہ ان میں سے بعض کے ساتھ اتحاد کرتا ہے اور ان کو ساتھ لے کر مخالفین پر حملہ کر دیتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے۔ کہ اس کے پاس معیار صرف ایک ہے۔ اور وہ صرف "فطرۃ اللہ" ہے ♦

جمہوریت

فرد و ملت کے تعلقات۔ ملت کے ربط و ضبط کے آئین۔ قوموں کے انحطاط و اضمحلال کے اسباب بہت حد تک سیاسیات معاشی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن سے اس وقت بحث نہیں۔ میں صرف بعض سیاسی مباحث کو لیتا ہوں جن کے متعلق یورپ کے علما و فضلا میں زبردست نزاع موجود ہے۔ سب سے اہم مسئلہ طرز حکومت کا ہے۔ علمائے یورپ کا ایک

گروہ "جمہوریت" کو بہترین طرزِ حکومت قرار دیتا ہے۔ اور اس عقیدے کے لئے اس کے پاس دلائل موجود ہیں۔ اس کے خلاف دوسرا گروہ ہے۔ جو جمہوریت کو بھی استبداد کی ایک نئی شکل قرار دیتا ہے۔ اقبال اس دوسرے گروہ کے ساتھ متفق ہے:۔

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید
(پیام مشرق)

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو!

دنیا میں آج تک کوئی جمہوریت[1] حقیقی صورت میں قایم نہیں ہوئی۔ افلاطون نے جس ری پبلک کا خاکہ کھینچا ہے۔ اُسے صرف خیال و تمثیل کا درجہ حاصل ہے۔ اور جہاں عمل میں اس کے لئے کوئی مقام نہیں۔ دنیا میں آج تک مساوات، آئین اور برادری کی جتنی آوازیں اُٹھی ہیں۔ وہ کمزوروں کی آوازیں تھیں۔ جو غلبہ حاصل کرنے کے ساتھ ہی استبداد کی جانب مائل ہو گئیں۔ فرانس کا انقلاب بڑے بڑے خوش کن دعاوی اور دل پسند اصولوں کے اعلان کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا۔ کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ جمہوریت اور آئین پسندی فطرت انسانی کے سامنے دب گئی۔ خود اس زمانے میں اٹلی، ترکی، روس اور دوسرے ممالک میں اس فطری

(1) Human Nature in politics. P. 7.

حقیقت کا اعادہ ہوا۔

جمہوریت بہترین طریق حکومت نہیں۔ بلکہ اس کے ذریعے "نا قابل اداروں" کا رواج عام ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ خدا کی ساری مخلوق یکساں طور پر پبلک امور کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتی۔ پس اس کا اثر ان کے انتخاب پر پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ایسے لوگ انتخاب میں آ جاتے ہیں۔ جو قابل ہونے کی بجائے' ووٹروں کو خوش رکھ سکتے ہوں۔ اور یہ حکمرانی اور انتظام امور عامہ کے لئے کوئی خاص وصف نہیں۔ جمہوریت کے ماتحت جو تہذیب فروغ پذیر ہوتی ہے وہ اعلیٰ نہیں ہوتی۔ اور قوم میں غیر معمولی قابلیت کے لوگ نہیں پیدا کر سکتی۔ جمہوریت میں اپنی ترقی اور ذاتی علو و منفعت کا جذبہ بہت ترقی پذیر ہو جاتا ہے۔ اور سب سے زیادہ موثر خود علامہ اقبال کی دلیل ہے۔ کہ "از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید" [ا]

روسو اور جمہوریت

روسو کا قول ہے۔ کہ جمہوری طرز کی کامیابی کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تمام پبلک قابل اور تعلیم یافتہ بن جائے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں لکھتا ہے کہ "اگر دنیا میں دیوتاؤں کی قوم ہوتی۔ تو اس کے لئے جمہوری طرز حکومت بہت مناسب ہوتی۔ لیکن ہم انسانوں کے لئے ایسا "مکمل" نظام کچھ سازگار نہیں"۔ روسو کہتا ہے۔ کہ دنیا میں نہ کوئی جمہوریت قایم ہوئی ہے۔ نہ اب ہو سکیگی۔ یہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ کہ اکثریت حکمرانی کرے اور اقلیت محکوم رہے"۔ دنیا میں کوئی طرز حکومت' خانہ جنگیوں۔ سازشوں اور فرقہ بندیوں کا اتنا ہنگامہ کرنہیں ہوتی جتنا کہ جمہوریت میں اس کے امکان موجود ہیں۔ اقبال کا عقیدہ ہے۔ کہ انسان کو محکوم رہنے کی عادت ہے۔ اور انسانی جماعتیں اپنے لئے خود نئے نئے بت تراش لیتی ہیں۔ موسولینی اور قیصر ولیم کے مکالمے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

نماند ناز شیریں بے خریدار اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

ا۔ C.D. Burns, Democracy, 25-31 ؛ Rousseau, Social Contract

ری پبلک کی صحیح بنیاد رہتی ہے کہتا ہے۔ ری پبلک کی صحیح بنیاد نیکی ہے۔ اقبال اس مقالے میں روسو کی تائید کرتے ہیں۔ کیونکہ یہی فطرۃ اللہ کا منشا ہے۔ آجکل یورپ کی سیاست اور تمدن جن غیر اخلاقی قوانین پر مبنی ہیں۔ علامہ اقبال ان کے سخت مخالف ہیں۔ دنیا کو ان سے روگردانی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور اسلام یا فطرۃ اللہ کی تعلیم کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ محبت خدمت خلق۔ ایمان محکم۔ یقین کامل کی فتوحات و برکات کا سبق پڑھاتے ہیں:۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی — اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا — بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں — کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری — یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

آج یورپ کو جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ یہی ہیں۔ اور جب تک یورپ کا دماغ ان چیزوں کی ضرورت کا قائل ہو کر اپنی زندگی کو ان کے مطابق نہ ڈھالے گا۔ تباہی اور بربادی کے قریب ہوتا جائے گا۔[1]

نیشنلزم اور بین الاقوامیت اقبال اپنے خیالات میں سب سے زیادہ جس عقیدے میں محکم ہے وہ اس کا عقیدۂ بین الملیت ہے۔ جو موجودہ بین الاقوامی رجحانات سے صدیوں پہلے اسلام نے قوموں کے اندر پیدا کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اقبال

1) conventional lies of our civilization. Decline of the West - Spengler. consequences of the War - Ramsay Muir

کے مذہب میں نیشنلزم سے بڑھ کر کوئی گناہ ہی نہیں۔ اس کے خیال میں قومیت اور وطنیت اسلام کی عالمگیر بین الملی اخوت کی روح کے سخت منافی ہے۔ اس دور میں اقبال نے اپنی نظموں کے علاوہ نثر میں بھی اسی بین الملی قومیت پر بہت زور دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ قومیت کے حلقوں میں غیر مقبول ہو گیا ہے۔ اور برادران وطن کے بعض گروہ تو اسے ہندوستان کے دشمنوں میں شمار کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ برادران وطن اور دوسرے غیر مسلم لوگ مسلمانوں کی اس بین الملی ہمدردی کو کوئی نئی سیاسی تحریک خیال کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو یورپ اور ہندوستان میں پان اسلام کہتا ہے۔ وہ دراصل "اسلام" ہی ہے۔ رینان کے قول کے مطابق اسلام۔ لعنت۔ وطنیت عصبیت نسل اور رنگ کی قیود سے انسان کو آزاد کر دیتا ہے۔ جیسا کہ پروفیسر ہرگرونجے نے بھی اسلام اور مسئلہ نسل پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے یہی لکھا ہے۔

آج یورپ نسل کے قبیلوں رنگ کے خطروں اور قوموں کے فتنوں سے مخلصی پانے کے طریقے سوچ رہا ہے لیکن آج سے چودہ سو سال پہلے فطرۃ اللہ نے اس کا حل ایک نبی اُمی کی زبانی دنیا کو بتا دیا تھا۔

یہی حال بین الاقوامی سپرٹ کی تخلیق و تولید کا ہے۔ پروفیسر ریمزے میور اور دوسرے ارباب قلم اس بین الاقوامی سپرٹ کو انیسویں صدی کی پیداوار کہتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ باوجود آزاد خیال اور روشن دماغ ہونے کے ان لوگوں کی نگاہیں یورپ کی دیواروں سے باہر نہیں گزر سکتیں۔ حالانکہ صدیوں پہلے اسلام نے بھی بین الاقوامی روح پیدا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ قومیت کی بنیاد وطن، رنگ اور نسل کے بجائے مذہب پر رکھی تھی۔ جو وطن کی بہ نسبت زیادہ وسیع تر تصور ہے۔

اقبال نے جب یورپ کا سفر اختیار کیا تو اسے معلوم ہوا کہ نیشنلزم نے انسانوں کو جنہیں خدا نے ایک بنایا تھا قوموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور یہ چیز دنیا کے صحیح ارتقا اور سائنس کی اعلیٰ تہذیب کے سخت خلاف ہے۔ نیز اس نے

محسوس نہیں کیا کہ اسلام نے جس طرح وطن کے تنگ اور محدود حلقوں سے نکل کر مختلف مذہبی حلقوں میں اتحاد پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ یقیناً اس سے افضل ہے۔ یہ خیالات اسقدر ترقی پذیر ہو گئے کہ وہ "نیشنلزم" کا سخت مخالف بن گیا۔ اور اس کے بعد اپنی نظموں اور تحریروں میں صرف ایک چیز کی دعوت دیتا رہا۔ یہ یاد رہے۔ کہ اقبال کے اس پیغام میں رنگ نسل کی تمیز اور وطنیت کے خلاف جہاد کے ساتھ ساتھ "انسان کامل" (یعنی مسلمان) کی ہمہ دانی کی بلندی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کا آئندہ مذہب اسلام ہی ہوگا اور قوموں کا بین الاقوامی رجحان اسلام ہی کے اتباع میں ہے۔ جسے اب قوموں نے اندرونی ضرورتوں کی بناء پر اپنے اندر پیدا کر لیا ہے۔ لیکن اسلام عرصہ ہائے بعید سے اس کا حامل تھا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر　　خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار　　قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں؟　　اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا　　ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی　　اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

تو اے کودک منش خود را ادب کن　　مسلمان زادۂ ترکِ نسب کن
برنگِ احمر و خون و رگ و پوست　　عرب نازد اگر ترکِ عرب کن

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است　　ز خاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

اس وقت دنیا میں چار سیاسی مذاہب ایسے ہیں جن کی جانب لوگوں کی اکثر توجہ مبذول ہوتی ہے۔ یعنی نیشنلزم، انٹرنیشنلزم، کاسمو پالٹزم اور سوشلزم۔ ان میں سے ہر گروہ کے موید اور مخالف موجود ہیں۔ اقبال ان جماعتوں میں سے کسی کا پورے طور پر موید نہیں۔ اس لئے کہ ان سب کے نزدیک تمدن اور سیاست کی بنیاد مذہب نہیں۔ البتہ وسعت تصور و ہمہ گیری کے لحاظ سے اُسے انٹرنیشنلزم اور سوشلزم سے ضرور دلچسپی ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک ان دونوں چیزوں سے اسلام کو کوئی زیادہ نقصان نہیں۔ البتہ نیشنلزم اور کاسمو پالٹزم کا شدید ترین دشمن ہے ٭

نیشنلزم کے خلاف دلائل

خود یورپ میں ایک کثیر گروہ موجود ہے۔ جو نیشنلزم کا مخالف ہے چنانچہ انہی میں سے ایک فاضل کا مقولہ ہے۔ کہ "قدرت کے قوانین عالمگیر ہیں۔ نہ کہ نیشنل"۔ اس سے سمجھ لینا چاہئے۔ کہ نیشنلزم مقتضائے فطرت کے خلاف ہے۔ ایک اور مصنف نے کہا ہے۔ کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا لیکن شیطان نے اسے قوموں میں تقسیم کر دیا" نیشنلزم عالمگیر یکسانی اور وحدت کے لئے ایک زبردست خطرہ ہے۔ یہ کلچرل اور سیاسی زاویۂ نظر کو محدود کرتی ہے۔ قوموں اور جماعتوں میں رقابت پیدا کرتی ہے جماعتی تعصب کو زیادہ کرتی ہے۔ اور خود غرضی کے جذبات کو ترقی دیتی ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اپنے وطن کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ دوسرے ممالک کے خلاف نفرت بھی اس کے ساتھ لازم ہے[1] ٭

---

[1] Nationality - Bernard Joseph

یورپ کا انٹرنیشنلزم

یورپ میں جو بین الاقوامیت پیدا ہو رہی ہے۔ اقبال اس کے متعلق حسن ظن نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد بھی ایمان و مذہب پر نہیں بلکہ خود غرضی اور مادیت پر ہے۔ جو نظام روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر نہ ہوگا۔ اقبال کے نزدیک وہ کمل نہیں۔ لیگ اقوام کے متعلق فرماتے ہیں:-

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن | دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُزدے چند | بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

آجکل یورپ میں تخفیفِ اسلحہ۔ انسدادِ جنگ اور آزادیِ بحر کے جو دعاوی کئے جا رہے ہیں۔ وہ بظاہر لاکھ خوشنما کن سہی لیکن ان کے پردے میں وہی پرانے استبداد کے آئین کارفرما ہیں:-

بطلے می گفت بحر آزاد گردید | چنیں فرماں ز دیوانِ خضر رفت
نہنگے گفت رو ہر جا کہ خواہی | و لے از ما نباید بے خبر رفت

سوشلزم

سوشلزم کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ اقبال کا رویہ ہمدردانہ ہے۔ اور اس نے اپنے بے شمار اشعار میں مزدوروں کی حالت زار اور سرمایہ داروں کے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ خضرِ راہ میں فرماتے ہیں:-

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے | خضر کا پیغام کیا ہے، یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر | شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی | اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ | خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے | مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

کہ مگس نادان طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار سے آباد ہو

بیا کہ تازہ نوا می ترا ود از رگ ساز
مئی کہ شیشہ گداز د بساغر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقام بلبل گیریم
بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم
بطوف شمع چو پروانہ زیستن تا کے
ز خویش این ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

لیکن مغربی تحریکوں کے متعلق اقبال کو جو بدظنی ہے اس سے متاثر ہوکر وہ موسیونیٹن کے دعاوی کا یوں ابطال کرتے ہیں۔ جو قیصر ولیم کی زبان سے ادا ہوتا ہے :-

گناہ و عشوہ و ناز بتاں چیست
طواف اندر سرشت برہمن ہست
دمادم نو خداوندان تراشد
کہ بیزار از خدایان کہن ہست
اگر تاج کئی جمہور پوشد
ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
ہوس اندر دل آدم نمیرد
ہماں آتش میان مرزغن ہست

نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

اقبال ابھی سوشلزم کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اور ابھی تک اس کے متعلق کوئی ناطق رائے نہیں پیش کی۔ البتہ امید ہے۔ کہ اپنی نئی تصنیف "جاوید نامہ" میں ان تمام مسائل پر سیر حاصل بحث کریگا جہاں تک سرمایہ اور محنت کا تعلق ہے۔ اس کے عقائد بالکل واضح ہیں :-

بہ دہقان زمین بار سرمایہ دار
ندارد گذشت از خور و خواب کار
جہاں راست بہروزی از دست مرد
ندانی کہ این ہیچ کاراست و زرد

داردی بیہوشی ست تاج کلیسا وطن　　بار خداداد را خواجہ بجائے خرید

دور پرویزی گذشت ای کشتۂ پرویز خیز　　نعمت گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

پیشگوئی آئندہ انقلابات سیاسی کے متعلق اقبال نے جو پیش گوئیاں کی ہیں ان میں بھی محنت کی فتوحات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :-

افسر پادشہی رفت و بہ یغمائی رفت　　نی اسکندری و نغمۂ دارائی رفت
کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست　　عشرت خواجگی و محنت لالائی رفت
یوسفی را ز اسیری بہ عزیزی بردند　　ہمہ افسانہ و افسوں زلیخائی رفت
چشم بکشائی اگر چشم تو صاحب نظر است　　زندگی در پئے تعمیر جہاں دگر است

انقلابی کہ نگنجد بہ ضمیر افلاک　　بینم و ہیچ نہ بینم کہ چساں می بینم
خرم آں کس کہ دریں گرد سواری بیند　　جوہر نغمہ ز لرزیدن تارے بیند

زبیر ایم اے

جاوید نامہ

(از مولینا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

ان دنوں ڈاکٹر اقبال کی جدید تصنیف جاوید نامہ کے مطالعہ کا اتفاق مجکو ہوا۔ ان کی دیگر تصنیفات کی طرح یہ کتاب بھی دماغی لذت اور روحانی کیف کے لئے ایک لطیف نعمت ہے۔ بلکہ اس میں ایک جدت یہ ہے کہ شاعر نے پیر رومی کے ساتھ افلاک کی سیر کی ہے۔ مختلف سیاروں میں ارواح اور ملائک سے ملاقات ہوئی۔ جن کے ساتھ حقائق اور عہد حاضر کے اہم مسائل پر سوالات اور جوابات ہوئے +

پہلے فلک قمر پر رسائی ہوتی ہے۔ جہاں ایک ہندوستانی سادھو ایک غار میں نظر آتا ہے اس کے ساتھ گفتگو ہوتی ہے اور وہ نو وصیتیں کرتا ہے۔ خاتمہ پر ایک فرشتہ نمودار ہوتا ہے جو ایک دلکش ترانہ گا کر غائب ہو جاتا ہے۔ پھر وادی طواسین میں پہنچتے ہیں۔ طاسین گوتم میں ایک زن رقاصہ مہاتما موصوف کے ہاتھ پر توبہ کرتی ہے۔ طاسین زردشت میں اہرمن زردشت کو آزماتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ طاسین مسیح میں حکیم ٹالسٹائی کا ایک حقیقت نما خواب ہے۔ اور طاسین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں حرم کعبہ میں ابوجہل کا نوحہ +

فلک عطارد پر پہنچتے ہیں جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا (ترکی وزیر) کی روحوں سے ملاقات ہوتی ہے اور ان کے ساتھ وقت کے ضروری اسلامی مہمات پر گفتگو چھڑ جاتی ہے +

فلک زہرہ پر اقوام قدیمہ کے دیوتاؤں کی محفل ملتی ہے۔ جس میں ان کے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ پھر دریائے زہرہ میں فرعون اور کچنر کی روحیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہاں سودانی درویش (مہدی) نکلتا ہے

اور عربی روح کی بیداری کے لئے نغمہ گاتا ہے +

فلک مریخ میں- پہلے ایک رصد گاہ ملتی ہے جس سے مریخی حکیم برآمد ہوتا ہے جو زمین کی بھی سیاحت کر چکا ہے- پھر ایک فرنگن جو پیغمبری کی مدعی ہے- عورتوں کے مجمع میں دکھائی دیتی ہے- اور ان کو آزادی یعنی شوہروں سے بھی آزادی کا پیغام دیتی ہے +

فلک مشتری میں اُن روحوں سے ملاقات ہوتی ہے جنہوں نے سیر جاودانی اختیار کی اور جنت میں رہنا پسند نہ کیا- مثلاً حلاج (منصور)- غالب (اسداللہ خاں) اور قرۃ العین (بابی مبلغہ) ان کے ساتھ خوب خوب شاعرانہ گفتگو ہوتی ہے- آخر میں ابلیس نظر آتا ہے- اور انسان کی کمزوری اور اپنی آسان فتوحات پر ماتم کرتے ہوئے کسی مرد حق کی آرزو کرتا ہے جس کے مقابلہ میں شکست ہی کھا کر کچھ تو لذت پائے +

فلک زحل پر وہ ارواح رذیلہ ملتی ہیں جن کو قبول کرنے سے دوزخ نے بھی انکار کر دیا ہے- ان میں ہندوستانی ملت کے دو مشہور غدار جعفر بنگالی اور صادق دکنی خونیں قلزم کے عذاب میں پڑے ہوئے نظر آتے ہیں +

اس کے بعد ماورائے افلاک پر عروج ہوتا ہے اور جرمنی کے مشہور فلسفی نیٹشے سے ملاقات ہوتی ہے- وہاں سے جنت الفردوس کی طرف بڑھتے ہیں جس میں شرف النساء کا قصر نظر آتا ہے جو تیغ اور قرآن کی محافظ تھی- پھر سید علی ہمدانی اور ملا غنی کشمیری ملتے ہیں- اس کے بعد ہندو شاعر برتری ہری اپنا نغمہ سُناتا ہے- وہاں سے سلاطین مشرق یعنے نادر شاہ- ابدالی اور سلطان شہید دکنی کی زیارت کو جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ مکالمے ہوتے ہیں- پھر قرب حضور حاصل ہوتا ہے- جہاں تجلیات میں غرق ہو جاتے ہیں- اور دعا کرتے ہیں جس پر ندائے جمال آتی ہے- اور یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے +

ان سب کے بعد کتاب کا اصلی مقصود اختصار کے ساتھ نژاد نو یعنے نئی نسل کو مخاطب کر کے سُنا دیتے ہیں +

یہ سب کچھ اس خوبی خوش اسلوبی اور لطف وکیف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس کا مزہ صرف اس کے پڑھنے ہی سے مل سکتا ہے۔ سارا کلام مربوط۔ متناسب۔ موجز مگر مکمل چست اور حشو و زوائد سے پاک۔ صاف اور برجستہ۔ پختہ اور بلند ہے۔ ایسے مضامین عالیہ کو جہاں اکثر الفاظ معانی سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ اس خوبصورتی سے باندھنا اور ایسے سنگلاخ راستہ کو اس سبک گامی کے ساتھ طے کرنا ڈاکٹر صاحب ہی کا کام تھا حقیقت یہ ہے کہ اب ان کی آورد میں بالکل آمد کا لطف پیدا ہو گیا ہے +

ڈاکٹر صاحب کی تعلیمات اور اُن کے مضامین سے عام طور پر تعلیم یافتہ طبقہ واقف ہے۔ وہی مضامین اور وہی تعلیمات نئے اسلوب اور نئے قالب میں اس کتاب میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ہر چند کہ ارواح قدیمہ وجدیدہ کی زبانوں سے مختلف عوالم میں یہ باتیں کہی گئی ہیں لیکن سب کا اسلوب ایک اور انداز ایک ہے کیونکہ وہ ایک ہی آفتاب کی شعاعیں ہیں۔ یعنے قرآن کی ۔ ملاؤں کا قرآن نہیں۔ بلکہ آسمانی قرآن +

ملاؤں کی حقیقت سعید حلیم پاشا کی روح سے سنیئے :-

دینِ حق از کافرے رسوا تر ست | زانکہ ملّا مومنِ کافر گرست
زاں سوئے گردوں دلش بیگانہ | نزد او اُم الکتاب افسانہ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی | آسمانش تیرہ از بے کوکبی
از ستگر فہمائے آں قرآں فروش | دیدہ ام روح الامیں را درخروش
کم نگاہ دکور ذوق و ہرزہ گرد | ملت از قال واقولش فرد فرد

دین کافر فکر و تدبیر جہاد
دین ملا فی سبیل اللہ فساد

سید جمال الدین افغانی کی روح ملت روسیہ کو پیغام دیتی ہے :-

منزل و مقصود قرآں دیگر است | رسم وآئین مسلماں دیگر است

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست — خود سر تخت ملوکیت نشست

تا نہال سلطنت قوت گرفت — دین او نقش از ملوکیت گرفت

تو کہ طرح دیگرے انداختی — دل ز دستور کہن پرداختی

ہمچو ما اسلامیان اندر جہاں — قیصریت را شکستی استخواں

تا برافروزی چراغے در ضمیر — عبرتے از سرگذشت ما بگیر

پائے خود محکم گذار اندر نبرد — گرد این لات و ہبل دیگر مگرد

کہنہ شد افرنگ را آئین و دین — سوئے آں دیر کہن دیگر مبین

کردۂ کار خداونداں تمام — بگذر از لا جانب الا خرام

داستان کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از ام الکتاب

چیست قرآں خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

اشتراکیت کے توام میں تین منفی چیزیں شامل ہیں۔ یعنے نہ تاج۔ نہ سرمایہ۔ نہ مذہب ٭

اگر انسان کے تاریخی ادوار۔ شکار۔ گلہ بانی۔ زراعت اور سلطنت پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہی آخری دور اس کے لیے سب سے سخت ابتلا کا دور ہے جو صدہا سال کے بعد ختم ہو رہا ہے۔ تاج کے اردگرد امراء۔ وزراء۔ متعلقین اور افواج کی ایک جماعت ہو جاتی ہے جس کے تحت میں رعایا کے درجہ بدرجہ طبقات بنائے جاتے ہیں۔ اور سارے ملک کی محنت تاج کی خدمت میں لگادی جاتی ہے۔ اس طاغوت اعظم کے سایہ میں نہ صحیح خیالات فروغ پا سکتے ہیں۔ نہ سچے دین کی تربیت ہو سکتی ہے۔ اسلام نے قیصریت اور کسرویت کے طواغیت کبریٰ کو پاش پاش کر ڈالا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں مسلمان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خود شخصی حکومت کے تخت پر آ گئے۔ اور جس بت کو توڑا تھا اسی کو پھر

نصب کر لیا جس کا نتیجہ بھی بھگتا +

ملّت۔ روسیہ نے بھی اسلام کے دور اوّل کا کام کیا اور زیادہ سختی کے ساتھ کیا کیونکہ تاج کے ساتھ تمام تعلقات نوابی، جاگیرداری۔ زمینداری اور ہر قسم کی سرمایہ داری کو بھی ختم کر دیا۔ یہی نفی لاؔ ہے جو اسلام کا اوّلین قدم اور اس کے کلمہ کا پہلا حرف ہے +

قرآن وحدت نفس انسانی کا مبلغ ہے۔ جو اخوت سے بھی بالاتر ہے۔ اس لئے خاص انسانیت کے حقوق میں کسی قسم کا امتیاز قرآن کی رو سے ممکن نہیں ہے۔ روسیوں نے بھی یہی امتیاز مٹایا ہے اور یہی نفی لاؔ ہے +

جملہ مذاہب (نہ کہ دین) اشخاص پرستی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی تاریخ بنی آدم میں سوائے تفرقہ اندازی۔ سفک دم اور عداوت پیدا کرانے کے اور کچھ نہیں رہی ہے۔ ان کا مٹانا اسلام کا فرلیفہ ہے اور یہی روسیوں نے کیا۔ یہی نفی لاؔ ہے +

حقیقت یہ ہے کہ مذہب راستہ کو کہتے ہیں۔ اقوام عالم کے بڑے بڑے لوگوں نے جو طریقہ ایک خاص وقت یا ایک خاص ماحول میں اختیار کیا ان کے متبعین نے اسی کو اپنا دائمی مذہب بنا لیا کرل مارکس کے مشہور مقولہ کے مطابق تمام مذاہب بڑے بڑے انسانوں کے خیالات ہی ہیں۔ لیکن دین وہ ہے جس کو خود خالق عالم نے انسانی فطرت کی اصلاح اور ترقی کے لئے روز ازل سے وضع فرمایا۔ اور انبیاء کرام کے ذریعہ سے اس کو دنیا میں پہنچاتا رہا۔ یہ ہمیشہ سے ایک ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ اور یہی حق ہے یعنے ہر زمان اور ہر مکان میں اٹل ہے۔ آج دنیا میں اسکا بے شائبہ مکمل اور واحد مجموعہ صرف قرآن ہے اور بس +

اسی پیغام میں اس کی حقیقت سنئے :۔

نقش قرآں تا دریں عالم نشست نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم انچہ در دل مضمر ست ایں کتابے نیست چیزے دیگر ست

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں 	زندہ و پائندہ و گویاست ایں

دوسری جگہ اسی کتاب میں ہے :-

چوں مسلماناں اگر داری جگر 	در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست 	عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است 	گیر اگر در سینۂ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست 	ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

قرآن ہر زمانہ کے لئے ہدایت ہے اور ہر ماحول میں وہ نیا عالم پیدا کرتا ہے۔ مسلمانوں نے اصولی غلطی یہ کی کہ قرآن کی اُن شرحوں اور تاویلوں کو جو مخصوص اوقات اور حالات میں ہوتی رہیں۔ دائم و قایم سمجھ لیا جس کے باعث قرآن متروک و مہجور ہو گیا۔ حالانکہ آج ان انسانی تفاسیر کا بڑا حصّہ قطعاً بیکار بلکہ مردہ ہو چکا ہے۔ اور قرآن اسی طرح زندہ اور سرچشمۂ ہدایت ہے۔ وہ ہر زمانہ میں ایک نئے تغیر کا طلبگار ہے +

ایک صاحب نے جو قرآن کا عمیق علم رکھتے ہیں اور کسی زمانہ میں اُس کے علمی سیاسی طبقہ سے روشناس رہے ہیں مجھ سے مکہ معظمہ میں بیان کیا کہ انہوں نے مسٹر لینن اور اُن کے رفقائے کار سے کہا کہ تم نے جو شکست و ریخت کی ہے وہ عین اسلام کے مطابق ہے۔ اُس نے کہا مسلمان علما تو ایسا نہیں کہتے۔ انہوں نے کہا کہ کسی کے کہنے یا نہ کہنے کی کیا بات ہے۔ روسی زبان میں قرآن کا ترجمہ موجود ہے۔ میں آیات خود تم کو دکھلا دیتا ہوں۔ جب اُس نے دیکھ لیا تو کہا کہ تعجب ہے کہ پھر مسلمان کیوں ہمارے خلاف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لادینی کی وجہ سے۔ جہاں تم نے باطل شکنی کی ہے۔ اگر حق کا بھی اقرار

کرلو پھر تم سے بڑا کر کوئی مسلمان نہیں۔ کیونکہ اسلام کا پیغام صرف یہ ہے کہ
"[illegible] باہم بھائی بھائی بن جاؤ اور اکیلے اللہ کے بندے"۔
مگر ابھی وہاں نفی کا بحران ہے۔ اثبات تک پہنچنے میں نہ معلوم کتنا زمانہ لگے +

روس آج سے دو صدی قبل اسلام میں داخل ہو چکا ہوتا۔ اگر علما نے رکاوٹ نہ ڈالی ہوتی۔ صورت یہ ہوئی کہ پیٹر اعظم جو مسلسل تاتاریوں سے لڑتا رہا اور جس کا مقابلہ عثمانی سلاطین مصطفیٰ ثانی اور احمد ثالث کے ساتھ رہا۔ اسلام سے بہت اثر پذیر ہوا۔ بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں اس نے روس کے بڑے بڑے علما کو جمع کر کے کہا کہ مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ مگر دو چیزیں نہیں چھوڑ سکتا۔ خنزیر اور شراب۔ علما نے حمیتِ اسلامی کے جوش میں ایسے اسلام کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ مسلم خواہ کتنا ہی گنہگار ہو غیر مسلم سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس کی تلوار اسلام کی گردن پر نہیں چلیگی۔ [illegible] ہوئی +

[illegible] سوویٹ روس میں اہل مذاہب اور مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ قرآنی زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ عالم میں جو کچھ حرب و ضرب شورش و انقلاب۔ تغیر و تبدل ہو رہا ہے وہ سب تکمیل دین اور اتمام نور کے لئے ہو رہا ہے۔ اور اسلام کے واسطے زمین تیار کی جا رہی ہے۔ کیونکہ انسانیت کو ایک نہ ایک دن ان حقائق ثابتہ پر پہنچنا لازمی ہے +

جو لوگ آئے دن قیامت کی پیشین گوئیاں کرتے۔ اس کے قرب سے ڈراتے اور عرصۂ حیات تنگ کرتے رہتے ہیں وہ بلا وجہ اپنے نفس اور امت کو دھوکے میں ڈالتے ہیں۔ ایسے قرائن اور شواہد موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم انسانی عہدِ طفولیت میں ہے۔ اور جس کام کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی ہے اس کا عشر عشیر بھی ابھی تک نہیں کر چکا ہے۔ ابھی اس کو ہزاروں انقلابات دیکھنے ہیں۔ تب جا کر کہیں "وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا" کا وقت آئے گا +

اشتراکیت اگرچہ ایک تاریخی چیز ہے۔ اور زمانۂ گذشتہ میں مختلف شکلوں میں بار بار

اس نے سر نکالا ہے لیکن اس زمانہ میں نہایت شدت اور قوت کے ساتھ یہ تحریک دنیا میں پھیلتی جاتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو دینی لحاظ سے اس پر غور کرنا لازمی ہے۔

قرآن نظام عائلی کا محافظ ہے۔ صلہ رحمی اور قرابت کے حقوق کی ادائگی اس نے انسان کے واجبات اور فرائض میں رکھا ہے۔ اس لئے اشتراکیت کی انتہائی صورت جس میں یہ نظام بگڑ جاتا ہو اسلام کے بالکل منافی ہے۔ بے شک جہاں تک قبضۂ زمین کا تعلق ہے وہ اشتراکیت کی موافقت کرتا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں تصریح ہے کہ "وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ" (الآیہ) (زمین کو اللہ نے مخلوق کے لئے بنایا ہے) اس لئے اس کا استعمال اسی صورت میں ہونا چاہیئے جس میں مخلوق کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچ سکے۔ بادشاہوں یا زمینداروں کا زمین پر قبضہ نہ صرف اس کے فائدہ کو محدود کر دیتا ہے بلکہ "وضعہا للانام" کے خلاف ہے جو ظلم ہے۔

علماء ترک نے زمینداری کے جواز میں دو دلیلیں پیش کی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن نے وراثت کا قانون رکھا ہے۔ دوسری یہ کہ زمینداری مسلمانوں میں ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ لیکن دونوں دلیلیں باطل ہیں۔

پہلے اس لئے کہ قانون وراثت یہ کب لازم کرتا ہے کہ ہر شخص زمین کی ملکیت چھوڑ کر مرے۔ دوسرے ترکے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اس دلیل کی کوئی منطقی شکل ہی نہیں بن سکتی۔

دوسری دلیل کے دو جواب ہیں ایک الزامی۔ دوسرا تحقیقی۔ الزامی یہ ہے کہ مسلمانوں میں ملوکیت بھی مسلّم چلی آئی ہے۔ پھر اس کو کیوں چھوڑتے ہو۔ اور تحقیقی یہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی دوسری قوموں کی طرح تاریخی ادوار سے گزرنا ناگزیر ہے۔ اس لئے ان کے قول و فعل سے کسی شے کے دینی ہونے کا ثبوت اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ قرآنی سند اس کے ساتھ نہ ہو۔ جو قوم ملوکیت میں گرفتار ہو گئی وہ زمینداری میں کیوں نہ پھنستی۔ قرآن کی رو سے قابل زراعت اراضی پر انسانوں کو صرف حق انتفاع حاصل ہے نہ کہ حق ملکیت۔ البتہ دیگر شیوں پر قرآن شخصی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے۔

سورہ یٰسین میں ہے:۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۔ } کیا اُنہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے اُنکے لئے مویشی بنائے جنکے وہ مالک ہیں؟

یہیں سے اسلام اور اشتراکیت کا افتراق شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب اللہ کی بنائی ہوئی چیزیں اس کی ملکیت ہو سکتی ہیں تو اپنی مصنوعات اور کمائی تو یقیناً اُس کی شخصی ملکیت ہونگی +

اسلام میں سب سے پہلے اشتراکی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہے جا سکتے ہیں۔ اغنیا کی دولت کو فقرا کا حق سمجھتے تھے۔ لیکن غالباً اس میں منقولہ اور غیر منقولہ کا امتیاز نہ تھا۔ اسی وجہ سے خلیفۂ ثالث رضی اللہ عنہ نے ان کے اس خیال کو مفاد عامہ کے خلاف سمجھ کر ان کو ایک بیابانی مقام ربذہ میں بھیجدیا۔ وہیں اُنہوں نے ۳۲ھ میں وفات پائی +

مسلمانوں کے بعض مہربان ناصح ان کو یہ نصیحت بھی کرتے رہتے ہیں کہ "اسلامی تمدن" کی حفاظت کرو حقیقت یہ ہے کہ تہذیب یا تمدن ملکی اور قومی چیزیں ہیں۔ قرآن جس طرح ہر ملک اور ہر قوم سے بالاتر ہے۔ اسی طرح کسی تہذیب اور کسی تمدن کے ساتھ بھی اس کو کوئی خصوصیت نہیں۔ وہ قلوب اور اعمال کی اصلاح کے لئے آیا ہے۔ اور ہر تہذیب اور ہر تمدن کو اسلامی بنا سکتا ہے +

فلک مشتری پر ڈاکٹر صاحب کی ایک ادا قرآن کے خلاف معلوم ہوئی۔ اس لئے اس کو بھی ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ جوہر مصطفےٰ کی حقیقت جس کو اللہ تعالیٰ نے معراج کے بیان میں "عبدہ" فرمایا ہے۔ حلاج کی زبان سے اس طرح بیان کرتے ہیں +

عبدہ از فہم تو بالاتر است   زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
عبدہ صورت گر تقدیرہا   اندرو ویرانہا تعمیرہا
عبدہ دہر است و دہر از عبدہ است   ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست
کس ز سرّ عبدہ آگاہ نیست   عبدہ جز سرّ الا اللہ نیست

یہاں تک کہ صاف صاف لکھتے ہیں ؎

لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ — فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ"

یہ حقیقت میں غلو ہے۔ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت کے حدود میں رکھنے سے انکا اسوۂ حسنہ انسانوں کے لئے دلکش اور آسان رہتا ہے بخلاف اس کے دائرۂ الوہیت میں داخل کر دینے سے ان کی پیروی نہ صرف دشوار بلکہ غیر ضروری بھی ہو جاتی ہے۔ غالباً اسی نکتہ کی وجہ سے قرآن نے جہاں جہاں اس امر کو بیان کیا ہے حصر کے ساتھ بیان کیا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے

قُلْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا } میں نہیں ہوں مگر ایک انسان پیغام لانے والا

سورۂ کہف میں ہے

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ } کہدے کہ میں تو بس تمہارے ہی جیسا انسان ہوں اگر مجھ پر وحی بھیجی جاتی ہے

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بجز اس کے کہ عالمِ غیب سے اللہ آپ کے اوپر بھیجتا ہے بشریت ہی کے دائرہ میں محصور ہے۔ اور کوئی شعبہ الوہیت کا اس میں نہیں ہے۔ مزید تصریحات قرآن کی متعدد آیات میں ہیں۔ جو لوگ دونوں کو ملا دیتے ہیں۔ اُنہوں نے یا تو اللہ کو نہیں سمجھا۔ یا رسول اللہ کو نہیں سمجھا۔

خطاب بہ نژادِ نو عہدِ حاضر میں نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ ہندستانی اور مقامی مدعیانِ نبوت کی بابت جو کچھ فرمایا ہے سننے کے قابل ہے :۔

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ — فتنۂ او حبِ مال و ترسِ مرگ
صحبتش با عصرِ حاضر درگرفت — دینِ حق را از دو پیغمبر گرفت
آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد — آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد
تا جہاد و حج نماند از واجبات — رفت جاں از پیکرِ صوم و صلوٰۃ
روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام — فرد ناہموار ملت بے نظام

سینہا از گرمیٔ قرآں تہی
از چنیں مرداں چہ امید بہی

ہم سنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ شاہنامۂ فردوسی۔ مثنوی مولانا روم۔ گلستانِ سعدی اور دیوانِ حافظ۔ مگر اب جاوید نامہ کو بھی پانچویں کتاب سمجھنی چاہئے۔ جو کہ معنویت اور فنیت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے حقیقت میں یہ اس قابل ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانانِ عالم کے نصاب میں شامل کرلی جائے ٭

جی چاہتا تھا کہ اس کتاب کی تعلیمات کو میں آیات الٰہی کی روشنی میں دکھلاتا۔ مگر یہ ایک طویل شرح ہو جائے گی۔ اس لئے ایک مختصر سی نظم میں "زندہ رود" کو خطاب کرکے جو ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں اپنا لقب رکھا ہے۔ اس مضمون کو ختم کرتا ہوں ٭

زندہ رود

اے کہ ذاتِ تست ملت را چراغ — اے کہ شعر تست فردوسِ دماغ
اے کہ در سازت نوائے زندگی — خوش سرودی نغمہ ہائے زندگی
آتشے از سوزِ خود افروختی — جانِ ما افسردگاں را سوختی
طبع درّاکت جہاں را واشگافت — شاعری در ذاتِ تو معراج یافت
در خیالِ خود گزشتی از فلک — تا شدی انباز با حور و ملک
وانسوئے گردوں جہانیدی سمند — تا بزیر پایۂ عرشِ بلند
نورِ حق را در تلاطم دیدۂ — خویشتن را اندراں گم دیدۂ
عشق را تازہ براتے آوردۂ — یعنے پیغامِ حیات آوردۂ
شرحِ وادیٔ عالمِ موجود را — وانمودی منزلِ مقصود را
گفتۂ تو مغز و جانِ شاعری — بر تو می نازد جہانِ شاعری
اے کہ از آبِ حیاتی زندہ رود — بر روانہائے تو از من درود

اسلم جیراجپوری

"متفادلِ اقبال"

ترا چنانکہ توئی ہر کسے کجا داند
بقدرِ طاقتِ خود می کند استدراک

عام انسان ملائکہ سے افضل ہیں یا نہیں۔ یہ امر تو علم الاخلاق میں کسی حد تک متنازعہ فیہ رہا ہے لیکن اس میں تو کسی کو کلام نہیں کہ عالمِ خلق میں حضرتِ انسان سے زیادہ شرف و اجتباء کسی دور کے حصہ میں نہیں آیا۔ ایک طرف صحفِ مقدسہ اس کی تصدیق میں رطب اللسان ہیں۔ اور دوسری طرف دورِ جدیدہ کے انکشافات اس کے مؤید۔ انجیل بتاتی ہے کہ آدم کو خدا نے اپنی شکل پر پیدا کیا۔ خود قرآنِ حکیم خلقتِ انسانی کو "احسن تقویم" سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس کی ممکناتِ زندگی کو لامحدود قرار دیتا ہوا فرماتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ کہ پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب حضرتِ انسان کے تابع فرمان ہے۔ ادھر ماہرینِ نظریہ ارتقاء نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ موجوداتِ عالم کی زنجیر کی آخری کڑی حضرتِ انسان ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اشرف و مکمل ہستی ہنوز صفحۂ ارض پر نمودار نہیں ہوئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس یہ نظری شہادات بھی نہ موجود ہوتیں تو بھی انسانی قدرت و امکان کی داستانیں ہمیں مجبور کر دیتیں کہ اس کی خلافت و نیابتِ الٰہی پر آمنّا و صدّقنا کہا جائے +

لیکن طبائع و اخلاقِ انسانی کی بوقلمونی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ایک طرف تو اس کی ہمت و حوصلہ کی وسعتوں کا یہ عالم اور دوسری طرف۔ جب بعض ناگزیر اسباب و علل کے ماتحت اس کے ارادوں میں

تزلزل اور عزائم میں فسخ شروع ہوتا ہے تو دون ہمتی، یاس، قنوط، افسردگی و پژمردگی تعطل و تفلّج کا جیسا نمو پیش کرتا ہے۔ ما یدو شاید۔ پتہ نہیں سب سے پہلے وہ کونسا شکستہ خاطر و اندوہگیں انسان تھا جو حوادث و آلام سے مجبور ہو کر دل چھوڑ بیٹھا۔ اور اپنے احوالات، دنیا و مافیہا بلکہ خود اپنی خلقت سے تنگ آ گیا۔ اور وہ کونسے ناقابلِ برداشت مصائب و آلام تھے، جن سے تنگ آ کر اس نے یہ نظریہ قایم کر لیا کہ دنیا حزن و آلام، رنج و کرب، عقوبات و صعوبات، مشکلات و تکالیف کا گھر ہے۔ اور خوشی و مسرت، انبساط و سرور کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تشائم نظریہ (Pessimism) کچھ قرونِ اولیٰ ہی سے انسانی دماغوں پر کالی گھٹاؤں کی طرح چھا گیا تھا۔ حکمتِ یونان اپنے اوجِ کمال پر پہنچی کہ افلاطون کا فلسفہ نفسِ حقیقت رائج ہو گیا۔ ادھر ہندوستان میں ویدوں کے زمانہ سے ہی اس کا سراغ مل جاتا ہے۔ آپ نشدوں کی تعلیم کے مطابق آتما حقیقی اور اس کے ماورا سب کچھ مایا یعنی نفی ہے۔ اور موجوداتِ عالم مایا یعنی سراب۔

اس کے بعد بدھ مت کا زمانہ آتا ہے۔ اس نے تو یوں کہئے کہ امیدوں کی چہکتی دنیا کا گویا جنازہ نکال کے رکھ دیا۔ مہاتما بدھ کی تعلیم کے مطابق حزن و ملال خلقتِ انسانی کے اندر ودیعت کر کے رکھ دئیے گئے ہیں۔ دنیا میں انسان کا وجود بذاتِ خود ایک بلائے عظیم ہے۔ اس تعلیم کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ "زندگی نام ہے خواہش و آرزو کا۔ اور آرزو ہی باعثِ درد و الم ہے۔ لہٰذا زندگی فی نفسہٖ درد و الم ہے۔ اور صرف ترکِ علائق، نفیِ خودی اور تعطلِ آرزو یعنی امیدوں کی فنا اور خواہشات کی موت سے آتما کو اس سکونِ ابدی اور راحتِ سرمدی کو حاصل کر سکتا ہے جس کا نام نروان ہے۔" دوسری طرف عیسائیت میں یہ مسئلہ کچھ اور بھی لچک لے کر ابھرا۔ ان کے نزدیک اس مجلس آب و گل میں حضرتِ انسان تشریف ہی اس لئے لاتا ہے کہ اپنے ماں باپ (آدمؑ و حوّا) کے گناہوں کی سزا بھگتے۔ لہٰذا جتنا اس جیل خانے سے دور رہے اتنا ہی سکھ ہے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ فلاسفہ یورپ میں (Leibnitz) کے وقت تک پھر بھی ایک حد تک متفاول نظریہ حیات (Optimism) کا چرچا تھا (David Hume)

نے اس روش کا کچھ کانٹا بدلا۔ ہکسلے اور سپنسر اثبات سے تشکیک پر آ گرے۔ اور شوپنہار نے تو بالکل بدھ مت کا چولا پہن لیا۔ وہ "زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو ورق" گردانتا ہے۔ اس کے نزدیک "انسان ایک غیر فانی درد و کرب کا تختہ مشق بنا ہے اور مسرت و انبساط کا جو سراب اسے نظر آتا ہے وہ محض اس لئے ہے کہ یہ مصائب جھیلنے کے لئے ارتباط جسم و جان قائم رکھ سکے۔" لیکن چونکہ یورپ نے ایسے فلسفیانہ نظریات کو عملی دنیا میں زیادہ دخل نہ دینے دیا۔ اس لئے یہ چیزیں ان کی مادی ترقی میں مانع نہ ہوئیں +

اسلام دنیا میں آیا۔ اور امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لایا۔ اُس نے آتے ہی للکار کر کہا کہ

لا تھنو و لا تحزنو۔ و انتم الاعلون۔ ان کنتم مومنین

مت گھبراؤ۔ بالکل خوف نہ کھاؤ۔ تم ہی سب سے بلند و برتر ہو۔ ذرا قوانین فطرت کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ انسان کو خلافت و نیابت الٰہی کا واحد حقدار قرار دیا۔ موجودات عالم اس کی فرمانبردار ٹھہرائیں۔ متاع دنیا اور مال و منال اس کے لئے باعث زینت و افتخار قرار دیئے۔ سرخروئی عقبیٰ کے ساتھ ساتھ دنیاوی فلاح و بہبود کی زندگی کو بھی خاصہ حیات گردانا۔ اور ایک مسلم کی زبان سے یہ دعا نکلوائی کہ ربنا آتنا فی الدنیا حسنتہ و فی الآخرۃ حسنتہ ۔ اُس نے ایمان و عمل اور یکسر ایمان۔ عمل کو راز حیات بتایا اور یاس و قنوط۔ نا اُمیدی اور عدم آرزو کو کفر سے تعبیر کیا۔ اور صاف صاف فرمادیا کہ لاتقنطو من رحمتہ اللہ۔ مصائب و آلام کی گھٹائیں چاروں طرف چھا رہی ہیں۔ مسلمان بے یار و مددگار نظر آتے ہیں۔ بظاہر دل ہلا دینے والے اسباب جمع ہیں۔ لیکن اسلام زندہ آرزوؤں کا مذہب اسلام اس وقت پکار پکار کر کہتا ہے۔ لاتحف ان اللہ معنا۔ مت گھبراؤ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ انّ نصر اللہ قریب۔ وہ دیکھو نصرت خداوندی سامنے کھڑی ہے۔ واستعینو بالصبر و الصلوٰۃ۔ ہمت و استقلال سے کام لو۔ ہمت بھی کرو۔ دعائیں بھی مانگو۔ حوصلہ رکھو۔ تم دس ہو گے تو سو پر فتح پاؤ گے۔ سو ہو گے تو ہزار پر بھاری ہو گے بشرطیکہ

اُمید کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ یہ قانون فطرت دنیا میں خدا کا آخری پیغام بن کر آیا۔ اور چند دنوں میں صدیوں میں نہیں چند دنوں میں سرزمین عرب کی کایا پلٹ کے رکھدی۔ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں بوریا نشیں۔ بادیہ پیما۔ اونٹ چرانے والے بدؤں کے ہاتھوں میں دیدیں +

لیکن افسوس یہ تابناک و درخشندہ دور کچھ زیادہ دیر نہ رہنے پایا تھا کہ فطرت کے یہ سیدھے سادے قوانین گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہونے لگ گئے۔ شروع شروع میں شام و فلسطین کے کلیساؤں نے ان پر اپنا رنگ چڑھایا۔ پھر جب حکمت یونان عربی میں منتقل ہونی شروع ہوئی تو فلسفہ اشراقین نے اپنا اثر ڈالا۔ عجم میں زردشتی آتشکدے ان اثرات کو جلا دینے کے لئے تیار تھے۔ اور اس کے بعد جب ہندوستان میں پہنچے تو ویدانت نے ایسا "من تو شدم تو من شدی" کا منتر پھونکا کہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر یکسر "ہمہ اوست" ہو گئے۔ تاکس نگوید بعدازیں من دیگرم تو دیگری۔ جہاں جہاں اور جبتک حکومت ہاتھ میں رہی اس کے اثرات زیادہ نہ ابھرے۔ اور جونہی حکومت کا سلسلہ ہاتھ سے چھوٹا۔ اصلی رنگ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ ع بالیقیں من نیم و ہم وگمانم باقیست +

میرے نزدیک تصوّف تہذیب نفس انسانی اور قوائے ملکیہ کی جلا کے لئے ازبس ناگزیر ہے لیکن وہی تصوف جو "نانِ شعیر" سے قوت حیدری پیدا کر دے جس سے اُویس قرنیؓ کا سا عشق۔ بوذرؓ سا فقر۔ سلمانؓ سا صدق۔ صدیقؓ کا سا ایثار اور جنیدؒ کا سا استقلال پیدا ہو جائے۔ جو خوف غیر اللہ کو اس طرح قلب مومن سے محو کر دے کہ راجپوتانے کے سے کفرستان میں تنہا توحید کا نعرہ بلند کرنے میں باک نہ سمجھے جو سرزمین دہلی کو جاں سپاری و سرفروشی کی امتحان گاہ بنا دے۔ جو یہ سبق سکھلائے کہ پانی پت کے میدان میں مسلمان سپاہیوں کی قبروں کے پہلو بہ پہلو حضرت مخدوم جلالؒ اور ترک شیرازیؒ کے مقبرے بھی ہونے ضروری ہیں +

اس تو عرض یہ کرنا تھا کہ ہندوستان میں پہنچکر فلسفہ ویدانت نے اسلامی تصوف پہ اتنا گہرا رنگ

کیوں ہوا۔ اس کا جواب مثنوی اسرار و رموز کی ایک تمثیلی حکایت سے ملیگا۔ لکھا ہے کہ ایک جنگل میں بہت سی بھیڑیں رہتی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں کچھ شیر آ گئے اور ان بھیڑوں کا لگے شکار کرنے ان میں ایک بھیڑ بڑی دانا اور ہوشیار تھی۔ اُس نے سوچا کہ بھیڑوں کو شیر بنانا تو مشکل ہے۔ آؤ ایک ایسی چال چلیں کہ شیر بھیڑوں کی خو بو اختیار کر لیں۔ وہ ایک متبرک صورت اختیار کر کے شیروں کے پاس گئی اور ناثباتیٔ دنیا، نفیٔ وجود، سرابِ ہستی کی خوش آئند تعلیم بھی شروع کی۔ رفتہ رفتہ شیر اس پند خواب آور سے اس درجہ متاثر ہو گئے کہ انہوں نے دینِ گوسفندی اختیار کر لیا۔ حتیٰ کہ

شیر بیدار از فسونِ میش خفت
انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

کچھ گرد و پیش کا اثر جس کے متعلق (Bloomfield) ایک جگہ لکھتا ہے "ارضِ ہند اپنی آب و ہوا فطری اثرات اور معاشرتی حالات کی بناء پر متشائم فلسفۂ حیات (Pessimism) کا کافی وجود اپنے اندر رکھتی ہے"۔ اس پر فلسفۂ ویدانت کا رنگ۔ نتیجہ یہ کہ اکبر کے وقت تک اچھے خاصے "ہمہ اوست" کے رنگ میں رنگے گئے۔ اور اگر سچ پوچھو تو عالمگیرؒ کے بعد جو سلطنت کو زوال ہوا تو اصولی طور پر سب سے پہلے "شطحاتِ داراشکوہ" اس کے ذمہ دار ہیں +

شاعری بقول میتھالے چمکتی ہی دورِ تنزل و انحطاط میں ہے۔ جہاں تک دورِ حیات، کشمکشِ روزگار، جہد للبقاء کا سوال در پیش ہو، وہاں۔ "فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی"۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ایام سے متشائم فلسفۂ حیات جذباتی شعراء کو ہمیشہ عزیز خاطر رہا ہے (Homer) کا یہ المیہ گیت کسے یاد نہیں:۔

"دنیا میں جتنی چیزیں ہیں انسان سے زیادہ المناک کسی اور کی زندگی نہیں" +

اور (Sophocles) کا یہ نوحہ کسے بھولا ہوا ہے:۔

" بہترین آرزو یہ ہے کہ دنیا میں انسان آئے ہی نہیں +

اور اگر آچکا ہے تو پھر سب سے بہتر یہ ہے کہ ....

انسان جہاں سے آیا ہے جتنی جلدی ہو سکے وہیں واپس لوٹنے کی کوشش کرے " +

عرب کے ولولہ خیز خون میں حرارت پیدا کرنے والے رجزیہ زمزمے جب عجمی دورِ تعیش و تنعم کی مجلسوں میں آئے۔ تو یہاں دنیا ہی نرالی دیکھی۔ نتیجہ یہ کہ۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند + حرارت و اضطراب تڑپ اور سیمابیت کی جگہ کیف و خمار، آسودگی و تن آسانی نے لے لی۔ اس دور کی شاعری پر نظر ڈالئے تو صاف نظر آجائے گا۔ کہ کہاں یہ کہ

اگر جز بکامِ من آید جواب　　　من و گرز و میدان افراسیاب

اور کہاں یہ کہ

حدیث مے و مطرب گو و راز دہر کمتر جو　　　کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا

ہندوستان میں اوّل تو سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ ہی لیکن بالخصوص غدر کے بعد اردو شاعری پر یہ دور یاس و قنوط کا چھا گیا۔ اور خوب اچھی طرح سے چھا گیا۔ شعر کی انتہائی خوبی یہ قرار دی گئی کہ اس میں سوز و گداز ہو۔ افسردگی ہو۔ یاس ہو۔ موت ہو۔ بلکہ موت کے بعد بھی کوئی تڑپ کوئی حرکت نہ ہو۔ کامل سکوت اور بے حسی ہو۔ غرضیکہ "واہ وا" کی جگہ ہائے ہائے ہو۔ محفل میں چاروں طرف ایک کہرام مچ رہا ہو۔ اور بزمِ مشاعرہ پر ماتم کدہ کا گمان گذرے۔ اس دور کی شاعری پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے واضح ہو جائے گا کہ جن شعرا کو اساتذۂ فن کے زمرہ میں اوّلین صف میں جگہ دی جاتی ہے۔ اُن کا طرۂ امتیاز یہی افسردگی و یاس کا فلسفہ ہے۔ کسی ایسے شاعر کا دیوان اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ یہی رنگ نظر آئے گا دو چار شعر ملاحظہ ہوں :-

اب تو یہ چاہتا ہوں کہ اے انتہائے غم　　　آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

عالم کی فضا پوچھو سحرِ ومِ تمنّا سے ۔۔۔ بیٹھا ہُوا دنیا میں اُٹھ جائے جو دنیا سے

کیا ہنسے انسان اور کیا رو سکے ۔۔۔ جی ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

میرے دم پہ جو گزرتی ہو گزر جانے دو ۔۔۔ تشنۂ غم نہ بڑھاؤ مجھے مر جانے دو

تمہید ہے خزاں کی یہ ہنگامۂ بہار ۔۔۔ اچھا ہے میرا نخلِ تمنّا ہرا نہ ہو

حال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ ۔۔۔ ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

دلِ مایوس میں امید نے لی اسطرح کروٹ ۔۔۔ اُبھر کر جیسے سطحِ آب پہ گویا حباب آیا

کیا کروں شرحِ خستہ جانی کی ۔۔۔ ہم نے مر مر کے زندگانی کی
صبا شکستہ پروں کی دعائیں لیتی جا ۔۔۔ جھکا دے اور ذرا شاخ آشیانے کی

فنا سے پہلے غمِ دل کی انتہا معلوم ۔۔۔ مگر یہ دل بھی مٹے گا کبھی یہ کیا معلوم

غم ایک ہی ایسا ہے جو دنیا کو بھلا دے ۔۔۔ غم کیا ہے یہ نعمت ہے مگر جس کو خدا دے

پوچھا اثر سے میں نے جو دل کا معاملہ ۔۔۔ اک آہ سرد کھینچ کے خاموش ہو گیا

دلِ مایوس را تسکیں بمردن می تواں دادن چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

مجبوری و بےبسی ملاحظہ ہو

صد اعدا کو بھی یہ خواب یارب نہ دکھلائے قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا

غرضیکہ جہاں تک لکھتے جایئے معلوم ہوتا ہے ایک صفِ ماتم بچھ رہی ہے جس پر دنیا و مافیہا کی نوحہ خوانی ہو رہی ہے۔ اور تو اور جو چیزیں کبھی حصولِ سرور و انبساط کی غرض سے اختراع کی گئی تھیں ان سے بھی مقصود حزن و غم ہی لیا گیا۔ شراب تک کی بھی خواہش محض اس لئے رہ گئی کہ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے، اور ہمارے اس "سوروئی ذوق ماتم کدہ" کا اندازہ آج بھی اس سے لگ سکتا ہے کہ موسیقی جیسی طرب انگیز اور گرما دینے والی چیز بھی اس وقت تک محظوظ نہیں کر سکتی جب تک ان میں نغمہ ہائے جانگداز اور "سوز" کی سُریں نہ ہوں +

غرضیکہ افسردگی و غنودگی کا یہ عالم مسلمانانِ ہند پر چھا رہا تھا۔ اور لطف یہ کہ اس سب کا نام "تہذیب اخلاق" رکھ چھوڑا تھا۔ قاعدہ ہے کہ انحطاط و زوال کے وقت خدا کے بندے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اُمّتِ مرحومہ میں تو ایسے ایسے صاحبانِ فکر و بصیرت پیدا ہوتے ہیں جو بنی اسرائیل کے انبیاء کرام کے سے کام کر کے دکھاتے ہیں (حدیث شریف) چنانچہ شعراء میں سے حالی مرحوم نے اس کا احساس کیا۔ قوم پر بڑی لے دے کی۔ ہر چند دل میں بڑا درد تھا لیکن صدیوں کے نشہ کو چند "طعنوں" سے اُتارنا مشکل تھا۔ اکبر مرحوم بھی جب دل کی ٹیس سے مجبور ہوئے تو مریض کو ہوش میں لانے کے لئے کچوکے دیئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خوب دیئے۔ اور ہنسا ہنسا کر گدگدا گدگدا کر ایسی ایسی پتے کی کہہ گئے کہ جو تن لاگے سو تن جانے۔ لیکن مرض کی کہنگی اور مریض کی ضد سے وہاں بھی یاس کا پہلو غالب رہا +

لیکن قدرتِ کاملہ نے "بانگِ درا" کی خدمت کسی اَور کے حصہ میں رکھی تھی۔ وقت آیا اور وہ ہستی پنجاب

کہ ایک غیر معروف سے مقام میں اقبال کے نام سے منصۂ شہود پر جلوہ فگن ہوئی۔ اس کی چشم حقیقت بیں نے واقعات کو چھوڑ کر ان کے علل و اسباب پر غور کیا۔ اس رموز شناس فطرت نے خوب محسوس کیا کہ فقدان عمل۔ بے حسی اور مردہ دلی کا راز یہی اتنا ہے کہ سینوں میں دل، اور دلوں میں آرزوئیں اور امنگیں جوش و ولولے پیدا کرنے والی حرارت موجود نہیں۔ آتشدان ہیں لیکن افسردہ اور ٹھٹھرے ہوئے۔ اور علت مرض یہ ہے کہ قوم اپنی حقیقت سے بے خبر ہو چکی ہے۔ افراد ملت کا نظریۂ حیات متشائم ہو چکا ہے لہٰذا سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ انہیں ان کی حقیقت سے آشنا کیا جائے۔ ان کی ممکنات زندگی کی وسعتوں سے روشناس کرایا جائے اور مثنوی مولانا روم کی تمثیل شیر کی طرح جو ایک عرصہ تک بھیڑوں کے گلہ میں پرورش پا کر اپنے آپ کو بھیڑ ہی شمار کرنے لگا تھا کسی آئینہ میں اسے اس کے اصلی خط و خال سے واقف کرا دیا جائے۔ ایک حقیقت بیں نباض کی طرح اس نے علت مرض دریافت کی۔ اور بہترین معالج کی طرح اس کے لئے نسخے تجویز کئے اور ہر چند مرض مزمن اور مریض ضدی۔ اور ضدی بھی ایسا کہ خود درد کو دوا سمجھنے لگ گیا تھا لیکن اس کی پیشانی پر شکن تک نہیں آئی۔ اس نے طبائع کی کمزوریوں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ بلکہ ان کے حال زبوں پر رحم کھایا۔ اور مشفقانہ طور پر گرے ہوئے کو اٹھایا۔ اور اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

سب سے پہلے ہم یہی دیکھتے ہیں کہ اس نے زندگی کی درخشندہ و تابناک تصویر جس پر صدیوں سے یاس و مردہ دلی کا گرد و غبار پڑ رہا تھا۔ کس طرح اپنے اصلی خط و خال میں پیش کی۔ ہر چند علامہ ممدوح کا سارا کلام انہیں رموز و حقائق سے لبریز ہے لیکن مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں:-

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا　　دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو　　قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ　　تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو ‏ دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا ‏ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ہے زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور وسعت ملاحظہ فرمائیے :۔

وہ مشت خاک ہوں فیض پریشانی سے صحرا ہوں ‏ نہ پوچھو میری وسعت کو زمیں سے آسماں تک ہے

شب معراج سے یہ سبق اخذ فرماتے ہیں کہ

وہ ایک کام ہے ہمت کیلئے عرش بریں ‏ کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

اس کے "دست و بازو" کو یہ مادیات تک ہی محدود نہیں گردانتے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ارشاد ہے :۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زور بازو کا ‏ نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

دام تسخیر کی وسعت اور ملاحظہ فرمائیے :۔

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے ‏ یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

وہ "حیات جاوداں" کو زندگی کی چار دیواری تک محصور نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں ‏ ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

جب حضرت انسان کی ممکنات زندگی کی یہ وسعتیں ہوں تو اسے کیوں نہ یہ درس حیات دیا جائے کہ

اے ز آداب امانت بے خبر ‏ از دو عالم خویش را بہتر شمر

تا کجا خود را شماری ماء و طیں ‏ از گل خود شعلۂ طور آفریں

یاد رکھئے :۔

ناتواں خود را اگر رہرو شمرد ‏ نقد جاں خویش با رہزن سپرد

اور یہ کیوں تجسب؟ اس لئے کہ :۔

ولے ایں راز جز مومن کس نداند ضمیر خاک یزداں بے چگوں است

انتہا یہ ——— کہ:-

قدم در جستجوئے آدمے زن خدا ہم در تلاش آدمے ہست

اس سے زیادہ اور کیا قیمت ہو سکتی ہے کہ خدا در تلاش آدمے ہست۔ اللہ اکبر یہ قدر و قیمت + ہاں۔ اور چلتے چلتے ذرا اس معرکۃ الآرا۔ زندۂ جاوید نظم کے دو چار شعر بھی سنتے جائیے۔ جس کا عنوان ہی اس پیامبر حیات نے "زندگی" رکھا ہے۔ دیکھئے اور غور فرمائیے کہ کیا یہ ہمارا ہی ذکر ہو رہا ہے۔ زندگی کی بقا ملاحظہ فرمائیے:-

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

پھر اس کے اثرات ملاحظہ فرمائیے:-

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

ممکنات زندگی کے ساتھ ساتھ متاع دنیا کے تمتع اور تسخیر قوائے نظام عالم کا درس بھی ضروری تھا کیونکہ متشائم فلسفۂ حیات نے متاع دنیا کو حرام سمجھ رکھا تھا۔ فرماتے ہیں:-

اے کہ از تاثیر افیوں خفتۂ عالم اسباب را دوں گفتۂ
خیز و وا کن دیدۂ مخمور را دوں مخواں ایں عالم مجبور را
حق جہاں را قسمت نیکاں شمرد جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد
نائب حق در جہاں آدم شود بر عناصر حکم او محکم شود

دست رنگیں کن ز خونِ کوہسار جوئے آب گوہر از دریا برار
جستجو را محکم از تدبیر کن انفس و آفاق را تسخیر کن
غنچہ باز خود چمن تعمیر کن شبنمی؟ خورشید را تسخیر کن

یعنی عناصر عالم کے سامنے سر نیوڑھا کر ہاتھ باندھ کر اطاعت کے لئے کھڑا نہ ہو جا۔ بلکہ ان سے خدمت لے۔ انہیں تابع فرمان بنا۔ اور متاعِ دنیا سے پورا پورا فائدہ اُٹھا +

حقیقت سے آگاہی کا لازمی نتیجہ تھا۔ کہ قوم کو اپنی بے حسی اور جمود و سکوت کا احساس پیدا ہوتا چنانچہ جب دیکھا کہ قلب ملت میں خوابیدہ حسیات کی بیداری کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں۔ عروقِ مردہ میں خونِ زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ تو تخلیق آرزو (یا کم از کم تجدید آرزو) کی ضرورت پڑی کیونکہ جب ایک طرف متاعِ حیات کی قدر و قیمت اور دوسری طرف اپنی قوتِ بازو کا احساس پیدا ہو گیا تو جلبِ منفعت اور دفع مضرت کے لئے آرزوؤں کا پیدا ہونا اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ لہذا آرزو کی اہمیت مختلف پیراؤں میں واضح کی گئی۔ اور میں کہونگا کہ یہی چیز علامہ ممدوح کا حقیقی پیغام ہے۔ پہلی منزل کو اس کا مقدمہ سمجھنا چاہیئے۔ اور قوتِ عمل کو اس کا نتیجہ۔ یہی جوہر تھا جس کے فقدان سے قوم پر مردہ دلی اور بے حسی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں اور اس کی تخلیق یا رجعت اس مرض کا علاج تھا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ کس جوش اور ولولے سے امیدوں کی بستی از سر نو تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے للکار کر یہ پیغام سُنایا کہ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

دیکھئے اس ایک شعر کے اندر کسقدر مربستہ راز حیات پوشیدہ ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سارے فلسفۂ حیات کا نچوڑ اس پیغام کے اندر موجود ہے۔ آرزو سے خالی دل کی کچھ قدر و قیمت ان کے نزدیک نہیں ہے۔ فرماتے ہیں

اگر ز رمز حیات آگہی مجوے و مگیر دلے کہ از خلشِ خار آرزو پاک است

مثنوی اسرار و رموز میں جس میں علامہ ممدوح کا حقیقی معنوں میں مکمل پیغامِ حیات محفوظ ہے۔ اور اس کے بعد کا

کلام اسی پیغام کی تفسیر و تشریح اور جسے بجا طور پر "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" کہا جا سکتا ہے۔ مسئلہ آرزو پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے۔ اور مختلف انداز سے اس کی اہمیت پر زور ڈالا گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار — تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست — فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا — سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
طاقتِ پرواز بخشد خاک را — خضر باشد موسئ ادراک را
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات — غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات
چوں ز تخلیقِ تمنا باز ماند — شہپرش بشکست و از پرواز ماند
آرزو ہنگامہ آرائے خودی — موجِ بے تابے ز دریائے خودی
آرزو صیدِ مقاصد را کمند — دفترِ اقبال را شیرازہ بند
زندہ را نفیِ تمنا مردہ کرد — شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

گرمِ خونِ انساں ز داغِ آرزو — آتشِ ایں خاک از چراغِ آرزو
از تمنائے بجام آمد حیات — گرم خیز و تیز گام آمد حیات
زندگی مضمونِ تسخیر است و بس — آرزو افسونِ تسخیر است و بس
زندگی صیدِ افگن و دامِ آرزو — حسن را از عشق پیغامِ آرزو

ایک جگہ یاس و حزن و خوف کو ام الخبائث، قاطع حیات قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

مرگ را سامان ز قطع آرزوست زندگانی محکم از لا تقنطوست
تا امید از آرزوئے پیہم است نا امیدی زندگانی را سم است
زندگی را یاس خواب آور بود این دلیل سستی عنصر بود
از دمش میرد قوائے زندگی خشک گردد چشمہ ہائے زندگی

یاس و نا امیدی فی الحقیقت ان کے پاس تک نہیں پھٹکتی۔ سخت سے سخت مصیبت میں بھی سر رشتۂ امید ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتے۔ فرماتے ہیں:-

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

اور- یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

ریاض ملت پر خزاں مسلط ہو چکی ہے۔ باد سموم کے جھونکوں نے ہرے بھرے درختوں کو خشک کر دیا ہے۔ برگ و گل مرجھا مرجھا کر گر پڑتے ہیں۔ ایک آدھ پتا کہیں کہیں مثل چہرۂ مدقوق زرد نظر آتا ہے۔ یاس و قنوط کے اس اندوہناک سماں میں کسے امید ہو سکتی ہے کہ یہ اجڑا چمن پھر بھی آباد ہوگا لیکن ہماری امیدوں کا شاہزادہ ہے کہ اب بھی متشائم نظریہ کو پاس تک نہیں آنے دیتا اور چپکے سے آکر یہ درس حیات دیتا ہے کہ

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

اس مضمون کو مثنوی میں اس طرح بیان فرمایا ہے:-

برگ سبزے کز نہال خویش ریخت از بہاراں تار امیدش گسیخت
در خزاں اے بے نصیب از برگ و بار از شجر مگسل بامید بہار

امید — امید — اور ہر حالت میں امید — کبھی مایوس نہیں، کبھی افسردگی نہیں +

پھر اس گلچینی بہار میں وسعت داماں ملاحظہ فرمائیے:-

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قایم ہے شان تیری ــــ وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے :-

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ــــ ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

امید و آرزو کا ایسا متفاول فلسفہ حیات کم ہی کسی کے ہاں ملیگا +

اب جبکہ آرزوئیں پیدا ہوگئیں ۔ امیدیں وابستہ ہوگئیں ۔ نا امیدی کا چھلاوا غائب ہو گیا ۔ حزن و ملال کا بوجھ دل سے ہلکا ہوا ۔ تو حصولِ مدعا کے لئے فطرتی طور پر دل میں ایک تڑپ پیدا ہوئی ۔ یہاں پہنچکر اب یہ بتلانے کی ضرورت تھی کہ یاد رکھو کامیابی و کامرانی ۔ فتح و نصرت کا راز عمل اور قوت میں پوشیدہ ہے ۔ اور آرزو بغیر عمل کے بالکل مہمل چیز ہے ۔ چنانچہ یہ راز سربستہ کھول کے سامنے رکھدیا کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ــــ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مثنوی میں فرماتے ہیں :-

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات ــــ لذتِ تخلیق قانونِ حیات

قوت کی اہمیت کے متعلق ذیل کے دو مصرعوں میں جن حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے ۔ بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں بھی یہ مضمون سما نہ سکتا تھا ۔ ملاحظہ فرمائیے :-

زندگی کشت است و حاصل قوت است ــــ شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

پھر ارشاد ہے :-

مدعی گر مایہ دار از قوت است ــــ دعویٔ او بے نیاز از حجت است

باطل از قوت پذیرد شانِ حق ــــ خویش را داند از بطلانِ حق

یہ وہ معارف و حقائق ہیں جو کسی دلیل کے محتاج نہیں ۔ ملل و اقوام عالم کی تاریخ ۔ اور خود دورِ حاضرہ کے روزانہ مشاہدات اس کی زندہ مثالیں ہیں +

جب انہیں حقیقت سے آگہی، دل میں آرزو اور جوشش عمل اور بازوؤں میں قوت پیدا ہو گئی۔ تو ایک ایسا معیارِ حیات مقرر کر دیا جس سے زندگی کی خامیاں دور ہو کر اس میں پختگی پیدا ہو جائے۔ اور زندگی اس درجہ محکم و استوار ہو جائے کہ بڑے سے بڑا خطرہ اور مہیب سے مہیب حادثہ اس میں تزلزل نہ پیدا کر سکے۔ اس مقام پر قرآن حکیم نے فرمایا ہے کہ ولنبلونکم بشیءٍ من الخوف .... انا للہ وانا الیہ راجعون کہ دنیا میں تمہارے اوپر مختلف قسم کی آزمائشیں آئیں گی۔ منجملہ ان کے خوف و حزن، بھوک پیاس، نقص مال و جان وغیرہ ہونگی پس فتح و کامرانی کی خوشخبری ان کے لئے ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ہمت و استقلال سے کام لیتے ہیں۔ اور بے باکانہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری زندگی اور موت رنج و غم سود و زیاں جو کچھ بھی ہے سب اللہ کے لئے ہے۔ اور ہم سب کو بالآخر مرنا ہے۔ اور اسی کی طرف پلٹنا ہے۔

چنانچہ ایک ایسی ہی زندگی کا نقشہ علامہ ممدوح نے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

بہ مذہبِ زندہ دلاں زندگی ہمہ طلبی است　　　سفر بہ کعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

دوسری جگہ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں:-

مرا اے صاحبدلے ایں نکتہ آموخت　　　ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

بے باک زندگی کے متعلق فرماتے ہیں:-

دلِ بے باک را ضرغام رنگ است　　　دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحر است　　　اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

پوچھا گیا کہ رازِ حیات کس چیز میں ہے ..... جواب سن لیجئے:-

ز تیغش گفت اے یارِ خردمند　　　اگر خواہی حیات اندر خطر زی
خطر تاب و تواں را امتحان است　　　عیارِ ممکنات جسم و جان است

لائحۂ طور میں فرماتے ہیں :-

سکندر با خضر خوش نکتۂ گفت — شریک سوز و ساز بحر و بر شو
تو ایں جنگ از کنار عرصہ بینی — بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

بدریا غلط و با موجش در آویز — حیات جاوداں اندر ستیز است

(آپنے غالباً یہ تعلیم بھی سنی ہوگی — بدریا در منافع بے شمار است، وگر خواہی سلامت بر کنار است۔
اب ذرا اوپر والے شعر کو بھی دوبارہ ملاحظہ فرمائیے

خیال کن تو کجائی و ما کجا واعظ)

دوسروں کے آسرے پر زندگی کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں :-

مرا از شکستن چنیں عار ناید — کہ از دیگراں خواستن مومیائی

اسیطرح — نفس دارد و لیکن جاں ندارد — کسے کو بر مراد دیگراں زیست

یہ شعر تو یقیناً آج ہر مسجد کے محراب پر کندہ کرا دینا چاہئے — اور اس کے قطعات ہر مکان اور ہر دوکان میں آویزاں ہونا چاہئیں :-

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

اللہ اکبر کسقدر "زندگی" ہے اس پیغام کے اندر +

پھر جب زندگی اس قالب میں ڈھل جائے۔ قوم کی قوم اس رنگ میں رنگ جائے تو امیدوں کی جھلکتی دنیا کا تخیل کس جنت ارضی کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ سن لیجئے :-

زمیں از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے — فروغ خاک ما از نوریاں افزوں شود روزے — لاریب فیہ

یہ ہے مختصر آ بیان حیات ہمارے متفاول رموز شناس فطرت شاعر کا جس نے فی الواقعہ مسیحائی کا کام کیا ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ قوم کی حالت بدلنے کے لئے پہلے افراد ملت کی ذہنیت بدلنی ضروری ہوتی ہے تو بلا خوف تردید کہا جائے گا کہ آج تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اگر کچھ زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ تو یہ علامہ ممدوح مدظلہ العالی کے پیام حیات بخش کے رہین منت ہیں۔ آج اگر ان اشارات کی ابتدا ہے تو کل بعونہ تعالیٰ یہ شجر طیب اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء بنکر بڑھے پھولیگا۔ اور اسلام کی حیات جدیدہ میں علامہ موصوف کا نام درخشندہ ستارے کی طرح تابناک رہے گا ٭

اے کاش مُردوں کی یادگاریں قائم کرنے والی قوم اپنے زندہ افراد کی قدر کرنا بھی سیکھے ٭

حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

غلام احمد پرویز

علامہ اقبال ایک ریفارمر کی حیثیت میں

ایک وقت وہ تھا جبکہ مسلمانوں کے اقبال و کامرانی کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اور ہر فن کے حامیانِ کمال اسلام کے جھنڈے کے تلے جمع تھے۔ شیراز کی سرزمین نے سعدیؒ و حافظؒ جیسی ہستیاں پیدا کر کے اپنا سر آسمان پر پہنچایا۔ جام میں جامیؒ اور گنجہ میں نظامیؒ نے دبدبۂ خسروی بلند کر کے اپنے خداوندِ سخن ہونے کو منوا لیا۔ طوس کی قسمت جاگی کہ اس میں فردوسیؒ پیدا ہوا اور ہندوستان کے بھاگ کھلے کہ اس میں خسروؒ او فیضی جیسی ہستیوں نے جنم لیا۔ لیکن زمانہ کے ظالم ہاتھوں نے آخر وہ بساط الٹ دی اور اس بیاں شکن آسمان نے وہ پیمانہ توڑ دیا ؎

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

لیکن ہندوستان کو اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئیے۔ کہ وہ ایران سے زیادہ خوش نصیب ثابت ہوا۔ اس لئے کہ یہاں پھر ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ وہی آواز جو کبھی اس کے در و دیوار سے ٹکرا کر آسمان تک پہنچ گئی تھی۔ آج ایک اور ہی لب و لہجہ اختیار کر کے افسردہ دلوں میں شگفتگی اور مردہ دلوں کو زندگی کے سامان بہم پہنچا رہی ہے۔ اقبال ہمارے اسلاف کی نشانی۔ ہماری عظمتِ پارینہ کی یادگار نہیں نہیں ہماری گذشتہ اقبال مندی و خوش نصیبی کا آئینہ۔ ایسا آئینہ جس میں وہ شکلیں نظر آتی ہیں جن پر کبھی اسلام کو ناز تھا۔ آج مسلمانوں کی شان و شوکت کی یادگار کا ستارہ بن کر اُفقِ مشرق پر چمک رہا ہے ؏

میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ وہی شاعر جس نے چھٹی صدی ہجری میں مطلق العنان اور سرکش بادشاہوں کی نمرودیت کو مٹانے۔ اُن کے سروں کو خدائے واحد کی چوکھٹ پر جھکانے اور عامۃ الناس کی بے راہ روی کی

مسلمانوں کے لئے خوشی کا مقام ہے کہ ... مسلمانوں کی حالت پر رحم کر کے خداتعالیٰ نے اقبال کو ودیعت فرمائی ہے تاکہ اس کے ذریعہ ... اس خفتہ قوم کو بیدار کرے۔ بانگ درا بیشک بانگ درا ہے۔ اگر قافلہ والوں نے ... تو ... کے سہارے منزل پر پہنچنا ممکن ہے۔ اقبال نے ایک جگہ شاعر کو مخاطب کر کے کیا خوب لکھا ہے!

ہے اگر قوموں میں تیرے خامۂ معجز رقم　　شیشۂ دل ہے اگر تیرا مثال جام جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذ رحمانی ہے تو　　ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے　　خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

مگر اقبال کا زیادہ تر کلام فارسی میں اور وہ بھی فلسفیانہ رنگ میں ہے۔ اس لئے اکثر و بیشتر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں اور صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ ایک شاعر ہے اور نیچرل شاعری کا علمبردار۔ لیکن جو کچھ اقبال ہے وہ بہت کم جانتے ہیں۔ جیسا کہ عمر خیام کی نسبت اہل مشرق کو یہی معلوم تھا۔ کہ وہ ایک شاعر ہے۔ اور رباعی کا استاد۔ مگر جب اہل یورپ کی عقابی نظر نے اس کی وہ تصانیف دریافت کرلیں جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جملہ علوم کا ماہر۔ باکمال استاد تھا۔ اور رباعیاں محض تفریح طبع یا اظہار جذبات کے لئے کہ لیا کرتا تھا۔ تو مشرق والوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور چار و ناچار ماننا پڑا کہ بیشک عمر خیام بڑی شخصیت کا آدمی تھا +

یہی معاملہ آج اقبال کے ساتھ ہے۔ دوسروں کی شکایت نہیں جبکہ خود مسلمان جن کا درد وہ ازل سے اپنے ساتھ لایا ہے۔ اس کو محض ایک شاعر سمجھتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اس لحاظ سے بھی جیسا کہ اس کو سمجھنا چاہئے تھا ویسا نہیں سمجھا گیا۔ شاید ٹیگور کی شہرت اقبال سے کہیں زیادہ ہے۔ حالانکہ علمی اعتبار سے دونوں میں بین فرق ہے۔ ٹیگور کی تگ و تاز اس کے ایک خاص موضوع تک محدود ہے۔ یعنی اس نے قدرت کے وہ دلفریب مناظر جن میں سکون و خاموشی کی شان پائی جاتی ہو نہایت دلکش و موثر پیرایہ میں دکھائے ہیں۔ اور بس۔ چونکہ یورپ ایک عرصہ ہوا اس نعمت کو اپنی

پُر ہیجان زندگی کے نذر کر چکا تھا۔ اس لئے اُس نے تسلیم کیا کہ یہ بڑی چیز ہے۔ کبھی ہماری زندگی کا سامان تھی۔ اور ٹیگور ہماری اس حالت کا ترجمان ہے اور اس شہرت کے اسباب اُس کی قوم نے پیدا کئے۔ مگر اقبال نے وہ اصول یاد دلائے ہیں جن پر ہمارے عروج و ارتقاء کی بنیادیں قائم کی گئی تھیں اور جو اب بھی معراج کمال پر پہنچا سکتے ہیں بشرطیکہ ہم ان پر عمل پیرا ہوں۔ لیکن ہم نے اس کے لئے کچھ نہیں کیا۔ اس کا بجز اس کے اور کیا سبب ہو سکتا ہے کہ قوم میں سے مردم شناسی کا مادہ اُٹھ گیا اور قابلیت و استعداد جاتی رہی۔ جیسا کہ خود اقبال کہتا ہے ؎

خضر من داند کہ اسرار نیست یوسف من بہر ایں بازار نیست
قلزم یاران چو شبنم بے خروش شبنم من مثل طوفاں یم بدوش
نغمۂ من از جہانِ دیگر است ایں جرس را کاروانِ دیگر است

کون ہے جو فیضی کی جامعیت و ہمہ گیری کا معترف نہیں۔ مگر غالباً اس کو بھی اہل مشرق کی ذہنیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لئے اُس نے اس خوف سے کہ مبادا مجھے بھی لوگ شاعر سمجھ کر اُن مرتبہ سے گرا دیں۔ جس کا میں ازروئے کمالات مستحق ہوں۔ نل دمن میں ایک جگہ نہایت پُر زور الفاظ میں کہا ہے ؎

امروز نہ شاعرم حکیم دانندۂ حادث و قدیم

اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک حکیم اپنی طبیعت کی لطافت و ہمہ گیری کے سبب سے مسائل حکمت کو شاعری کے رنگ میں بیان کر سکتا ہے کہ اس سے وہ مسائل آسان بھی ہو جاتے ہیں اور دلنشین بھی مگر ایک شاعر جو فلسفہ اور حکمت سے قطعاً معرا ہے حکیم نہیں کہلا سکتا۔ خواہ کتنا ہی اعلیٰ پایہ کا شاعر کیوں نہ ہو۔ "حکیم وہ ہے جو نفس انسانی کو کمال تک پہنچانے کے لئے احوال موجودات کو بقدر طاقت بشری کی ٹھیک جاننے اور اس پر عمل کرے"۔ اقبال بھی ایک جگہ اسرار خودی میں کہتا ہے۔ کہ

کم نظر بیتابیٔ جانم ندید آشکارم دید و پنہانم ندید
آشنائے من ز من بیگانہ رفت از خمستانم تہی پیمانہ رفت

او ہدایت البری خواہد ز من　　رنگ و آب شاعری خواہد ز من
من شکوہ خسروی او را دہم　　تخت کسریٰ زیر پائے او نہم

گلستاں اور بوستاں کی تعلیم - اولاً مکتب سے شروع ہوئی لیکن رفتہ رفتہ جہاں تک لوگ سمجھتے گئے اور ان کتابوں کی حقیقت معلوم ہوتی گئی ان کی قبولیت اور ہر دلعزیزی ہی میں اضافہ ہوتا رہا - حتے کہ ایک وقت ایسا آیا کہ یہی کتابیں آئین سلطنت میں داخل ہوگئیں اور بادشاہوں نے ان کو پناہ دستورالعمل بنالیا - اور اس وقت جتنی مشہور زبانیں ہیں کم و بیش ان سب میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے - یہی مثنوی معنوی کا حال ہے - بلکہ مثنوی کے لئے تو یہانتک کہہ دیا گیا کہ ؎

مثنوی مولوی معنوی　　ہست قرآں در زبان پہلوی

میرا منشا یہ ہے کہ آیا ان مقدس ہستیوں کے لئے شاعر کا لفظ موجب فخر ہوسکتا ہے؟ اور کیا بوستاں اور مثنوی معنوی شاعری کے چٹخارے لینے کے لئے لکھی گئی تھیں ہرگز نہیں - ان بزرگوں کا کام شاعری نہ تھا جیسا کہ خود مولانائے روم فرماتے ہیں ؎

من ندانم فاعلاتن فاعلات　　شعر گویم لیک چوں آبحیات

بلکہ ان کا کام بنی نوع انسان کی اصلاح اور خدا کا راستہ بتانا تھا - جس کو قوت سے فعل میں لانے کیلئے شعر کی قوت تاثیر کو بہتر دکارآمد سمجھا - اس لئے ان لوگوں کو ایک شاعر کی حیثیت سے یاد کرنا اور اس اصل مقصد و غایت کو نظر انداز کردینا جو اس شاعری کے اندر پوشیدہ ہے - اس بات کی نمائش ہے - کہ ہم حقیقت و مجاز میں تمیز کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے - اسی طرح اقبال کو بھی نرا شاعر سمجھ لینا اپنی انتہائی کم نظری کا اظہار کرنا ہے *

میں اقبال کے کلام میں سے چند ایک مثالیں دیکر اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ اقبال کی موجودہ زمانہ میں نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ تمام ایشیا کو کس قدر ضرورت ہے *

(۱) اقبال کے کلام کا معتد بہ حصہ وہ ہے جس میں اس نے جدوجہد کوشش کی تعلیم دی ہے - اور بتایا ہے کہ

مصیبت اور تکلیف محض اعتبارات ہیں۔ بلکہ اگر غور سے دیکھئے تو یہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کی ہمیں و بقائے دوام کا باعث ہیں ؎

میاسا ز با بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش درآویز — حیات جاوداں اندر ستیز است

منشا یہ ہے کہ عیش و عشرت کی زندگی جو فی الحقیقت قوائے عمل کو بیکار و مفلوج بنا دیتی ہے دنیا بھر کی نحوست و بدنصیبی کا پیش خیمہ ہے بلکہ موت کا پیغام۔ اگر انسان کو حیات ابدی کی تلاش ہے اور نام و نمو کی تمنا تو اپنے آپ کو محنت و ریاضت کے نذر کر دینا چاہئے۔ اور مصائب و آلام کا جو ترقی کی راہ میں حائل ہوں سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں کر سکتا تو اس کو کوئی حق نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا شکوہ زبان پر لائے۔ اور فطرت کو جو لوث گناہ سے پاک ہے خطاوار ٹھیرائے۔ ایک جگہ زندگی کی تعریف اس طرح کی ہے ؎

بپرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست — گفتا مئے کہ تلخ تر او نکوتر است

ایک جگہ یہ بتایا ہے کہ خوف و اندیشہ سے ہر آسان کام مشکل اور ہمت و استقلال کے آگے مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے

دل بیباک را ضرغام رنگ است — دل ترسندہ را آہو پلنگ است

اگر بیمے نداری بحر صحرا است — اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

ایک مقام پر کہا ہے۔ کہ پروانہ اپنے تئیں ایک دفعہ شمع پر نثار کر کے زندگی کی کشاکش سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ ہیچ ہے میں تو اس پروانہ کو پروانہ جانتا ہوں جس کی جان سخت کوش اور شعلہ نوش ہے ؎

بھلی افسانۂ آں پارچہ راغے — حدیث سوز او آزار گوش است

من آں پروانہ را پروانہ دانم — کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است

(۲) اقبال کے نزدیک سکون کا نام موت ہے یعنی انسان کو ایک حالت پر نہیں رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس دنیا کائنات میں مکانی سکون موجود ہے ؎

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است بخاک تو شرار زندگی نیست

ایک جگہ پیام مشرق میں کہا ہے کہ جس طرح موج جب تک دریا سے پیچ و تاب میں ہے اور جب پیچ و تاب نہیں تو موج ہی نہیں۔ معلوم ہوا کہ پیچ و تاب اور بیقراری ہی کا نام موج ہے۔ اسی طرح انسان کی حیات اس کی تگ و تاز اور سکون نا آشنا رہنے میں ہے۔ نہ کہ راحت طلبی اور تن آسانی میں۔

ایک دوسری جگہ اس خیال کو کس قدر بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ ساحل نے جو بالکل جامد و ساکن ہوتا ہے موج سے پوچھا کہ میں نے ایک دور دراز عمر پائی ہے۔ لیکن ابتک معلوم نہ کر سکا کہ میں کیا ہوں۔ موج نے جو ساکن رہنا ہی نہیں جانتی نہایت تیزی سے چلا کر کہا کہ اے ساحل! میری حقیقت تو مجھے معلوم ہو گئی اور وہ یہ ہے کہ اگر میں حرکت میں ہوں تو ہوں اور نہ کچھ بھی نہیں۔

(۳) اقبال جہد و کوشش کے ساتھ علم کا ہونا لازم سمجھتا ہے۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست جز بعلم انفس و آفاق نیست
گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کجا این خیر را بینی بگیر

یعنی زندگی کسی قوم کا حصہ نہیں بلکہ جو قومیں زیور علم سے آراستہ اور محنت کی خوگر ہیں انہیں کو دنیا میں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ علم کی اہمیت واضح کرنے کے لئے ایک نہایت عمدہ دلیل پیش کی ہے۔ کہ

سید کل صاحب ام الکتاب پردگیہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عین ذات را بے پردہ دید رب زدنی از زبان او چکید

دنیا کی تمام ترقی یافتہ قومیں اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیم کے اندر ہی دینی و دنیوی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔

بس قوم میں جہالت کے آثار پیدا ہو گئے سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ وہ قوم صفحۂ ہستی پر کچھ دنوں کی مہمان ہے۔ زمانہ بہت جلد نقش باطل کی طرح اس کو مٹا کر خدا کی زمین کو اس کے وجود سے پاک کر دیگا۔ امریکہ اور یورپ پر اس حقیقت کا اچھی طرح انکشاف ہو گیا ہے کہ ان ممالک میں تعلیم کی وہ گرم بازاری ہے۔ کہ آج یہاں بے علم ایسا ہی کمیاب ہے۔ جیسا ہندوستان میں تعلیم یافتہ۔ اسلام نے تیرہ سو برس پہلے ہی تعلیم دی تھی اور حصول علم کو ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض کر دیا تھا۔ اقبال کہتا ہے کہ

علم و دولت نظم کار ملت است   علم و دولت اعتبار ملت است

مگر موجودہ زمانہ میں جہاں تعلیم کا دور دورہ ہے وہاں اخلاقی اور سچی اخلاقی تعلیم کا سرے سے خاتمہ ہے۔ حالانکہ اخلاقی اور وہ اخلاقی تعلیم جس کی بنیادیں خلوص سچائی اور ایثار پر قایم کی گئی ہوں نظام عالم اور اصلاح کے لیئے ناگزیر ہے۔ اقبال کا دل اس تعلیمی کمزوری کو کیونکر محسوس نہ کرتا۔ اُس نے محسوس کیا اور بہت زیادہ محسوس کیا۔ وہ تعلیم کو بُرا نہیں کہتا۔ مگر اس کے نزدیک قدیم اسلامی تعلیم سے بیزاری اور موجودہ تعلیم میں شغف ایسی حالت میں کہ اس سے اخلاقی اور سوشل زندگی کی اصلاح نہ ہو اضاعت اوقات بلکہ گمراہی کا موجب ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا   ہے خون فاسد کے لئے تعلیم مثل نیشتر
رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے   واجب ہے صحرا گرد پر تعمیل فرمان خضر
لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری   رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

اقبال نے مذہب کے عنوان سے مرزا بیدل کے شعر پر تضمین کی ہے جس کا مفاد یہ ہے۔ کہ فلسفۂ مغرب کی تعلیم ہے کہ جو ایک ہستی غائب (خدا) کی تلاش میں ہیں وہ نادان ہیں۔ اور اس فلسفہ کی رو سے شیخ اور برہمن دونوں صنم تراش ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ برہمن کا پیکر معبود ظاہر کرتا ہے اور شیخ کا فرضی اور غائب۔ اقبال کہتا ہے کہ ان علوم جدیدہ سے جن کی بنا محسوس و مرئی اشیاء پر ہے عقائد

مذہبی کا سنگِ بنیاد قرار پا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس تعلیم کی رو سے مذہب و جنون میں کوئی فرق نہیں مگر فلسفہ حیات اس سے پہنچتا ہے۔ اور مجھ پر ایک مرشدِ کامل (مرزا) نے اس راز کو اس طرح فاش کیا ہے ؎

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش

(۴) اقبال کی نمایاں خصوصیت اس کی وسیع المشربی ہے۔ وہ تمام بنی نوع انسان سے محبت کرتا اور چاہتا ہے کہ اس کا پیغام عالمگیر اخوت حاصل کر کے تمام اقوام کو ایک برادری بنا دے اور اس طرح ایک اور ہی دنیا قایم ہو جائے۔ جہاں صرف محبت و مساوات کی حکومت ہو۔ اقبال کہ توحید کا فرزند اور اس مذہب کا حلقہ بگوش ہے جس کی تعلیم ہے۔ الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ۔ پھر وہ امتیازِ ملت و قوم اور تعصب و رنگ و نسل کو کیونکر گوارا کرتا جیسا کہ وہ کہتا ہے ؎

آزاد ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے
بستہ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں نوعِ انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں

بلکہ اقبال بنی نوع انسان سے ہمدردی کرتے کرتے بیجان چیزوں سے بھی ہمدردی کرنے لگتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک

حقیقت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو کہ ناری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

وہ کہتا ہے ؎

صدمہ آ جائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر

(۵) اقبال نے اعتمادِ نفس پر زور دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ انسان کی کمزوری اس کی حقیقت ناشناسی کا نتیجہ ہے۔ اگر اس کو اپنے علوِ مرتبہ و کمالِ ذاتی کا علم ہو جائے تو دنیا میں کوئی کام اس کے لئے مشکل نہیں ؎

اگر آگاہی از کیف و کمِ خویش یمے تعمیر کن از شبنمِ خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے شبِ خود را برافروز از دمِ خویش

ضمیرِ کن فکاں غیر از تو کس نیست — نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بیباک‌تر نہ در رہِ زیست — بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

(۶) علم نفسیات کا عالم اچھی طرح جانتا ہے کہ فرد واحد کا وجود ایک اعتباری شے ہے۔ مگر جب چند افراد مل کر ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو ان کی قوت۔ ان کا وقار اور ان کا اعتبار کہیں نہ بڑھ جاتا ہے۔ غرضیکہ جماعت۔ قوم کو بڑی طاقت حاصل ہے اور فرد کی جماعت سے علیحدہ کوئی وقعت نہیں۔ اقبال نے ربطِ ملت کے سلسلہ میں اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ کسی قوم کا وقار قائم نہیں ہو سکتا۔ جبتک کہ اس کے افراد میں وحدتِ خیال، وحدتِ عقائد اور وحدتِ مقاصد کے ذریعہ رابطۂ اتحاد پیدا نہ ہو جائے۔ اور مسلمانوں کا ایک مرکز اور ایک مقصد ہے اور وہ ان کا مذہب ہے ؎

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں — جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

مگر ہم نے اس دور میں مغربی تعلیم و طرزِ معاشرت سے متاثر ہو کر مذہب کو خیرباد کہہ دیا۔ اور یہ سمجھ لیا کہ بس کامیابی و ترقی اسی قوم کا حصہ ہے جس کے پاس جملہ مادّی اسباب موجود ہوں۔ اور جن کا کوئی مذہب نہ ہو۔ اگر ہو تو پالیٹکس، سیاسیات اور ملوکیت۔ اقبال کس قدر دلنشین پیرایہ میں سمجھاتا ہے ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

---

(۷) اقبال مسلمان کو آزادی اور مسلمانی کو حریت سے تعبیر کرتا ہے۔ اسکی تعلیم ہے کہ مسلمان کو خیال، قول اور فعل میں غرضیکہ ہر طرح اپنے آپ کو آزاد سمجھنا چاہئے اور ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست + پیش فرعونے سرش افگندہ نیست + پر یقین کامل رکھتے ہوئے اس معبود حقیقی کے سوا کسی کو اپنا آقا اور مختار نہیں بنانا چاہئے۔

از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری

اقبال کا خیال ہے۔ اور خیال کیا معنی فیکٹ ہے کہ مسلمان اگر سچا مسلمان ہے تو کسی حالت میں دوسری دنیوی طاقتوں سے مغلوب نہیں ہو سکتا چنانچہ تاریخ عالم شاہد ہے کہ ان مٹھی بھر صحرا نشینوں نے جنکے پاس نہ کوئی ساز و سامان تھا۔ نہ کوئی سلطنت۔ محض اپنے اتحاد اور روحانی قوت سے بڑی بڑی طاقتوں کو سرنگوں کر دیا۔

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے وہ کیا تھا؟ زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زور بازو کا! نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

غرضکہ اقبال کے نزدیک مسلمان ایک ایسی ہستی ہے جسکی بلندی مرتبہ و رفعت شان کے آگے آسمانوں کی بلندی بھی پست دکھائی دیتی ہے۔

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ستارے جسکی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اور نظام عالم اسی کے ہاتھ میں ہے۔ بلکہ انتہا ہے۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

---

(۸) اقبال کا ایک خاص موضوع حیات بعد الممات ہے۔ جس کو اس نے فلسفیانہ دلائل و براہین کے ساتھ نہایت منظم طریق پر بیان کیا ہے۔ اس کے متعلق میں خود اقبال کے الفاظ نقل کرتا ہوں جو مجھے ملے

حیات بعد الممات کے ساتھ خاص دلچسپی رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انسان ایک شاندار اور درخشاں مستقبل اپنے سامنے رکھتا ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ انسان نظام کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے۔ یہ عقیدہ میرے خیالات و افکار میں آپ کو عموماً جاری و ساری نظر آئیگا۔"

(۹) اقبال کا ایک مستقل موضوع مسئلہ خودی ہے۔ خودی سے اس کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کی حقیقت ایک ہے۔ اور انسان جب اس سے واقف ہو جاتا ہے تو ہر چیز میں اپنی ہی صورت جلوہ گر دیکھتا ہے۔ اقبال نے بتایا ہے کہ نظام عالم کی اصل خودی سے ہے اور حیات تعینات کا تسلسل استحکام خودی پر منحصر ہے۔ لیکن اوّل اپنی خودی (حقیقت) سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔ اور چونکہ حیات عالم کا انحصار قوت خودی پر رکھا گیا ہے۔ اس لئے جسقدر یہ استوار ہوگی اسیقدر زندگی دیرپا مستحکم اور عزیز تر ہوگی۔ اور حیات خودی تخلیق و تولید مقاصد سے وابستہ ہے یعنی انسان کے مقاصد بلند اور آرزو مستقل ہونی چاہئے اس لئے کہ اصل زندگی آرزو ہے۔ یعنی اگر انسان کے دل میں آرزو باقی ہے تو وہ قوی دل، بلند حوصلہ اور خوش و خرم ہے۔ محنت و مشقت میں اس کو مزا آتا ہے لیکن جب آرزو مر جاتی ہے تو دل مردہ۔ حوصلے پست اور زندگی بے لطف ہو جاتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ مقصد پاکیزہ اور آرزو ارفع و اعلیٰ ہونی چاہئے۔ اقبال کہتا ہے کہ مسلمان کے لئے عشق رسولؐ کافی ہے۔ اس کو اپنا دل اس تمنا سے آباد کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس سے بہتر کوئی مقصد نہیں ہوسکتا +

اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ کسی کے آگے دست سوال پھیلانے سے خودی ضعیف ہو جاتی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ محض خدا پر بھروسہ رکھے۔ اور کسی کا زیر بار احسان نہ ہو +

(۱۰) اقبال کا ایک موضوع بیخودی ہے۔ بیخودی کے معنے ہیں اپنے آپ کو جماعت میں ملا دینا یعنی فرد کا اپنے احساسات کو جماعت کے مقصد وحید کے اندر فنا کر دینا۔ کیونکہ فرد کے لئے جماعت میں داخل ہونا آیۂ رحمت ہے۔ اور اپنی ہستی کو جماعت سے جدا نہ سمجھنا عین کمال۔ یعنی جس طرح قطرہ دریا میں ملکر دریا ہو جاتا ہے اسیطرح فرد جماعت میں داخل ہو کر جماعت کی قوت، جماعت کا بقا اور جماعت کے اوصاف سے متصف

ہو جاتا ہے :۔

فرد تا اندر جماعت گم شود　　　قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

غرضکہ اقبال نے جو کچھ لکھا ہے اُس پر بالاستیعاب تبصرہ کرنا مشکل نہ سہی لیکن اس مختصر مضمون میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا آسان نہیں۔ میرا منشا اور صرف منشا یہ ہے کہ اقبال شعرائے سلف کی طرح حسنِ لب بام کا شیدائی یا کمر یار کی تحقیق کا سودائی نہیں۔ بلکہ وہ ایسی ہستی ہے کہ اُس کے علو مرتبہ و کمال ذاتی ہی نے ابتک اُس کی حقیقت کو پردہ میں رکھا اس لئے کہ جو دل و دماغ وہ لے کر آیا ہے۔ اور جس تمدن جس اخلاق اور جس تہذیب کی وہ ترجمانی کرتا ہے۔ اُن کے چاہنے والے دنیا سے اُٹھ گئے جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ؎

اب نوا پیرا ہے کیا گلشن ہوا برہم ترا　　　بے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال کا پالیٹکس سے قطعی ناواقف ہوتے ہوئے سیاسی معاملات میں حصہ لینا اُس کے لئے بھی اور قوم کے لئے بھی مضر ثابت ہوگا۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو خدا نے ایسی کتاب عطا کی ہے جسمیں دینی و دنیوی دونوں زندگیوں کے ہر پہلو کو بطریق احسن بیان کیا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے مسلمان کو کسی دوسری چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے ؎

ملتے را رفت چوں آئیں ز دست　　　مثل خاک اجزائے او از ہم شکست
ہستی مسلم ز آئین است و بس　　　باطن دین نبی این است و بس
تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست؟　　　زیر گردوں سر تمکین تو چیست؟
آں کتاب زندہ قرآن حکیم　　　حکمت او لایزالی است و قدیم
نسخۂ اسرار تکوین حیات　　　بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

لیکن اس کو سمجھنے کے لئے قابلیت درکار ہے۔ اقبال ایک مسلمان اور خالص مسلمان ہے۔ اور قرآن پر اس کا کامل ایمان ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی پالیٹکس اس جامع و مانع کتاب سے باہر نہیں ہوسکتی

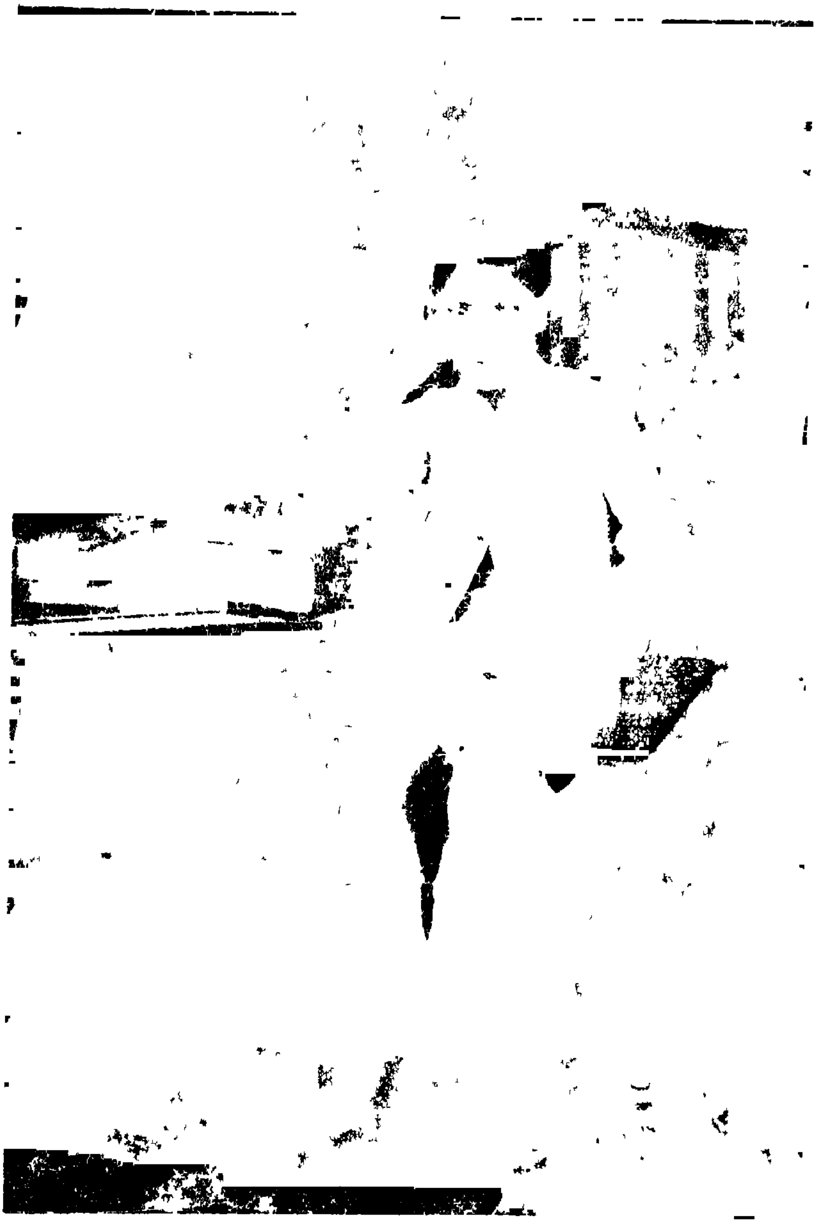
اگر نگاہ حقیقت بیں ہو تو اس کے ایک ایک حرف میں دنیا کی حکمت اور دانشوری کے ہزاروں باب دیکھ سکتی ہے۔

اور یوں دیکھئے تو آج جسقدر مشاہیر اہل الرائے نظر آتے ہیں۔ ان میں کوئی بیرسٹر ہے اور ایم اے اور کوئی ڈاکٹر ہے۔ مگر اقبال بیرسٹر بھی ہے اور ایم اے پی ایچ ڈی بھی۔ ڈاکٹر بھی ہے اور شاعر بھی۔ حکیم بھی ہے اور صوفی بھی۔ ریفارمر بھی ہے اور فلسفی بھی۔ نجوم بھی جانتا ہے اور سنسکرت بھی۔ اگر ایک طرف اقتصادیات و معاشیات کا زبردست ماہر ہے تو دوسری طرف علم نفسیات کا زبردست اُستاد۔ اگر قدیم فلسفہ میں کمال رکھتا ہے تو فلسفۂ جدید میں بھی اُس کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ تاریخ اسلام ہی کا حافظ نہیں۔ تاریخ عالم بھی اس کو ازبر ہے جس کی فلسفہ دانی کو دیکھتے ہوئے جرمنی والوں نے ڈاکٹر کا علمی درجہ دیا۔ اور جس کی ادبی کاوش کی قدر کرتے ہوئے سرکار انگریزی نے سر کا ممتاز خطاب عطا فرمایا جس کی شاعری کا یہ حال کہ داغ نے دو ایک غزلیں دیکھ کر ہی سمجھ لیا تھا کہ اس کا شاگرد کوئی معمولی شعر گو نہیں جس کی طبیعت داری قابلیت اور درد اسلام کو دیکھ کر شبلی و حالی جیسے مبصر تاڑ گئے تھے۔ کہ یہ ایک فتنہ ہے اور بہت جلد قیامت بن جائیگا اور جس کی شہرت کے اُٹھتے ہوئے شباب کو دیکھ کر مسٹر آرنلڈ جیسے اُستاد کو فخر تھا۔ کہ اقبال دنیا میں بڑا اقبال لے کر آیا ہے۔ اس کے نام کے ساتھ میرا نام بھی روشن ہوگا۔ غرضکہ مشاہیر وقت میں سے ہر ایک نے اس جوہر قابل کی شخصیت کا جداگانہ حیثیت میں اپنی نظر قابلیت اور رسائی فہم کے مطابق اعتراف کیا ہے۔ رہے کم استعداد اور کج فہم لوگ اُن کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست!!

جب اقبال ایسا ہے اور فی الواقعہ ایسا ہی ہے تو انصاف فرمائیے کہ آیا سیاسیات کے اسٹیج پر اس سے بہتر کوئی دوسرا شخص پارٹ کر سکتا ہے؟ لیکن چونکہ اختلاف رائے ہمیشہ اعلےٰ و افضل شخصیتوں کا جزو لاینفک رہا ہے۔ اس لئے ہم کو اس قسم کی تضاد رائے سے افسوس نہیں بلکہ ہمارے خیال میں نہایت درجہ تقویت اور استحکام ہوتا ہے۔ اور اقبال کے بلند مرتبہ شخصیت

ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ اقبال کی شہرت کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔ اور عنقریب سمت الراس پر پہنچکر شکوک و شبہات کی تاریکیوں کو دور کرکے دنیا کو اپنی روشنی سے جگمگا دیگا۔ اور لوگوں کو اذا جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا کا منظر آنکھوں سے دیکھنے میں آجائیگا۔

سیّد محمد عبدالرشید فاضل



"جاوید نامہ"

حضرت اقبال مدظلہ نے ۱۹۲۹ء کی ابتدا میں جاوید نامہ لکھنا شروع کیا۔کم و بیش تین سال کے بعد یعنی اب ۱۹۳۲ء میں یہ کتاب چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

"جاوید نامہ" دراصل "معراج نامہ" ہے اور حقائق معراج محمدیہ پر کتاب لکھنے کا ایک مدت سے حضرت علامہ کا خیال تھا۔کتاب کا نام بجائے "معراج نامہ" کے "جاوید نامہ" رکھنے کی محرک دو تین باتیں ہوئیں۔اسلام کی بہت سی اور باتوں کی طرح مسلمانوں نے حقیقت معراج پر بھی بہت کم غور کیا ہے۔دراصل "گلشن راز جدید" کی طرح علوم حاضرہ کی روشنی میں معراج کی شرح لکھ کر ایک قسم کا "معراج نامہ جدید" لکھنے کا خیال تھا۔یہ "معراج نامہ" بہت ممکن ہے عام شرحی انداز تحریر میں ہوتا اور اپنی موجودہ "آسمانی" ڈرامہ کی شکل اختیار نہ کرتا۔لیکن اس اثنا میں اٹلی کے مشہور شاعر ڈینٹے کی کتاب "ڈیوائن کامیڈی" پر بعض نئی اور اہم تحقیقات یورپ میں شائع ہو چکی تھیں جنہیں اس حقیقت کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا گیا کہ "ڈیوائن کامیڈی" کے آسمانی ڈرامے کا تمام پلاٹ بلکہ اس کے بیشتر تفصیلی مناظر ان واقعات پر مبنی ہیں اور اُن کی نقل ہیں جو اسلام میں معراج محمدیہ کے متعلق بعض احادیث و روایات میں مذکور ہوئے یا بعد میں بعض مشہور متصوفین و ادبا کی ان کتابوں میں درج ہوئے جن میں اُنہوں نے مختلف نقطہائے خیال سے خود اپنے معراجوں کا ذکر کیا یا معراج نبوی کی شرح لکھی۔ایک حد تک اس واقعہ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ بجائے عام تشریحی انداز میں "معراج نامہ" لکھنے کے جو وسعت مضامین کے لحاظ سے یقیناً حقائق معراج کے مباحث ہی تک محدود رہتا۔ڈینٹے کے انداز میں ادبی (عرفانی نہیں) نقطۂ نگاہ کو "معراج اقبال" لکھا جائے۔جس میں قید مباحث

سے آزادی ہو اور تخیل وہ ایک "تاویل و تفسیر" کی محدود وسعتوں سے گذر کر فکر و بصیرت اور اختراع و الہام کی ان لا محدود فضاؤں تک پرواز کرنا چاہیں جہاں تک نہ کر سکیں۔ "جاوید نامہ" اور "ڈیوائن کامیڈی" یہ مرکب۔ الفاظ ایک دوسرے کے مترادف نہیں (غالباً جیسا کہ آئندہ بیان کیا جائے گا ایسا بنانا فرض ہی تھا) تاہم بادی النظر میں ایک معنوی سی مناسبت دونوں ناموں میں موجود ہے۔ حضرت علامہ کے فرزند ارجمند عزیزی "جاوید اقبال" سلمہ کا نام بھی کسی حد تک "جاوید نامہ" ہونے کا ذمہ دار ہے۔ لیکن ان خاص معنوں میں "جاوید نامہ" کتاب کا وہ آخری حصہ ہے جو آسمانی ڈرامہ کے خاتمہ کے بعد بطور ضمیمہ آیا ہے اور جس کا نام "خطاب بہ جاوید" (سخنے بہ نژاد نو) ہے

"ڈیوائن کامیڈی" کا نام "ڈیوائن کامیڈی" خود ڈینٹے کا تجویز کردہ نہیں۔ ڈینٹے نے اپنے آسمانی ڈرامے کا نام محض "کامیڈیا" رکھا تھا۔ لفظ "ڈیوائن" (پاک۔ الہیہ۔ آسمانی) کتاب کے نفس مضمون۔ اسکی خوبی۔ اسکی شہرت و ہر دلعزیزی کی بنا پر ڈینٹے کے قدردانوں اور مداحوں کی طرف سے بعد میں زیادہ کیا گیا۔ ڈینٹے کی موت ۱۳۲۱ء میں واقع ہوئی۔ "کامیڈیا" کے جس سب سے پہلے ایڈیشن کا نام "ڈیوائن کامیڈی" رکھا گیا وہ ۱۵۵۵ء میں چھپی۔ اگرچہ خود ڈینٹے کو ڈیوائن کہنا اس کے مداحین نے ۱۵۱۲ء ہی میں شروع کر دیا تھا۔

مشرق کے لوگ اگرچہ ابھی اس حقیقت سے بے خبر ہوں۔ اہل مغرب پر ہسپانیہ کے بعض مستشرقین کی جدید تحقیقات سے اب یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ ڈینٹے کی "ڈیوائن کامیڈی" کا ماخذ اولاً وہ احادیث نبوی ہیں جن میں معراج کی کیفیات بعض صورتوں میں باختلاف تفصیلات مروی ہیں۔ ثانیاً وہ کتب تصوف و ادب اسلامیہ جن میں اسرار معراج نبوی پر روشنی ڈالنے کے علاوہ بعض صورتوں میں مصنفین نے خود اپنی سیاحت علوی اور مشاہدہ تجلیات کا ذکر کیا ہے۔ مؤخر الذکر میں محی الدین ابن عربی کی مشہور کتاب "فتوحات مکیہ" اور ابوالعلا معرّی کی تصنیف "رسالۃ الغفران" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میڈرڈ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر آسن جو اس نہایت اہم انکشاف کے بانی ہوئے۔ اپنی معرکۃ الآرا کتاب "اسلام اینڈ ڈیوائن کامیڈی"

ہیں لکھتے ہیں:۔

"جب ڈینٹے الیغیری اپنی اس حسرت انگیز نظم کا تصور اپنے ذہن میں لایا اس سے کم از کم چھ سو سال قبل اسلام میں ایک مذہبی روایت موجود تھی جو محمد (صلعم) کی مساکن حیات مابعد کی سیاحتوں پر مشتمل تھی۔ رفتہ رفتہ آٹھویں صدی سے لیکر تیرھویں صدی عیسوی کے اندر اندر مسلم محدثین علما مفسرین۔ صوفیا۔ حکما اور شعرا سب۔ نے مگر اس روایت کو ایک مذہبی تاریخی حکایت کا لباس پہنا دیا۔ کبھی یہ روایتیں شروح معراج کی شکل میں دہرائی جائیں۔ کبھی خود راویوں کی واردات کی صورت میں اور کبھی ادبی اتباعی تالیفات کے انداز میں۔ ان تمام روایات کو ایک جگہ رکھ کر اگر "ڈیوائن کامیڈی" سے مقابلہ کیا جائے تو بہت سے مشابہ مقامات خود بخود سامنے آجائیں گے۔ بلکہ کئی جگہ بہشت و دوزخ کے عام خاکوں انکے منازل و مدارج۔ تذکرہائے سزا و جزا۔ مشاہدہ مناظر۔ انداز حرکات و سکنات افراد۔ واردات و واقعات سفر۔ رموز و کنایات۔ دلیل راہ کے فرائض اور اعلیٰ ادبی خوبیوں میں مطابقت تامہ نظر آئے گی"۔

پروفیسر آسن نے احادیث معراج کو باعتبار اسناد تین زمانوں میں تقسیم کرکے ہر زمانہ کی روایت کے تفصیلی اختلاف کو قصہ معراج کے ارتقا کا موجب قرار دیا ہے لیکن اس امر کو ذکر کرکے کہ رسول عرب سے پہلے بھی بعض پیغمبروں کے متعلق معراج کی روایتیں موجود تھیں بلکہ ارداویراف کی ایرانی بہشت کی سیر کے قدیم افسانے بھی ذکر ہوتے تھے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ "ان سیاحتوں و معراجوں میں کوئی بھی اتنا واضح وسیع اور مکمل نہ تھا جسقدر کہ اسلامی روائت اپنے لٹریچر میں تھی۔ اس کے علاوہ اسلامی روایت ہر عالم و جاہل مسلمان کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ اور اسکو صحیح تسلیم کرنا اس کے ایمان کا جزو تھا۔ آج اسوقت بھی تمام اسلامی دنیا میں معراج پیغمبر کا دن مذہبی تہوار کا دن سمجھا جاتا ہے۔ اور ٹرکی مصر مراکش جیسے اسلامی ممالک میں اس روز قومی تعطیل منائی جاتی ہے۔ اسی سے واضح ہے کہ پیغمبر (علیہ السلام) کی معراج کے واقعہ میں مسلمانوں کا عقیدہ کسقدر راسخ ہے"۔ پروفیسر آسن نے اگر خود اسلامی دنیا کی

ری ہوتی اور مسلمانوں کی تہذیب پر اس کے اثر پر غور بہ نظر
کیا ہوتا تو یوں کو معلوم ہوتا کہ معراج پیغمبرؐ کی روایت
لمانوں کے عقیدہ اور تصوّر پر اتنا تسلط ہے کہ
زمان دنیا میں ایسی نہ ہوگی جسے تمام طور پر مسلمان
تے ہوں اور اس زمانے میں معراج نامہ موجود نہ ہو بلکہ
دیکھو تو مسئلہ معراج مسلمانوں کی سیاسیات
پر اثر انداز ہوا۔ معراج جسمانی تھی یا روحانی
اختلاف پر لڑائیوں تک نوبت پہنچی +

روایتِ معراج کے مختلف پہلو

راج کا مذہبی اور علمی پہلو تو یہی ہے جیسے مشاہدۂ
ذات (یعنی Direct Vision) کہنا
ہے۔ اور جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو
ب ہوا +

دوسرا پہلو وہ ہے جسے تصوف کا پہلو کہنا
ہے۔ صوفیا کا معراج بھی دراصل ایک قسم کا
در مذہبی پہلو رکھتا ہے۔ مختلف صوفیا نے
ف رنگوں میں تجلّی ذات کے مشاہدہ کا ذکر کیا
تصوف ان طریقوں کا نام ہے جن سے براہِ
ست معرفتِ ذاتِ باری کے حصول کی کوشش
کی جاتی ہے۔ اور جو لوگ ان طریقوں کے اختیار
میں تجلی ذات کے پرتو سے بہرہ یاب ہوئے
اُنہوں نے بعض اوقات اس حصولِ مقصد کو معراج
سے تعبیر کیا۔ اعاظم صوفیہ میں حضرت بایزید بسطامی
اور محی الدین ابن عربی کا معراج عام مشہور ہے۔
حضرت بایزید بسطامی کے معراج کے کیفیات تو شاید
قلمبند ہی نہ ہوئیں لیکن محی الدین ابن عربی نے
"فتوحات مکیہ" میں اپنے معراج پر دفتر کے دفتر
لکھے ہیں۔ اور سیاحت علوی میں دو افراد کو اپنا
راہنما اور ساتھی بنا کر جن میں سے ایک فلسفی ہے
اور دوسرا عالم دین۔ ان کی زبان سے تمام دنیا
جہان کے علوم و فنون اور مسائل و مباحث کے
متعلق اس انداز میں اظہار خیالات فرمایا ہے کہ گویا
یہ سب خیالات وہ انکشافات و الہامات ہیں جو ان
کے قلب پر معراج میں وارد ہوئے۔ خالص عرفانی
ہونے کی بجائے محی الدین ابن عربی کا معراج زیادہ
تر مذہبی ہے۔ سیاحت آسمان اور مشاہدۂ ذات
کے حقائق بے حد تفصیلات سے دئے ہیں تاہم مذہبی
اور اخلاقی مباحث میں جس قدر توجہ صرف ہوئی ہے
وہ عرفانی مباحث کی صورت میں نہیں۔ مناظر

واقعات، کیفیات، مشاہدات کم و بیش ایسی ترتیب میں ہیں جس میں معراج پیغمبر، تاہم تفصیلات کو سریکا نے تصویر کو اس کامل صورت میں پیش کیا ہے۔ کہ ڈینٹے کے نقاد کو "ڈیوائن کامیڈی" کا تمام نقشہ "فتوحات مکیہ" کے انہیں ابواب کا چربہ نظر آتا ہے جس میں معراج کا ذکر ہے +

معراج کا تیسرا پہلو خالص ادبی (Literary) اور آرٹسٹک (Artistic) ہے۔ ادبی پہلو ضروری نہیں کہ اخلاق اور مذہب کی جھلک سے بالکل معرا ہو۔ مشہور عربی نابینا شاعر ابو العلا معرّی کا "رسالۃ الغفران" اسی ادبی پہلو کا حامل ہے یہ رسالہ ابو العلا معرّی نے اپنے ایک شاعر اور ادیب دوست ابو القارح حلبی کے ایک خط کے جواب میں رقم کیا جس میں ابو القارح نے باوجود ابو العلا کا مداح ہونے کے اُس پر طنز کے پیرایہ میں ان شعرا اور ادبا کو مورد عتاب الٰہی قرار دیا تھا جنھوں نے گنہگاری کی زندگی بسر کی ہو۔ ابو العلا نے رسالۃ الغفران میں ادبی رنگ میں اپنی بہشت و دوزخ کی سیر دکھائی اور وسعت رحمت ذات کو واضح کرنے کے لئے کئی بدکاروں گنہگاروں اور جاہلیت کے شعرا کو جنہوں نے بالآخر مرنے سے پہلے توبہ کر لی تھی مغفرت و رحمت کا سزاوار ہوتے اور جنّت میں داخل ہوتے دکھایا۔ پروفیسر آسن کا خیال ہے کہ "ڈیوائن کامیڈی" کی بعض ادبی خوبیاں "رسالۃ الغفران" کے خصوصیات کی شرمندۂ احسان بھی ہیں۔ رسالۃ الغفران میں نہ صرف بعض قدیم و ہمعصر شعرا وغیرہ کے کلام پر تنقید ہے۔ بلکہ علمائے لغت وغیرہ سے ملاقات کے دوران میں بعض لغوی مسائل پر بحثیں بھی ہیں +

اسیطرح شہرزوری کا ایک قصیدہ سفر روح کے متعلق ہے۔ جس کو ابن خلکان نے نقل کیا ہے اور وسٹن فیلڈ نے ترجمہ کر کے شایع کیا ہے +

ممکن ہے اسلامی لٹریچر میں اور بھی کئی کتابیں ایسی ہوں جنہیں معراج کے عرفانی اور ادبی پہلوؤں کے نمونے کہا جا سکے۔ لیکن اس کے متعلق تحقیق کی ضرورت ہے۔ یوں معراج نبوی کے اسرار و حقائق کا تذکرہ اسلامی لٹریچر میں قریباً ہر بڑے مصنف کی کسی نہ کسی تصنیف میں ملیگا۔ اسلامی مصنفات پر ایک زمانہ میں یہ رنگ بھی غالب رہا ہے کہ حمد باری تعالیٰ کے بعد جب نعت پیغمبر لکھنے

پرحصہ ... ملا تو اس نے معراجِ رسول اللہ پر علیحدہ مفصل باب لکھا۔ نظامی کا "پنج گنج" اٹھا کر دیکھئے قریباً ہر کتاب میں یہ خصوصیت ملیگی +

مغرب میں معراج کی روایت

پروفیسر آسن کی تحقیق کے مطابق معراج کی روایت مغرب میں ہسپانوی علما و صوفیائے اسلام کے ذریعہ پہنچی۔ ڈینٹے کی "ڈیوائن کامیڈی" کو معراج کے ادبی بیانوں کا دوسرا بڑا نمونہ کہنا چاہیئے۔ یہ امر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا محقق ہے کہ ڈینٹے نے محی الدین ابن عربی کی کتاب "فتوحات" سے بہشت و دوزخ و اعراف اور ان کی تمام منازل و مناظر کو نقل کیا۔ اسی طرح تمام علوم مروجہ پر اپنی سیر کے دوران میں بحثیں کیں۔ البتہ سیاسی اور تاریخی واقعات وغیرہ کی بحث سے اپنی کتاب کی خوبیوں کو بڑھایا اور اپنے ماخذوں کا ذکر نہ کرکے ایک آنیوالے طویل زمانہ یورپ پر اپنی شاعرانہ و حکیمانہ خوبیوں کا سکہ بٹھا لیا۔ "فتوحات" اور "ڈیوائن کامیڈی" کا مقابلہ اس مضمون کو غیر متعلق اور طویل مباحث میں لے جائیگا۔ ورنہ بتایا جا سکتا تھا کہ جو لوگ مغرب میں بڑے بڑے ادبی۔ علمی اور سیاسی انقلابات پیدا کر گئے۔ وہ اسلامی علوم و تہذیب سے کسقدر خوشہ چینی کے بعد اس قابل ہوئے۔

جاوید نامہ۔ روایت معراج کا تیسرا ادبی نمونہ

اسلامی روایت معراج کے دنیا میں مشہور ہونے سے چھ سو سال بعد ڈینٹے نے اپنے تخیلی معراج کے مشاہدات کی صورت میں اس زمانہ کے علوم و فنون پر تبصرہ۔ مغربی عیسائی اقوام کی مذہبی اور اخلاقی کمزوریوں پر جرح اور سیاسیات یورپ کے صحیح کوائف کا وہ مرقع اہلِ مغرب کے سامنے کھینچا کہ نصف ربع مسکون کی اُس وقت کی نسلوں کے دل و دماغ۔ اخلاق و عادات اور احساس و شعورِ حیات میں وہ ہیجان رونما ہوا۔ جو تھوڑا ہی عرصہ بعد یورپ کی عام علمی و سیاسی نشاۃ ثانیہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ڈینٹے کی موت سے تقریباً پورے چھ سو سال کے بعد اقبال کا "جاوید نامہ" اہلِ مشرق کے سامنے حال کی مقتضیات و ترقیات کو مدنظر رکھتے ہوئے قریباً انہیں مباحث و مقاصد کو پیش کرکے اس حصہ دنیا میں ویسے ہی انقلابات کا پیش خیمہ ہونیوالا

ہے۔ "جاوید نامہ" کو ہم روایت اسلام معراج کا تیسرا اہم ادبی نمونہ کہیں گے۔ ممکن ہے اسے چھ سو سال کے عرصہ میں کسی اور مسلم صوفی یا شاعر نے بھی اس موضوع پر کچھ لکھا ہو لیکن جہاں تک ہم کوشش کر سکے ہیں عام "معراج ناموں" کے سوائے جن کی حیثیت قصے کہانیوں سے ہے۔ زیادہ نہیں کوئی قابل ذکر تصنیف اس مبحث پر دستیاب نہیں ہو سکی ۔

معراج نبوی۔ فتوحات مکیہ اور ڈیوائن کامیڈی

"فتوحات" اور ڈینٹے کے آسمانی ڈرامے میں جو عام مماثلت ہے اس پر اب کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ دونوں تصانیف میں جس خاص فرق کی طرف یہاں اشارہ کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ "فتوحات" کا مصنف خود صوفی اور صاحب حال تھا۔ اس کی تصنیف اس کے اپنے مکاشفات واردات اور روحانی و عرفانی تصرفات کا آئینہ ہے۔ اس کی بناء محض تخیل یا آرٹ نہیں۔ ڈینٹے نے "فتوحات" کی پیش کردہ تصویر کے قریباً ہر خط و خال کو اپنے موقلم کی نگارش کی صورت میں پیش کیا۔ لیکن یہ کارنامہ ایک بہترین ادبی تصنیف کے رتبے سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ باقی یہ امر کہ بلحاظ نتائج اس کی خوبیاں بعض مقاصد میں نئی نوع کے ایک کثیر گروہ کے دل و دماغ پر "فتوحات" کی نسبت زیادہ دور رس اثر ڈال گئیں۔ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ حیات مابعد الموت کی حقیقتوں کے تجسس میں ابن عربی اور ڈینٹے دونوں نے سات ستاروں (بعض صورتوں میں نو) کی سیر سے گذر کر بہشت و دوزخ اور اعراف کی فضاؤں کے نقشے کھینچے ہیں۔ اور اصلاً ان کو اسی طرح تصور کیا ہے جس طرح وہ احادیث نبوی میں بیان ہوئے۔ سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ معراج نبی میں اقصیٰ سے لیکر سدرہ و آسمان سے پار جانے تک میں کسی درمیانی فلک یا ستارہ کی سیر کا ذکر نہیں۔ البتہ بعض احادیث میں واپسی کے موقعہ پر بعض ستاروں کی سیر کا ذکر ہے۔ معراج نبوی کا عام ذکر لکھنے والے مدارج عروج ہی میں سیر سیارگان کو لے آتے ہیں۔ مگر یہ قصے زیادہ تر کمزور احادیث پر مبنی ہیں۔ یا ان کا ماخذ محی الدین ابن عربی کی "فتوحات" ہوتی ہے ۔

فتوحات، ڈیوائن کامیڈی اور جاوید نامہ

"جاوید نامہ" کو "ڈیوائن کامیڈی" اور "فتوحات" سے دو باتیں ممیز کرنے والی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس میں وہ تخیلی مظاہرات و تعبیرات (Symbolisms) ناپید ہیں جو ان میں ہر مقام پر ملتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے آج تک ان کے بعض مباحث عقدۂ لاینحل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ دوسری یہ کہ اقبال نے زیادہ تر سیارگان (وہ بھی سات نہیں بلکہ چھ) کی سیاحت پر اکتفا کی ہے۔ دوزخ و اعراف کے نزدیک تک نہیں گیا۔ بجائے ساتویں سیارہ میں پہنچنے کے "آنسوئے افلاک" جا نکلا ہے۔ اور یہ غالباً اس لئے کہ "جنت" اور "حضور" و "تجلی" . . . . . . کے ہیے تصورات اور نئے مقاصد و معانی دنیا کے سامنے رکھنے مطلوب تھے۔ "ندائے جمال" کی سماعت کا شوق بھی کچھ کم کشش کا باعث نہ تھا۔ "کلیم اللّٰہی" تو تھی لیکن "سمیع اللّٰہی" میں کیا باک ہو سکتا تھا +

جن لوگوں کو واصل جہنم دکھانے کی ضرورت تھی اُن کو "فلک زحل" کے ایک قلزم خونیں میں مبتلائے عذاب دکھا دیا ہے۔ اور وہ ایسے لوگ ہیں جو خالص مذہبی یا اخلاقی نقطۂ خیال سے مجرم و گنہگار ہوں۔ بلکہ وہ ایسی ارواح رذیلہ ہیں جو ملک و ملت سے غداری کی مرتکب ہوئیں۔ اور جن کو دوزخ نے بھی اپنے اندر لینا قبول نہ کیا ؟

"فتوحات" اور "ڈیوائن کامیڈی" حیات بعد الموت کے حقائق و کیفیات کی دریافت معلوم کرنے کی مساعی ہیں۔ معنوی اعتبار سے دونوں جدا ہیں۔ ایک عام مذہبی عرفانی مشاہدات کی حامل۔ دوسری علمی ادبی اور سیاسی نکات پر زیادہ حاوی۔ افراد کے اذہان اخلاق کی شائستگی دونوں کا نصب العین ہے۔

"ہُم صوفی" اور "ڈراما نویس" اپنی توجہ مختلف مقاصد کو پیش نظر رکھ کر حیات مابعد پر ہی مرکوز رکھتے ہیں اقبال کہ حیات مابعد (آخرت) کا مسئلہ بوجہ ایک مسلم عالم و حکیم ہونے کے اس کے لئے بہت پیش پا افتادہ ہو چکا ہے۔ اپنی زیادہ تر توجہ حیات حاضرہ یا حیات مطلق یا بالفاظ دیگر بجائے حیات انسانی کے مسئلہ پر صرف کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ بات اسقدر اہم نہیں کہ مرنے کے بعد بہشت و دوزخ یا اعراف میں انسانوں کی زندگی کیسی ہوگی۔ جس بات نے اسکو تمام عمر پیچ و اضطراب میں رکھا ہے۔ وہ یہی موجودہ حیات انسانی ہے۔ جو اقوام مشرق کے لئے بوجہ ان

یاسی و اقتصادی پستی کی موت سے بدتر ہو چکی ہے اور جس کے پاکیزہ ارتقاکی ضرورتوں سے اہل مغرب بوجہ اپنے مذہبی روحانی اور اخلاقی انحطاط و تنزل کے غافل ہو چلے ہیں۔ اور وہ وقت قریب ہے کہ ایک ایسی دنیاوی قیامت سے بہت جلد دوچار ہونا پڑے جو مشرق و مغرب دونوں کی موجودہ نسلوں کو تباہ و ہلاک کرکے تمام دنیا میں ایک نئی نسل اور ایک اہم مقصد واحد قوم کے ظہور و فروغ کے لئے میدان صاف کر جائے۔ بقاء و دوام حیات انسانی کے مباحث بھی اشارہ کرتے ہیں کہ اقبال نے اس تصنیف کا نام "جاوید نامہ" کیوں رکھا۔

احادیث معراج ۔ فتوحاتِ مکیہ ۔ ڈیوائن کامیڈی اور جاوید نامہ اگر پہلو بہ پہلو بہ نظرِ امعان مطالعہ کئے جائیں تو شاید وہ تمام فرقِ مراتب سامنے آجائے جس سے نبی ۔ ولی ۔ شاعر ۔ فلسفی ۔ اور فلسفی شاعر کو متمیز کیا جاسکتا ہے۔

جاوید نامہ کے بعض اہم مباحث

پیشتر اس کے کہ مختصراً "جاوید نامہ" کے بعض اہم مباحث کا ذکر کیا جائے۔ کتاب کے دیباچہ کا جو صرف دو اشعار پر مشتمل ہے یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس سے شاید انسانی زندگی کا وہ نصب العین قارئین کے سامنے آجائے جس کے مطابق شاعر یہ سمجھتا ہے کہ منزلِ آخرت میں قدم رکھنے سے پیشتر ممکن ہے حیاتِ انسانی ابھی زمین کی طرح اور ستاروں کو بھی آباد کرے۔ یا اُن کے آباد کرنے کے بعد دوامِ ابد کی طرف انتقال سے پہلے اس زمینی ستارہ میں بطورِ آخری منزل کے وارد ہوتا ہے کہ یہ خیال موجودہ سائنس کے ان انکشافات پر مبنی ہے جن کے مطابق مریخ وغیرہ ستاروں میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ دیباچہ میں صرف یہ دو شعر ہیں:-

خیالِ من بتماشائے آسماں بود است
بدوشِ ماہ و بآغوشِ کہکشاں بود است
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است

چونکہ خود احادیثِ معراج میں بعض اجرامِ سماوی کے اندر حیاتِ انسانی کا ممکن ہونا ان ملاقاتوں کی وجہ سے پایا جاتا ہے۔ جو پیغمبرِ خدا نے معراج سے واپسی کے وقت مختلف انبیاءِ کرام سے کیں۔ اس لئے شاعر کا

یہ تخیل محض سائنس کے تصورات پر مبنی نہیں کیا جا سکتا۔ خود محی الدین ابن عربی نے بہشت و دوزخ سے پہلے سیارگان کی سیاحت اپنے ان مکاشفات میں کی ہے جو انہیں مصر کے دوران قیام میں حاصل ہوئے اور جن کو "فتوحات مکیہ" کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ پیغمبر خدا کی معراج کے سلسلہ میں بجائے سیارگان کے "افلاک" کا ذکر ہے۔ اقبال نے غالباً اسی نکتہ کو ملحوظ رکھ کر جاوید نامہ میں قمر، عطارد و مشتری وغیرہ کو "فلک" کا نام دیا ہے +

مناجات اور اقبالی شکوے

کتاب "مناجات" سے شروع ہوتی ہے لیکن ایسی مناجات کہ اقبال ہی کی زبان سے ادا ہو سکتی تھی۔ حقائق حیات کے متعلق متفسرانہ انداز میں ذات باری کو مخاطب کرنا جیسا اقبال کو آیا شاید اولیائے خاص کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ ہر شعر، ہر مصرع تعلق ولایت پر دال ہے ناممکن ہے کہ شکوہ کا مصنف شکوہ کے اعادہ سے تھک جائے۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب تک اپنے مقاصد کو حاصل نہ کریگا۔ خدا کا دامن نہ چھوڑیگا۔ مشہور اقبالی شکوے اس مناجات میں آگئے ہیں +

"جہان ہفت رنگ" میں آدمی کی "ہم نفس" سے محرومی سب سے پہلی شکایت ہے۔ یہ موجودہ جہان اس کو راس نہیں آیا +

آرزوئے ہم نفس می سوزدش
نالہ ہائے دلنواز آموزدش
لیکن ایں عالم کہ از آب و گل است
کے تواں گفتن کہ دارائے دل است

یہ "لیل و نہار" کی دنیا پسند نہیں۔ اس کے متعلق پہلا طعنہ دیا تھا کہ

ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

اب مناجاتی التجائیں ہیں کہ اس "جہان چارسو" کی بجائے جس کا وجود ایک دوسرے سیارہ کے وجود کا محتاج ہے وہ جہاں عطا کر جس پر "رفت و بود" کا اطلاق نہ ہو

اے خوش آں روزے کہ از ایام نیست
صبح او را نیم روز و شام نیست
اے خدا روزی کن آں روزے مرا

وارہاں زیں روزِ بے سوزے مرا

گویا اس مکانی "وقت" سے وہ بیزار ہے اور
اس نئی قسم کے "روز" کا متمنی ہے جس کی شان یہ
ہو ؎

روشن از نورش اگر گردد رواں
صوت را چوں رنگ دیدن می تواں
غیبہا از تابِ او گردد حضور
نوبتِ او لا یزال و بے مرور!

پھر سب سے بڑا شکوہ ہے کہ جس ہستی کی شان میں
آیۂ تسخیر نازل کی۔ جسکے دید کا متوالا سپہر نیلگوں کو بنایا
جسے اس داں "علم الاسما" کیا۔ گویا تمام عالم سے
جس کو برگزیدہ کرکے اپنے رازِ دروں کا محرم تک
بنایا اور خود حکم دیا کہ ہر چیز مجھ سے مانگ۔ اسی سے
خود اپنی ذات کو حجاب میں رکھا۔ مشاہدہ تجلی ذات
کی عاشقانہ بیتابی کا اس سے بڑھ کر مظاہرہ کیا
ہوگا ؎

اے ترا تیرے کہ ما را سینہ سفت
حرف ادعونی کہ گفت و با کہ گفت؟
روئے تو ایمانِ حق قرآنِ من
جلوہ داری دریغ از جانِ من؟

از زبانِ صد شعاعِ آفتاب
کم نمی گردد متاعِ آفتاب

علم و عقل کی نعمتیں کافی ہیں۔ جس چیز کی طلب اور
آرزو ہے اور وہ مٹتی نہیں۔ وہ دیدِ ذات ہے +

بے تجلّی زندگی رنجوری است
عقل مہجوری و دیں مجبوری است

عقل و دین اور معرفت یا مشاہدہ ذات کے
فلسفوں اور بحثوں میں پڑنے کا یہ مقام نہیں
مضمون کے طویل ہو جانے کا ڈر ہے صرف
اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حصولِ معرفت (Religious Experience) جس کا بار بار
ذکر حضرت علامہ کے کلام میں آتا ہے۔ اسوقت
فلسفہ نفسیات کا ایک اہم مبحث ہے جس پر
اعلیٰ پایہ کے محققین کی توجہ مبذول ہو رہی ہے
اور جو ممکن ہے کہ عام تجربہ اور مشاہدہ کی طرح ایک
دن علم حقہ کے حصول کا عام ذریعہ بن جائے +

حصولِ ابدیت کی آرزو کو پھر ایک دفعہ
دُہرایا ہے اور کہا ہے ؎

آنیم من جاودانی کن مرا
از زمینی آسمانی کن مرا

اور آخیر میں دنیاوی الجھنوں کو چھوڑ کر پھر وہی تقاضے کئے ہیں۔ کہ تم انہیں عطا کر جس میں زندگی کا وہی شرارہ پیدا ہو جو میرے سینہ میں ہے جو میرے طوفان میں اس طرح لپیٹے جائیں کہ پھر میری حدود سے باہر نہ نکل سکیں:

جرم ما از کم آشوبی خطاست
آنکہ در قوم فرا زاید کجاست؟

پرانوں سے بظاہر ناامیدی ہے۔ آئندہ نسلوں کو اپنے سینے سے لپٹنے کی تمنا کے ساتھ اس دعا پر مناجات کو ختم کیا ہے کہ الٰہی عہد حاضر کے نوجوان میری باتوں کو سمجھیں:

من کہ نومیدم ز پیران کہن
دارم از روزے کہ می آید سخن!
بر جوانان سہل کن حرف مرا
بہر شاں پایاب کن ژرف مرا

تمہید آسمانی

مناجات کے بعد "تمہید آسمانی" میں آسمان کی زبان سے زمین کو یہ طعنہ دیا ہے:

خاک اگر الوند شد جز خاک نیست
روشن و پایندہ چوں افلاک نیست

اس طعنہ کو سن کر زمین خجل ہوئی جاتی تھی اور اپنے "درد بے نوائی" کا شکوہ خدا کے سامنے پیش کرتی تھی کہ "ز آسیب گردوں" تسلی کی یہ صدا آئی:

اے امینے از امانت بے خبر
غم مخور اندر ضمیر خود نگر
سرشتہ از روح جاں نقش امید؟
نور جاں از خاک تو آید پدید!
عقل آدم بر جہاں شبخوں زند
عشق او بر لامکاں شبخوں زند

تمہید زمینی

"تمہید آسمانی" کے بعد "تمہید زمینی" آتی ہے۔ نظم کا یہ حصہ خاص طور پر اہم ہے۔ اس میں سیاحت سماوی کا آغاز ہوتا ہے۔ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو خیال ہوگا کہ "تمہید زمینی" پہلے اور "تمہید آسمانی" بعد میں ہونی چاہیے تھی لیکن چونکہ ایک "زمینی" آسمان کی تسخیر کو روانہ ہونے والا تھا۔ اس لئے آسمان کی زبان سے پہلے زمین کو طعنہ دلا دیا۔ اور پھر اسکے بعد اس کی تسخیر پر کمر باندھی +

"تمہید زمینی" کے اخیر پر مولانا روم کی زبان سے جو سیرِ افلاک میں شاعر کے راہنما بنے ہیں اسرارِ معراج نبوی کی شرح کی گئی ہے۔ معراج کے جسمانی یا روحانی ہونے کا مسئلہ ابتدا ہی سے مابہ النزاع چلا آتا ہے۔ اقبال نے اس کی تشریح ایک خاص ندرت سے کی ہے۔

آسمانی سیر کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ شاعر "تشنہ" اور "دور از کنار چشمہ سار" مولانا روم کی ایک غزل بے اختیار گانے لگتا ہے۔ جس کے مفصلہ ذیل دو اشعار "اسرار خودی" کے سب سے پہلے ایڈیشن کے سرورق کے اندر کی طرف چھپے تھے اور جن کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ایک طرح فلسفہ خودی کی ضرورت کی تائید کے لئے کتاب "خودی" کی بسم اللہ سے پہلے چھاپا گیا ؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اس اثنا میں شام ہو جاتی ہے۔ آفتاب غروب ہو جاتا ہے لیکن شام متاع آفتاب سے ایک "پارہ" اُڑا کر اسے کوکب کی صورت میں اُفق پر نمایاں کرتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

روحِ رومی پردہ ہا را بر درید
از پسِ کُہ پارۂ آمد پدید

شاعر اس کی طلعت درخشندہ اور پیکر روشن سے کچھ عرصہ دنگ رہنے کے بعد اپنے فلسفیانہ سوالات اس پر کرتا ہے کہ "موجود" و "ناموجود" کیا ہے "محمود" و "نامحمود" کے کیا معنی ہیں۔ جب اپنے جوابات کے دوران میں مولانا روم کی روح اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
مردِ مومن در نسازد با صفات
مصطفےٰ راضی نشد اِلّا بذات

شاعر کی روح بھڑک اٹھتی ہے۔ دید ذات کا شوق مضطرب کرتا ہے۔ سوال ہوتا ہے کہ ذات تک رسائی کیسے ہو؟ ؎

باز گفتم پیشِ حق رفتن چسان؟
کوہ و خاک و آب را گفتن چسان

جواب کیا ملا؟ ــــ جس طرح ایک "پیدائش" سے

آدمی دنیا میں آتا ہے۔ اسی طرح ایک اور "پیدائش" سے باہر بھی جا سکتا ہے:-

گفت اگر "سلطان" ترا آید بدست
می توان افلاک را از ہم شکست
نکتہ الّا "بسلطان" یاد گیر
ورنہ چوں مور و ملخ در گل بمیر
از طریقِ زادن اے مردِ نکوے
آمدی اندر جہانِ چار سوے
ہم بروں جستن بزادن می توان
بند ہا از خود گشادن می توان

سوال و جواب کا سلسلہ آگے چلتا ہے۔ مولانا روم اس "زادن" کی تشریح فرماتے ہیں۔ عشق کی قوت و برہانِ مبین کے کرشموں کا ذکر ہوتا ہے۔ مکان و زمان پر قابو پانے کے طریق بتائے جاتے ہیں۔ "نہ آسمان" اور "فراخائے جہان" کے خوف سے بے نیاز ہو جانے کی تلقین کی جاتی ہے زمان و مکان کی حقیقت بتائی جاتی ہے کہ

این دو یک حال است از احوالِ جاں

جان و تن کے صحیح تعلق کا راز بتایا جاتا ہے۔ اور ان تمام مقدمات کے بعد اخیر کے چند اشعار میں جو سوال جواب ہوتے ہیں ان میں معراج کا نکتہ خود بخود واضح ہو کر پیش نظر آجاتا ہے ؎

چیست جاں؟ جذب و سرور و سوز و درد
ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد!
چیست تن؟ با رنگ و بو خو کردن است
با مقامِ چار سو خو کردن است
از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق
وا رہاند جذب و شوق از تحت و فوق

ایں بدن با جانِ ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

اس مکالمہ کے بعد شاعر کے تن کا ہر ذرہ پرواز افلاک کے لیے سیماب کی طرح بے تاب ہو جاتا ہے زمان و مکان کی روح جس کا نام شاعر نے "زروان" رکھا ہے۔ ایک بادل کے پردے سے فرشتے کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ اور اس کو کہتی ہے کہ میں "زروان" ہوں۔ تمام جہان زمین و آسمان پر میرا قاہری کا تسلط ہے ؛

نظم کے اس حصہ میں شاعر نے زمان و مکان کے

موجودہ تخیلات اور اُن کی اس حقیقت پر جو قرآنی آیات اور احادیث سے پیدا ہے عجب شاعرانہ فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

محی الدین ابن عربی اور نیٹشے دونوں کا آغاز سیاحت ایک پہاڑ کے قرب سے ہوا۔ اتفاق ہے کہ اقبال کے سامنے بھی روحِ رومی ایک پہاڑ کے عقب ہی سے نمودار ہوتی ہے۔

فلک قمر اس کے بعد معراج کا فلسفہ نہیں بلکہ خود شاعر کا اپنا معراج شروع ہوتا ہے۔ فلک قمر سب سے پہلے آتا ہے۔ رومی اس دنیا کے ہولناک کہسار شاعر کو دکھاتا ہے۔ پھر کو دونوں جاتے ہیں تو قمر کے ایک غار میں سب سے پہلا ہندوستان کا ایک قدیم عارف ملتا ہے جسے اہلِ ہند "جہاں دوست" کے نام سے پکارتے ہیں۔ جہاں دوست "وشوامتر" کا ترجمہ ہے۔ "وشوامتر" "رام" کا اُستاد تھا۔ اثنائے گفتگو میں "جہاں دوست" مولانا روم سے سوالات کرتا ہے کہ عالم کیا ہے۔ آدم کیا ہے۔ حق کیا ہے۔ رومی دو شعروں میں نہ صرف عالم و آدم اور حق کا کنہ بتا جاتا ہے بلکہ "عالم" و "حق" کے متعلق شرق و غرب کے رجحانات کی حقیقت بھی کھول کر رکھ دیتا ہے ؎

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن
عالم این شمشیر را سنگ فسن
شرق حق را دید و عالم را ندید
غرب در عالم خزید از حق امید

جہاں دوست ان حقائق کو تسلیم کرتا ہے۔ مانتا ہے کہ مشرق وجود و عدم کے مسائل میں آج تک پھنسا رہا۔ لیکن وہ اس کے مستقبل سے نا اُمید نہیں۔ بتاتا ہے کہ کل قشمر دو (فلک قمر کا ایک پہاڑ) کی چوٹی پر ایک فرشتہ آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی نگاہ سے ذوقِ دیدار ٹپکتا تھا۔ اور وہ نگاہ صرف ہمارے خاکدان (مشرق) پر بندھی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ اس "خاک خموش" میں تجھ کو اب کیا نظر آتا ہے۔ کہیں پھر کسی زہرہ کے جمال پر تو نظر نہیں۔ لیکن اس نے جواب کیا دیا۔ اپنی ٹکٹکی باندھنے کی وجہ کیا بتائی ع

گفت "ہنگامِ طلوعِ خاور است
آفتابِ تازہ اورا در بر است
رستخیزے در کنارش دیدہ ام
لرزہ اندر کوہسارش دیدہ ام

عرشیاں را صبح عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشم ملتے!

"روشن اختر" کی زبان سے یہ پیغام مشرق اور بالخصوص ہندوستان اور اہل ہند کے نام لانا اقبال ہی کا حصہ تھا +

اس کے بعد وادی یرغمید میں شاعر اور اُسکا راہنما داخل ہوتے ہیں۔ اس وادی کا نام فرشتوں کی زبان میں وادی "طواسین" ہے۔ منصور حلاج کی مشہور تصنیف کتاب الطواسین فرانس میں طبع ہو چکی ہے۔ طٰس قرآن کریم کی ایک سورت کا نام ہے۔ اور قرآن کے حروف مقطعات میں سے ہے۔ منصور حلاج کی جدت کوشی کا یہ کمال تھا کہ اس نے اپنی تصنیف کے مختلف حصوں کو بجائے ابواب میں تقسیم کرنے کے ان کا نام طواسین (طٰس کی جمع) رکھا۔ بالکل اسیطرح جیسے کوئی مصنف لفظ "لوح" یا "منزل" بمعنی باب یا فصل استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ پاس ادب مانع تھا کہ پیغمبروں سے بالمشافہ ملاقات کی جاتی اس لئے شاعر نے اس امر پر اکتفا کی ہے کہ بجائے ان سے مل کر گفتگو کرنے کے ان کی "طواسین" یا بالفاظ دیگر الواح فلک قمر میں پڑی ہوئی دکھائی ہیں جن کے کتبوں میں سے ہر ایک کی تعلیم کا اہم پہلو واضح ہو گیا ہے۔ طواسین رُسل میں چار طواسین شامل ہیں۔ طاسین گوتم جسکا عنوان ہے "توبہ آوردن زن رقاصہ عشوہ فروش"۔ طاسین زرتشت جس کا عنوان ہے "آزمائش کردن اہرمن زرتشت را" طاسین مسیح (رویائے حکیم طالسطائی۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ مغربیوں نے دور حاضرہ میں عیسائیت کا کیا حال کیا ہے) طاسین محمدؐ (نوحہ روح ابوجہل در حرم کعبہ۔ کعبہ کے بتخانہ سے حرم بن جانے پر ابوجہل کا یہ نوحہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے)

فلک عطارد

زاں بعد شاعر اور اُس کا راہنما فلک عطارد میں پہنچتے ہیں۔ یہاں جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی روحوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ افغانی سے تعارف کراتے وقت رومی بتاتا ہے کہ میرے ساتھی کا نام "زندہ رود" ہے (Living Stream) زندہ رود کو افغانی اسلامی ممالک اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کے متعلق سوال کرتا ہے۔ زندہ رود جواب دیتا ہے پھر افغان اپنے جواب میں دین و وطن کا صحیح مفہوم بتاتا

ہے۔ اشتراک و ملوکیت دونوں طلسموں کا پردہ
چاک کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

زندگی ایں را خروج آں را خراج
درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج!

سعید حلیم پاشا شرقیوں اور مغربیوں کے فطری
اختلاف پیدا کرنے کے بعد کہتا ہے کہ افرنگیوں
کا شعلہ اب "نم خوردہ" ہو چکا ہے۔ ان کی آنکھ
اگرچہ تیز ہے لیکن دل مردہ ہے۔ مصطفیٰ کمال
پاشا نے جو یورپ کی نقالی شروع کی ہے اس
سے ترک اپنے اصلی مرکز سے ہٹ جائے گا۔
ترک اس وقت جو اپنی طرف سے نئی باتیں
پیدا کر رہے ہیں۔ وہ وہی ہیں جو یورپ میں پرانی
ہو چکی ہیں +

سعید حلیم کا ترک کے نام پیغام یہ ہے ؎

چوں مسلماناں اگر داری جگر
در ضمیر خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است
گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندہ مومن ز آیاتِ خداست
ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

زندہ رود کو شکایت ہے کہ قرآن تو موجود ہے۔
لیکن کوئی نہیں جانتا کہ عالمِ قرآن کہاں ہے۔
اس کا جواب افغانی کی طرف سے آتا ہے محکمات
عالمِ قرآنی کی حقیقت بیان کی جاتی ہے:-
(۱) خلافتِ آدم۔ (۲) حکومتِ الٰہی (۳) ارض
مالکِ خداست (۴) حکمت خیر کثیر است۔ یہ چار
باتیں بطور محکمات و اصول قرآنی کے پیش کی گئی ہیں
طوالت کا خوف ہے۔ کیونکہ یہ مضمون اپنی حد سے
پہلے ہی زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ ورنہ ان میں ہر بحث
ایک مستقل رفیع تحقیق و تشریح کا مقتضی ہے +

اس کے بعد افغانی نے ملت روسیہ کے نام
پیغام دیا ہے۔ اس پیغام کی حقیقت کی طرف اشارہ
کرنے کے لئے اس سے بہتر کچھ نہیں کہ چند اشعار نقل کر
دیئے جائیں ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی
دل ز دستورِ کہن پرداختی

ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں
قیصریت را شکستی استخواں
تا بر افروزی چراغے در ضمیر
عبرتے از سرگذشت ما بگیر
پا بخود محکم گذار اندر نبرد
گرد ایں لات و ہبل دیگر مگرد
کردۂ کار خداوندان تمام
بگذر از لا جانب الا خرام
اے کہ میخواہی نظام عالمے
جستۂ او را اساس محکمے؟
داستان کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از ام الکتاب
با سیہ فاماں ید بیضا کہ داد؟
مژدۂ "لا قیصر و کسریٰ" کہ داد؟
جز بقرآں ضیغمی روباہی است
فقر قرآں اصل شاہنشاہی است

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردک زرکش مجو
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا
از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!
کس نداند لذت قرض حسن!
از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ
رزق خود را از زمیں بردن رواست
ایں "متاع" بندہ و ملک خداست
بندۂ مومن امیں، حق مالک است
غیر حق ہر شے کہ ایں ہالک است
رایت حق از ملوک آمد نگوں
قریہ ہا از دخل شاں خوار و زبوں
آب و ناں ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم "کنفس واحدہ"

س کے بعد اشتراکی نقطۂ نگاہ سے قرآن
کے چند حقائق بیان فرمائے ہیں۔ ملوک
ا قریہ ویرانی۔ ربوا کی حرمت۔ الارض للہ۔
ن تنالوا البر حتی تنفقوا کی تشریح کی ہے ~

فلک زہرہ

شاعر کی "جان پاک" "شنو" سے "بے سوئی" کی طرف پرواز پر پرواز کیے جاتی ہے۔ ایک جہان میں مرکر دوسرے میں جا نکلنا دوسرے سے گذر کر تیسرے میں جا نکلنا اس

کی فطری بے تابیوں کا خاصہ ہے۔ اور آخر
اس کا منتہا کیا ہے ؎

می کند پرواز در پہنائے نور
مخبلش گیرندۂ جبریل وحور!
تا ز "مازاغ البصر" گیرد نصیب
بر مقامِ "عبدہ" گردد رقیب

مقامِ "عبدہ" "ہزر اقامت" کا مسئلہ کسی شاعر
کے اس لطیفہ شعر سے زیادہ کہیں حل نہ ہوا ہوگا ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسمی

سواد زہرہ میں، جو نظر سب سے پہلے آتا ہے۔ وہ
خدایانِ اقوامِ کہن کی مجلس ہے۔ بعض نام حقیقی ہیں
اور بعض شاعر کی طباعی نے خود تراش لئے ہیں ؎

بعل و مردوخ و یعوق و نسر و فسر
رمن و لات و منات و عسر و غسر

ان میں سے ہر ایک اپنے از سرِ نو زندہ ہو جانے
کے امکان پر ثبوت لا رہا ہے۔ اور اس بات
سے کہ یہ عہد پھر بے "خلیل" اور "بے بت شکن"
ہو چکا ہے ؎

بر قیامِ خویش می آرد دلیل　　از مزاجِ این زمانِ بے خلیل

بعل ایک نغمہ گاتا ہے۔ یہ نغمہ نوحہ روح ابوجہل
(طاسین محمد در فلک قمر) کا جواب سمجھنا چاہئے
بتخانۂ کعبہ کو "حرم" میں متبدل دیکھ کر ابوجہل
چلا اٹھا تھا ؎

سینۂ ما از محمد داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود
نوجواناں را ز دستِ ما ربود

اسلام کی موجودہ پستی کی کوئی حد ہے! ابوجہل
کائنات سے اپیل کرتا ہے (خدا تو اس کا کوئی
ہے نہیں) کہ محمد (صلعم) سے بدلہ لے۔ اس لئے
کہ بقول ابوجہل ؎

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خوان نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند
آبروئے دودمانے ریختند

انہی [illegible] محمد کی [illegible] بعثت" نے جہاں
[illegible] شکست دی ہے۔ وہاں اب یہ
ساتھی بتوں [illegible] اعلان کیا ہے کہ اب
آدم [illegible] بت پرستی کی طرف راغب ہو چکا ہے۔
[illegible] اور ہم دنیا [illegible]
[illegible] بت پرستی کے زندہ کرنے کے لئے وہ فاضل افرنگیوں
کا ممنون ہے۔ کہتا ہے ؎

زندہ باد افرنگی مشرق شناس
آنکہ ما را از لحد بیرون کشید

پھر زیادہ اچھا موقع اس لئے پیدا ہو گیا ہے کہ
ابراہیم کا تیار کردہ حلقۂ توحید [illegible] ٹوٹ چکا ہے
آلِ ابراہیم [illegible] ذوق [illegible] ہے۔ ملک و نسب
کے نئے نصب العینوں نے دین و مذہب کو شکست
دیدی ہے۔ محمدؐ کا مذہب سب سے بڑا پہاڑ تھا
جو ہمارے رستہ میں حائل تھا۔ لیکن اب اسوقت
ہزاروں بولہب محمدؐ کے چراغ کو پھونکوں سے
بجھانے کے درپے ہو گئے ہیں"۔

اس کے بعد مسافر فرعون اور لارڈ کچنر کی روحوں
کو دیکھتے ہیں۔ لیکن کہاں؟ زہرہ کے ایک دریا کی
تہہ میں [illegible] کہ دونوں کا انجام سمندر کی تہ میں
غرقابی تھا۔ سمندر کے اندر یہ مجلس اس طرح منعقد
ہوتی ہے۔ رومی اقبال کو کہتا ہے کہ اپنا ہاتھ میرے
ہاتھ میں دے اور ڈرہیں پیچھے چلتا آ۔ میں موسیٰ
کی طرح سینۂ دریا کو چیرنا اور اُس کے ضمیر کے اندر
داخل ہو جانا جانتا ہوں۔ دونوں سمندر میں قدم رکھتے
ہیں۔ تو سمندر اپنا سینہ کھول کر ان کو اندر آنے دیتا
ہے۔ اس حیرت انگیز منظر کی تصویر شاعر نے اس
طرح کھینچی ہے ؎

بحر با ما سینۂ خود را گشود
یا ہوا بود و چو آبے وانمود
قعر او یک وادیٔ بے رنگ و بو
وادیٔ تاریکیٔ او توٗ بتوٗ
پیر رومی سورۂ طٰہٰ سرود
زیرِ دریا ماہتاب آمد فرود!
کوہہائے شستہ و عریان و سرد
اندروں سرگشتہ و حیراں دو مرد

اقبال کے اس تخیل کی مثال ڈھونڈیئے۔ ابن
اعرابی لیکر دنیا کے تمام شعرا کے کلام میں مشکل سے ملیگی۔
فرعون اور کچنر حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے
کو تکتے رہ جاتے ہیں۔ آخر فرعون مسافروں سے

پوچھتا ہے کہ یہ سحر یہ جوئے نور۔ یہ صبح۔ یہ قلعہ یہ پیالے سمندر کی تہہ میں کیسے پیدا ہو گئے۔ رومی دو لفظوں میں اس کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ اور حقیقت منکشف کر دیتا ہے۔ فرعون کے سوال کا جواب صرف یہ ایک شعر ہے ؎

ہر چہ پنہاں است ازو پیدا ستے
اصلِ ایں نور۔ از یدِ بیضا ستے!

فرعون آخری وقت سمندر میں ہاتھ پاؤں مار کر غرق ہونے سے پہلے اپنے ایمان کا اعلان کر کے رخصت ہوا تھا۔ "آمنتُ بربِ موسیٰ و ہارون" مسلمانوں کا عام عقیدہ ہے کہ یہ "ایمان بالیاس" تھا اور قابلِ قبول نہ تھا۔ تاہم یہ حقیقت شاعر کے سامنے ہے۔ فرعون کے لب پر رومی کے یہ الفاظ سنکر افسوس و تاسف کے کلمات جاری ہو جاتے ہیں اور پکار اُٹھتا ہے ؎

آہ تقدیرِ عقل و دیں در باختم
دیدم و ایں نور را نشناختم

اپنے انجام اور ملوکیت و فرعونیت کے انجام پر آٹھ آٹھ آنسو رو کر کہتا ہے ؎

چیست تقدیرِ ملوکیت؟ شقاق محکمی جستن ز تدبیرِ نفاق
ملوکیت جو تدبیرِ نفاق . . . .

کی پالیسی پر اپنی محکمی کا اساس رکھتی ہے۔ اسکا انجام سوائے تباہی و بربادی کے اور کیا ہو سکتا ہے +

"تلزم موت" کے دن سے آج تک فرعون یہ حسرت لئے بیٹھا ہے ؎

باز اگر بینم کلیم اللہ را
خواہم از وے یک دلِ آگاہ را!

اس جواب سکے لئے کچنر فرعون سے مخاطب ہوتا ہے۔ مصر میں زمانۂ حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائی ہو رہی ہے۔ اُس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اس سے اقوامِ پارینہ کے حالات و واقعات کا منکشف کرنا مقصود ہے۔ فرعون اُس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میری قبر تو علم و حکمت کی اغراض سے کھود ماری لیکن مہدی سوڈانی کی تربت کے اندر کیا تھا کہ تو نے اپنے زمانے میں اس کو کھدوا ڈالا؟

اس کا جواب کیا ہو سکتا تھا +

دفعتہً گلشنِ جنت کی طرف درویش سوڈانی کی روح پرواز کرتی ہوئی اس بزم میں آنکلتی ہے۔ اور سب سے پہلے کچنر سے مخاطب ہوتی ہے ؎

گفت "اے کشنر اگر داری نظر انتقامِ خاکِ درویشے نگر!

آسماں نمناک تا گردیدہ او مرقدے جز در حریمِ شوق نداد

اس تمام باب میں سب سے اہم وہ پیغام ہے جو مہدی سوڈانی نے اقوامِ عرب و افریقہ کے نام دیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں سوائے چند اشعار کے زیادہ درج نہیں کیا جا سکتا ؎

گفت اے روحِ عرب بیدار شو
چوں نیاگاں خالقِ اعصار شو
اے فواد اے فیصل اے ابنِ سعود
تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود
زندہ کن در سینہ آں سوزے کہ رفت
در جہاں باز آور آں روزے کہ رفت
خاکِ بطحا خالدے دیگر بزاے
نغمۂ توحید را دیگر سراے
اے نخیلِ دشتِ تو بالندہ تر
بر نخیزد از تو فاروقے دگر؟
اے جہانِ مومنانِ مشک فام
از تو می آید مرا بوئے دوام
زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر
تا کجا تقدیرِ تو در دستِ غیر
بر مقامِ خود نیائی تا بکے

استخوانم در پئے نالہ چو نے
از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفیٰ است
مرد را روزِ بلا روزِ صفاست

فلکِ مریخ

فلکِ مریخ میں شاعر کے تخیل نے اس ستارے کو ایک نیا سفر دکھایا ہے جس کا نام حکیم مریخی ہے۔ وہ انجم شناس واقع ہوا ہے۔ مسافروں کی دنیا کے حالات سے آگاہ ہے۔ بلکہ کسی زمانہ میں اس کی سیر کر چکا ہے ایران و فرنگ دیکھ چکا ہے "نیل" "و رودِ گنگ" کے ملکوں سے خوب واقف ہے۔ بہ تحقیق قاراتِ زمین، امریکہ، جاپان، چین سب کی سیاحت کر چکا ہے۔ مسافروں کو بتاتا ہے کہ جہاں تم پہنچے ہو یہ شہر مرغدین کا نواح ہے۔ وہ خود یہاں کیوں پیدا ہوئے یہ تمام حالات بتائے جاتے ہیں۔ شہر مرغدین کے حالات میں حکیم مریخی کہتا ہے ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

یہاں زندہ رود یعنی (اقبال) اور حکیم مریخی میں تقدیر و تدبیر کے مسئلہ پر مکالمہ ہوتا ہے۔ زندہ رود تقدیر کے متعلق اپنا نیا نقطۂ خیال واضح کرتا ہے جس میں

"تقدیر پر" کو قناعت و سکون اور بے عملی سمجھ کر اپنے عقیدہ کے دل میں جگہ دے لی ہے۔ اس کے متعلق کہتا ہے ؎

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا
باز در خواب گراں بارد ترا
سحر و افسون است یا دین است این
حب افیون است یا دین است این

مذکیرہ منبیۂ مریخ

فلکِ مریخ میں ہزاروں کاخ گزرنے کے بعد مسافر ایک جگہ دیکھتے ہیں۔ ایک شہر ہے اور اُس کے باہر ایک وسیع و فراخ میدان ہے۔ وہاں مرد و زن کا ہجوم ہے۔ گویا ایک عام جلسہ ہے جہاں ایک عورت تقریر کر رہی ہے۔ اسکا چہرہ بظاہر خوب چمکتا دمکتا ہے۔ لیکن اس کے تن میں نورِ جان پیدا نہیں۔ اس کے الفاظ بے سوز ہیں اور اس کی آنکھ بے نم۔ یعنی سرورِ آرزو و محبت سے یکسر نامحرم ہے۔ اس کا سینہ جوشِ جوانی سے خالی اور اُس کا "آئینہ" کور و "صورت ناپذیر" واقع ہوئی ہے۔ یہ فیشن و آزادی کا دلدادہ محبت اور آئینِ محبت سے قطعاً بے خبر ہے۔

مرادپا۔ مرد کی صحبت سے گریزاں ہے اور اس سے ازدواج کے تعلق کو بُرا سمجھتی ہے۔ یہ وہی رنگ ہے جو اب یورپ کی عورتوں کی تقلید میں مشرق کی عورتیں بھی اپنے اوپر وارد کرنے کی آرزومند ہو رہی ہیں۔ حکیم نکتہ داں مسافروں کو بتاتا ہے کہ یہ نوجوان لڑکی اہلِ مریخ سے نہیں بلکہ فرزمرز جسے شاعر نے مریخ کا "آمر کردارِ شب" بیان کیا ہے اسے یورپ سے اٹھا کر یہاں لے آیا ہے تاکہ مریخ کی عورتوں کے دل میں بھی اس کی تقلید کی خواہش پیدا کر کے انہیں بگاڑ دے۔ فرزمرز نے "کارِ نبوت" (تبلیغ) میں اسے پختہ کر دیا ہے۔ لیکن وہ خود اب یہ دعویٰ کرتی ہے کہ میں آسمان سے بطورِ تنبیہ نازل ہوئی ہوں اور میری دعوت "دعوتِ آخر زمان" ہے۔ اس کا خاص فن کیا ہے ؎

از مقامِ مرد و زن دارد سخن
فاش تر می گوید اسرارِ بدن!

یہ فرنگی آزاد لڑکی جو اس دنیا کی لڑکیوں کو نئے آزادی کے رستہ پر لگا کر اب مریخ میں "کارِ نبوت"

کے فرائض ادا کرنے جا پہنچی ہے۔ وہاں کی عورتوں کو اپنی سحر پرور تقریر میں مردوں سے باغی ہوجانے کی تلقین کرتی ہوئی کہتی ہے ؎

اے زناں! اے مادراں! اے خواہراں
زیستن تاکے مثالِ دلبراں!
دلبری اندر جہاں مظلومی است
دلبری محکومی و محرومی است
در دو گیسو شانہ گردانیم ما
مرد را نخچیر خود دانیم ما
مرد صیادی بہ نخچیری کند
گرد تو گردد کہ زنجیری کند!
ہمبر او بودن آزار حیات
وصل او زہر و فراق او نبات

پھر ایک نہایت دلچسپ انداز میں شادی سے بے نیازی اور ماں بننے کی مصیبت سے جو حیلے آجکل یورپ میں اختیار کئے جارہے ہیں اُن کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور ان خیالات کی بیہودگی کا راز رومی کی زبان سے ظاہر کیا ہے +

فلک مشتری

فلک مشتری میں ارواح جلیلہ منصور حلاج۔ غالب اور ایران کی مشہور شاعرہ قرۃ العین ملتی ہے۔ نوائے حلاج نوائے غالب۔ نوائے طاہرہ سننے کے بعد زندہ رود اپنی بعض مشکلات ان ارواح بزرگ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور ان کے جواب سنتا ہے۔ مثلاً حلاج سے سوال ہوتا ہے ؎

از مقام مومناں دوری چرا؟
یعنی از فردوس مہجوری چرا؟

حلاج کے جواب میں جنت کی حقیقت پر شاعرانہ تمام خیالات کو واضح کردیا ہے ؎

جنت ملا مے و حور و غلام
جنت آزادگاں سیر دوام

یہ الفاظ منصور کی زبان ہی کو سزاوار تھے ؎

عشق ما از شکوہ ہا بیگانہ ایست
گرچہ او را گریۂ مستانہ ایست
ایں دلِ مجبور ما مجبور نیست
ناوک ما از نگاہ حور نیست
آتش ما را بیفزاید فراق
جان ما را سازگار آید فراق
بے خلشہا زیستن نا زیستن
باید آتش در تہ پا زیستن!

بعض دوسرے سوالات کے جواب میں منصور حلاج کی حقیقت پر بحث کرتا ہے۔ اور "انا الحق" کہنے کی وجہ سے اُسے۔۔ کیوں دار پہ لٹکا یا گیا۔ اسکی تشریح کرتا ہے۔ ایک لطیف پیرایہ میں شاعر بتا گیا ہے کہ منصور کا "انا الحق" کہنا کفر نہ تھا۔ بلکہ "خودی" کے مظہر اتم ہونے کا مظاہرہ تھا۔ منصور "خودی" کے حقائق بیان کرتا ہے اور شاعر کو متنبہ کرتا ہے کہ دیکھ تو بھی ان ملاؤں کے نزدیک کم و بیش اسی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے جس کا میں ہوا تھا ع

آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس!

کیونکہ جس طرح میں نے اپنے سینہ کی بانگ صور یعنی آوازۂ "انا الحق" سے ایک ایسی ملت کو جو قصہ گو زکر چکی تھی از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی اور اس کا بدلہ انہوں نے مجھے سولی پر لٹکا کر دیا اور انا کا فر کہا اسیطرح تو نے بھی وہی حرکت کی ہے ع

محشرے بر مردہ آوردی بترس!

غالب سے پہلے اس کے ایک شعر کی شرح پوچھی ہے۔ یہ شعر در اصل اردو میں ہے اور از بسکہ یہ اردو غالب کی کہی ہوئی ہے۔ اس لئے محض الفاظ ردیف کو فارسی میں بدل لینے سے فارسی شعر بن گیا ہے

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے؟

"سوختہ کیا ہے" کو "سوختہ چیست" بنا کر شعر فارسی میں بدل لیا گیا ہے۔ اس شعر کے مفہوم پر بعض ادبی رسالوں اور کتابوں میں کچھ عرصہ ہوا بحث چھڑی تھی۔ معارف کے کسی نمبر میں بھی ایک صاحب کے مضمون میں اس شعر پر بحث تھی۔ وہیں سے یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ اس شعر کی تشریح خود غالب کی زبان سے "جاوید نامہ" میں لکھی جائے۔ اس تشریح کی بحث مضمون کی غیر ضروری طوالت کا باعث ہے اس لئے اس میں دلچسپی رکھنے والے قارئین اصل کتاب میں پڑھ سکتے ہیں ٭

اس سے آگے مسئلہ "رحمۃ اللعالمین" پر بحث ہے۔ غالب نے اس مسئلہ پر لکھتے ہوئے اپنی ایک مثنوی میں یہ شعر لکھا ہے ؎

"ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینے ہم بود

جاوید نامہ میں اس نکتہ پر جو مکالمہ غالب و اقبال

کے درمیان ہوا ہے۔ اس میں "رحمۃ اللعالمین" کے انتہائی حقائق نہایت واضح کر دیئے گئے ہیں۔ غالب ایک طرح اس رمز کی صحیح حقیقت کے ادراک سے عاجز آ جاتا ہے۔ آخر منصور اس راز سے پردہ اُٹھاتا ہے ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

اس پر "زندہ رود" مستفسر ہوتا ہے کہ پھر اس "جوہر" کا "ستر" کیا ہے جس کا نام مصطفیٰ ہے وہ حقیقت میں "آدم" ہے یا کوئی "جوہر" ہے جو کبھی کبھی "وجود" میں آ جاتا ہے۔ حلاج کے جواب نے اس نکتہ کی بہت دقیق گتھیوں کو طشت از بام کرنے کی کوشش کی ہے۔ "عبدہٗ" (آدم) کے کیا معنی ہیں اور "عبدہٗ" یعنی اللہ کا "عبد" کیا شے ہے؟ یہ اپنی قسم کی پہلی بحث ہے جو جاوید نامہ میں آتی ہے۔ "رحمۃ اللعالمین" کا نکتہ سمجھا چکنے کے بعد حلاج اس صوفی پہ افسوس ظاہر کرتا ہے جو ظاہری بادشاہی کا مشتاق ہے۔ لیکن "عارفِ حق" پیدا، اپنی جان پہ وارد کرنا، پھر اسے جہان میں جاری کرنا نہیں جانتا ؎

اے خوش آں درویش کہ جوئے آفرید
باز لب بربست و دم در خود کشید
خانقاہے جست و از خیبر رمید
راہبی ورزید و سلطانی ندید!

موجودہ زمانے کے صوفی کو خطاب ہے ؎

نقشِ حق داری؟ جہاں نخچیرِ تست
ہم عناں تقدیر با تدبیرِ تست
عصرِ حاضر با تو می جوید ستیز
نقشِ حق بر لوحِ ایں کافر بریز!

یہ بحث ذرا طویل ہے کہ نقشِ حق جہان پر کس طرح وارد کیا جاتا ہے۔ "زورِ دلبری" سے یا "زورِ قاہری" سے؟

اس بحث کے اختتام پر ابلیس نمودار ہوتا ہے جسے شاعر "خواجہ اہلِ فراق" کا نام دیتا ہے۔ "نالۂ ابلیس" میں ابلیسیت کو جو صدمہ آدمیت نے پہنچایا ہے۔ اُس کا گلہ ہے۔ ابلیس روتا ہے کہ موجودہ "ابن آدم" تو میرا کوئی شکار ہی نہیں۔ اگر مجھے اتنا بڑا "ابلیس" بنانا تھا تو پھر میرا "منکر" بھی کوئی ایسا بنایا ہوتا جو میری گردن توڑتا۔ یہ آدم کیا کہ جس کو میں

جس طرف چاہتا ہوں پیچھے لگائے پھرتا ہوں۔ خدا سے ابلیس کی آخری التجا یہ ہے ؎

اے خدا ایک زندہ مرد حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست!

فلک زحل فلک زحل میں ایک خاص شاعرانہ پیرایہ میں ہندوستان کی بعض گذشتہ اور موجودہ سیاسیات زیر بحث آتی ہیں۔ فلک زحل کو شاعر نے ان ارواحِ رذیلہ کا مقام قرار دیا ہے۔ جنہوں نے ملک و ملت سے غداری کی اور دوزخ نے بھی اُن کو مرنے کے بعد قبول نہ کیا۔ اس منزل ارواح بے یوم النشور" میں دو "طاغوت" دکھائے گئے ہیں۔ جنہوں نے ملک و ملت سے بیوفائی کی اور اپنے تن کی خاطر ملت کو قربان کر دیا۔ وہ دو "طاغوت" کون ہیں ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن!

اول الذکر نے نواب سراج الدولہ سے غداری کی اور موخر الذکر نے سلطان ٹیپو سے۔ دونوں کی غداری کا نتیجہ کیا ہے۔ یہ کہ اس پاک سرزمین میں غلامی کا بیج بویا گیا؟

جس عذاب میں یہ دونوں غدار مبتلا ہیں اس کا ہولناک نقشہ کھینچنے کے بعد شاعر "روح ہندوستان" کو بصورت "حورِ پاک زاد" آسمان کے پردوں سے باہر آتے دکھاتا ہے۔ اور اس کے نالہ و فریاد کی تصویر اپنے خاص انداز میں پیش کرتے ہوئے ہندوستان کی موجودہ غلامی کے اسباب اور اس کے موجودہ سیاسی حربوں کے حسن و قبح پر شاعرانہ انداز میں بحث کرتا ہے۔

آخر میں وہ انتباہ ہے جو اس زمانے کے "غدارانِ ملک و ملت سے ہوشیار رہنے کے متعلق ہندوستانیوں کو کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی تقدیر میں اس وقت تک غلامی باقی رہے جب تک یہ "جعفر" اس کے اندر پیدا ہوتے رہیں گے۔ کس طرح زمانہ ایک نئی قسم کے "جعفر" پیدا کر لیتا ہے۔ نہایت لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ نکتے سمجھنے سے تعلق رکھتے ہیں ؎

کے شبِ ہندوستاں آید بروز!
مرد جعفر زندہ روحِ او هنوز!
تا ز قید یک بدن وا می رہد
آشیاں اندر تنِ دیگر نہد

گاہ او را با کلیسا ساز باز
گاہ پیش دیریاں اندر نیاز
دین او آئینِ او سوداگری است
عنتری اندر لباسِ حیدری است
پیش ازیں چیزے دگر مسجودِ او
در زمانِ ما وطن معبودِ او
ظاہرِ او از غمِ دیں دردمند
باطنش چوں دیریاں زنار بند
جعفر اندر ہر بدن ملت کش است
ایں مسلمانے کہن ملت کش است

جعفرِ زمانہ حال کی منافقت کا نمایاں ترین نشان یہ بتایا ہے (اور نہ معلوم وہ کون ہے!) کہ

خندِ خنداں است و با کس یار نیست
مار اگر خنداں شود جز مار نیست
از نفاقش وحدتِ قومے دو نیم
ملتِ او از وجودِ او لئیم

قومی وحدت کو دونیم کرنے کے ذمہ دار آج ایک نہیں سینکڑوں ہیں +

آنسوئے افلاک

آخری پرواز سیر حدود افلاک سے پرے جانے کے لئے ہے لیکن پیشتر اس کے کہ وہاں پہنچیں ایک اور جہان دیکھا گیا ہے .... جہاں ایک مرد جس کے لب پر ایک دردمند صدا جاری ہے نظر آتا ہے۔ رومی بتاتا ہے کہ یہ شخص حکیم المانوی نطشا ہے نطشا کے متعلق مدت ہوئی اقبال کہہ چکا ہے ع

قلب او مومن دماغش کافر است

اب بتایا کہ اس کی حقیقت یہ تھی کہ وہ بھی اپنی طرح کا منصور حلاج تھا جس کو اس کے ملک کے لوگوں نے نہ پہچانا۔ منصور کی جان اگر ملا نے لی تو نطشا[1] کی جان طبیبوں نے۔ اگر یورپ میں کوئی اس مجذوب کی واردات کو سمجھنے والا ہوتا تو شاید وہ گم گشتہ نہ ہونے پاتا اگر عیسائیت کا پردہ چاک کرنے کے بعد وہ توحید کی طرف راہ نہ پا سکا تو اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ اس کو اس رستہ پر لگانے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے افکار نے جہاں یورپ کے مروجہ معتقدات کے طلسم توڑ ڈالے وہاں وہ خود بھی ان میں گھر کر رہ گیا۔ تا آنکہ

---

[1] نطشا کو طبیبوں نے دیوانہ قرار دیا تھا۔ اقبال اسے مجذوب بتاتا ہے جو برنارڈ شا گو اس حقیقت سے واقف نہیں مگر وہ بھی نطشا کو دیوانہ کہنے سے انکاری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا نے اسے پاگل بنا

مستیِ او ہر زجاجے را شکست
از خدا ببرید و ہم از خود گسست

او بہ لا در ماند و تا اِلّا نرفت
از مقامِ عبدہٗ بیگانہ رفت

اقبال کا خیال ہے کہ شاید اگر مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی کے زمانہ میں پیدا ہوتا اور اس مردِ کامل کی صحبت اسے کبھی نصیب ہو جاتی تو وہ منزلِ مقصود کو پہنچ جاتا ؎

کاش بودے در زمانِ احمدے
تا رسیدے بر سرورِ سرمدے

جس قدر مجدد الف ثانی "مجذوبیت" کی قدیم اور بے پناہ رو کو "سلوک" میں بدلنے میں کامیاب ہوا شاید اور کوئی مجدد یا ریفارمر اس بات میں اتنا کامیاب نہ ہوا ہوگا۔

حرکت بجنت الفردوس

اب مسافر کائنات کی حد سے باہر چلے جاتے ہیں اور جہانِ بے حیات میں قدم رکھتے ہیں۔ اس جہانِ بے حیات کے سلسلہ میں پھر زمان و مکان کے مباحث نئے نئے رنگ میں پیش کئے ہیں۔ دوزخ و بہشت کی حقیقت رومی کی زبان سے ان الفاظ میں پیش کی ہے ؎

"گفت رومی" اے گرفتارِ قیاس
درگذر از اعتباراتِ حواس
از تجلّی کارہائے خوب و زشت
می شود آں دوزخ ایں گردد بہشت
اے کہ بینی قصرہائے رنگ رنگ
اصلش از اعمال و نے از خشت و سنگ
آنچہ خوانی کوثر و غلمان و حور
جلوۂ ایں عالمِ جذب و سرور
زندگی ایں جا ز دیدار است و بس
ذوقِ دیدار است و گفتار است و بس

قصر شرف النسا

سب سے پہلا قصر جو جنت میں نظر آیا وہ شرف النسا بیگم کا تھا۔ شرف النسا نواب خان بہادر خاں کی بیٹی اور نواب عبدالصمد خاں کی پوتی تھیں۔ یہ دونوں باپ بیٹے بہادر شاہ اور شاہ عالم کے زمانہ میں یکے بعد دیگرے پنجاب کے گورنر تھے۔ اس عہد میں صوبوں کے حکمران ایک طرح خود مختار ہو چکے تھے۔ تاہم دہلی کے مغل شاہنشاہ کو خراج دیا جاتا تھا۔ اور اہم شہنشاہی فرمانوں کی

تعمیل ہوتی تھی - یہ عبدالصمد خاں وہی ہیں جنہوں نے پنجاب میں بندہ بہادر کے فتنہ کو دبایا اور اُسے قید کر کے دہلی پہنچایا - اس زمانہ میں پنجاب کا گورنمنٹ ہوس وہ جگہ تھی - جہاں اب شہر کی شمالی جانب شالامار کو جاتے ہوئے بیگم پورہ کا گاؤں آباد ہے - نواب عبدالصمد خاں کی بیگم کے نام پر ہی اس جگہ کا نام بعد میں بیگم پورہ مشہور ہوا - نواب عبدالصمد خاں اور اُس کے بیٹے نواب خان بہادر خاں کی قبریں بیگم پورہ میں چار دیواری کے اندر موجود ہے - اس گورنمنٹ ہوس کی عمارتوں کے کھنڈر اور بعض مساجد و مقابر اب تک کھڑے ہیں - انہیں مقبروں میں شرف النسا بیگم کا مقبرہ ہے - شرف النسا بیگم نے محلات شاہی کے احاطہ میں ایک چبوترہ بنوا رکھا تھا جس پر سیڑھی لگا کر چڑھا جاتا تھا - اس کا معمول تھا کہ ہر روز صبح کی نماز کے بعد جوتا اُتار کر اس چبوترہ پر بیٹھ جاتیں اور قرآن کی تلاوت کرتیں - ایک مرصع تلوار پاس ہوتی تھی جب تلاوت ختم کر لیتیں تو قرآن کو بند کر کے وہیں پڑا رہنے دیتیں اور اُس کے ساتھ تلوار رکھ کر نیچے آجاتیں - مرتے وقت وصیت کی کہ مجھے اسی چبوترہ پر دفن کیا جائے - اور وہ قرآن و تلوار قبر کے اوپر ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھے رہیں - چنانچہ وفات کے بعد انہیں وہیں دفن کیا گیا - پھر اس چبوترہ پر گنبد بنا - اب اس گنبد کو دیکھیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دو منزلہ گنبد کیوں تعمیر ہوا - لیکن اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی - مقبرہ کی بالائی دیوار کے باہر سرو کے درخت ہیں - اور ان کی وجہ سے لوگ اب اس مقبرہ کو سرو والا مقبرہ کہتے ہیں؛

اقبال نے شرف النساء بیگم کا جو قصر جنت میں دکھایا ہے وہ لعل ناب سے تعمیر ہوا ہے جو اپنی ضوفشانی میں آفتاب سے خراج وصول کرتا نظر آتا ہے - جب زندہ رود رومی سے سوال کرتا ہے کہ یہ کاشانہ کس کا ہے - تو موخر الذکر اس کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

قلزم ما ایں چنیں گوہر نہ زاد
ہیچ مادر ایں چنیں دختر نہ زاد
خاک لاہور از مزارش آسماں
کس نداند راز او را در جہاں

اس کے بعد شاعرانہ انداز میں شرف النسا کے وہی حالات بیان کئے ہیں جو اوپر درج ہوئے - ان کو جو آخری

وصیت شرف النسا نے کی اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

برلب او چوں دم آخر رسید
سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از راز من داری خبر
سوئے این شمشیر و این قرآں نگر
این دو قوت حافظ یکدیگر اند
کائنات زندگی را محور اند
اندرین عالم کہ میرد ہر نفس
دخترت را این دو محرم بود و بس
وقت رخصت با تو دارم این سخن
تیغ و قرآں را جدا از من مکن
مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربت ما را ہمیں ساماں بس است

حسب وصیت تیغ و قرآن شرف النسا کی قبر پر ایک مدت تک محفوظ پڑے رہے لیکن سنہ ۱۸۴۵-۴۶ء کے ان ہنگاموں میں جو سکھوں میں خانہ جنگی کی وجہ سے لاہور میں رونما ہوئے تاریخ میں لکھا ہے کہ کسی سکھ سردار نے یہ سنکر کہ اس دو منزلہ مقبرہ میں کوئی خزانہ مدفون ہے۔ اس پر چڑھ کر اس کو کھولا تو کچھ ہاتھ نہ آیا۔ وہ تیغ و قرآن ضرور وہاں سے نکال لئے۔ وہی کہتا ہے

عمرہا در زیر این زرّیں قباو
بر مزارش بود شمشیر و کتاب
مرقدش اندر جہان بے ثبات
اہل حق را داد پیغام حیات
تا مسلماں کرد با خود آنچہ کرد
گردش دوراں بساطش در نورد
مرد حق از غیر حق اندیشہ کرد
شیر مولا روبہی را پیشہ کرد
از دلش تاب و تب سیماب رفت
خود بداں آنچہ بر پنجاب رفت
خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

جاوید نامہ میں یہی ایک مقام ہے جہاں پنجاب کے مسلمانوں کی تاریخ کا یہ ایک دردانگیز منظر پیدا ہے۔ قصر شرف النسا کی زیارت کے بعد حضرت سید علی ہمدانی اور ملا طاہر غنی کشمیری سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان مکالمات میں خطۂ کشمیر کے ماضی و حاضر اور مستقبل پر ان خیالات و جذبات کا ایک سیلاب

پیدا کیا ہے کہ اگر آج اہلِ خطہ ان سے روشناس ہو جائے تو زندگی کی تازہ لہر جواب ان کی رگوں میں دوڑنے لگی ہے۔ ایک سی سرعت و حرارت اختیار کرلے۔ کشمیر کے گذشتہ اور موجودہ یا لٹکس خطہ کا مہاراجگان کشمیر کے پاس پہنچ جانا۔ یہ سب واقعات جن الفاظ میں ادا ہوئے ہیں وہ نشتر بن کر دل کے پار ہو جانے والے ہیں۔ شاعر سرینگر کے نواح میں نسیم باغ اور شالا باغ کی سیر و سیاحت کے لطف اٹھا رہا ہے۔ ان کے جوش بہار کے منظروں سے مسرور ہوکر "بشنو از نے" کے نغمے الاپنے لگتا ہے۔ ایک پرندہ ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھا ہوا اسے مخاطب کرکے کہتا ہے۔ کہ یہ بہار اور اس کے یہ موسم ہمارے لئے جو اس خطہ کے رہنے والے ہیں پر پشہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ کیوں؟ اس لئے ؎

لالہ است و نرگسِ شہلا دمید
بادِ نوروزی گریبانش درید!
عمرہا بالید ازیں کوہ و کمر
نستر از نورِ قمر پاکیزہ تر
عمرہا گل رخت بربست و کشاد
خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد

اس پرندہ کا نغمہ ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ایک مرد دیوانہ جوش و خروش میں ایک نالۂ مستانہ کرتا اور شاعر کو یہ کہتا سنا گیا ؎

بگذر زما و نالۂ مستانہ مجوے
بگذر ز شاخِ گل کہ طلسمے است رنگ و بو

یہ جو بظاہر پرندہ درخت کی ٹہنی پر ترنم سے گیت گاتا سنا ہے۔ وہ دراصل فنی کی روح ہے جو مرگ آرزو کی ماتمی ہوکر پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہے ؎

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام باز گوے
دہقان و کشت و جوے و خیابان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزان فروختند

آگے چل کر غنی شاعر کو پھر بتاتا ہے کہ اہلِ خطہ کے مستقبل سے نا امید نہ ہو ؎

باش تا بینی کہ بے آوازِ صور
ملتے برخیزد از خاکِ قبور
شہرہا زیر سپہر لاجورد
سوخت از سوزِ دلِ درویش مرد
سلطنت نازک تر آمد از حباب
از دمے او را تواں کردن خراب

یہ اشعار اس وقت لکھے گئے تھے جب ابھی کشمیر کے موجودہ انقلاب کا وہم بھی اہل خطہ کو نہ آیا ہوگا۔ افسوس کہ جاوید نامہ کی طباعت میں تاخیر کی وجہ سے اب آکر شایع ہوسکے +

شاہ ہمدانی کی زبان سے فقیری و شاہی اور "تاج" کی اصلیت کے متعلق ان گرانبہا اسرار و نکات کا اظہار کیا گیا ہے کہ ان کا جاننا تمام اقوام کی سیاسی راہنمائی کا باعث رہے +

اس کے بعد ہندوستان کے مشہور شاعر برتری ہری سے مل کر سوال کیا جاتا ہے کہ شعر کیا چیز ہے۔ پھر ہندوستان کے موجودہ سیاسی پیچ و تاب پر اس کی رائے دریافت کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں برتری ہری کی ایک خاص نظم کا فارسی ترجمہ درج کیا ہے +

کاخ سلاطین مشرق

اس منظر سے گذر کر کاخ سلاطین مشرق میں نادر شاہ۔ ابدالی اور سلطان شہید (ٹیپو) سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ نادر ایرانیوں کی موجودہ حالت دریافت کرتا ہے۔ زندہ رود ایرانیوں کے تمام وہ موجودہ رجحانات ان کے سامنے بیان کرتا ہے۔ جو "اسلامیت" اور "عربیت" سے ہٹا کر ان کو "ایرانیت" کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اور افرنگی قومیت کی تقلید پر ان کو گامزن کر رہے ہیں۔

ابدال کا پیغام ملت افغانیہ کے نام ہے۔ ایشیا میں بحیثیت قوم افغانوں کی سیاسی اہمیت پر بحث کی ہے۔ افغانوں کو نصیحت کی ہے کہ جس طرح ترک فرنگیوں کی تقلید سے اپنے آپ کو کھو رہے ہیں تم ان کی پیروی سے بچنا اور اپنی خصوصیات کو محفوظ رکھنا + رضا شاہ پہلوی اور نادر خاں موجودہ حکمران افغانستان کو سیاسیات کے بعض اہم نکات سمجھائے گئے ہیں +

سلطان شہید زندہ رود سے ہندوستان کا حال دریافت کرتے ہیں۔ زندہ رود جواب دیتا ہے کہ اس وقت سوال نادر خاں کا دور دورہ ہے ؎

ہندیاں منکر ز قانونِ فرنگ
در نگیرد سحر و افسونِ فرنگ

سلطان اس کے بعد دکن کے حالات دریافت کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا دکن میں بھی کوئی آثار حیات پیدا ہیں۔ اقبال کو اپنا دکن کا سفر یاد آ جاتا ہے جواب میں کہتا ہے ؎

تخم اشکے ریختم اندر دکن
لالہ ہا روید ز خاک آں چمن

سرنگاپٹم میں بہرے محلات کے نیچے بہنے والی کاویری پھر اپنے اندر نئی موجیں پیدا کر رہی ہے ؎

رود کاویری مدام اندر سفر
دیدہ ام در جان او شورے دگر

"سلطان" "زندہ رود" کو دریائے کاویری کے نام اپنا پیغام دیتا ہے۔ اس پیغام میں حقیقت حیات و مرگ اور شہادت پر حیرت انگیز خیالات کا اظہار کیا گیا ہے +

آخری مناظر فردوس بریں سے رخصت ہونے کے ہیں۔ حوران بہشتی شاعر سے شعر سنانے کا تقاضا کرتی ہیں۔ یہ فرمائش قبول کی جاتی ہے۔ اور ایک غزل سے انہیں مسرور کیا جاتا ہے +

اس کے بعد "حضور" میں حاضری ہے

.... تجلی ذات

کے مباحث ایسے ہیں کہ اقبال کو انہیں لکھنے میں کبھی صبر نہیں آتا۔ علم و عشق کے حقائق نئے الفاظ اور نئے پیرائے میں پیش کر دئے ہیں۔ لذت دیدار سے بہرہ یاب ہو کر بارگاہ صمدی میں کچھ التجائیں کی ہیں۔ وہ التجائیں یہ ہی ہیں کہ اس سفلی خاکدان سے نکال کر کہیں اور جگہ ہم کو پھینک ؎

ایں چنیں عالم کجا شایان تست
آب و گل داغے کہ بر دامان تست

مگر "ندائے جمال" نے جمالی انداز میں انتباہ کیا ؎

زندۂ؟ مشتاق شو۔ خلاق شو
ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو
در شکن آں را کہ ناید سازگار
از ضمیر خود دگر عالم بیار
ہر کہ او را قوت تخلیق نیست
پیش ما جز کافر و زندیق نیست

چند نکتے ملت کے متعلق بھی سمجھائے جاتے ہیں زاں بعد ناگہاں "تجلی جلال" نمودار ہوتی ہے۔ تمام زمین و آسمان نور شفق میں غرق ہو جاتے ہیں۔ اور سرخ نظر آنے لگتے ہیں۔ شاعر کلیم اللہ کی طرح جلوہ سے مست ہو کر گر پڑتا ہے۔ تاب گفتار باقی نہیں رہتی اور عالم بے چون و چند کے ضمیر سے یہ نوائے سوزناک سنتا ہے ؎

بگذر از خاور و افسونئ افرنگ مشو
کہ نیرزد بجوے ایں ہمہ دیرینہ و نو

آں نگینے کہ تو با اہرمناں باختہ
ہم بجبریلِ امینے نتواں کرد گرو!
زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو باہمہ رو!

. . . .

از تنک جائی تو میکدہ رسوا گردید
شیشہ گیر و حکیمانہ بیاشام و برو!

کتاب کا آخری حصہ "خطاب بہ جاوید" پر مشتمل ہے۔ اس میں موجودہ زمانہ کے نوجوانوں کو حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں نصیحتیں کی گئی ہیں۔ ہر شعر حرزِ جان بنانے کے قابل ہے۔ اس سے لطف اندوزی کے لئے اس کا مسلسل مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

"چودھری"

علامہ اقبال
اور
فلسفۂ تصوف

(از حضرت ادیب اکبر آبادی)

خدا جانے کس نے کہا تھا، لیکن کہا خوب ہے کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است"۔ کہنے کو تو صرف یہی کچھ کہا لیکن سچ پوچھو تو یہ کہہ گیا کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است امّا برائے ہیچ چیز دیگر خوب نیست"۔ بڑا ہی محتاط آدمی تھا سوچا ہوگا کہ اگر یہ صاف صاف کہدیا تو کوئی صوفی کاٹ کھائے گا۔

یہ چار پانچ لفظوں کا چھوٹا سا مقولہ کئی صدیوں کی فارسی (اور اردو) شاعری پر اور ایشیائی فلسفۂ تصوف پر ایک نہایت ہی پر معنی بلیغ آمیز اور بصیرت افروز تبصرہ ہے۔ صوفیائے کرام اور شعرائے چرخ مقام کے خیالات اور طبائع میں ایک ایسی گہری یگانگت تھی کہ ہوتے ہوتے شاعری اور تصوف بہن بھائی بن گئے۔ اور آپس میں وہ چولی دامن کا ساتھ پیدا کیا۔ کہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے۔ دن رات بہن بھائی کی عزت اور شان بڑھانے میں مصروف رہی اور بھائی بہن کو ابھارنے اور چمکانے میں مشغول رہا۔ محبت بڑھتی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ایک دوسرے پر قربان ہو گئے اور ایسے یک جسم و یک جان بن گئے کہ دونوں ایک دم یکتا ہو اٹھے ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

صوفیوں نے ایک سینہ زوری یہ کی کہ جا و بیجا اور عربی فارسی کے اس لٹریچر کی جو فلسفۂ تصوف سے دور کا تعلق بھی نہ رکھتا تھا۔ صوفیانہ تعبیریں کر کے اسے سر تا پا تصوف ثابت کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ ان کی یہ بے محل کوششیں بعض صورتوں میں بے سود اور بے ضرر ثابت ہوئیں۔ لیکن بعض صورتوں میں نہایت خطرناک اور ضرر رساں نتائج کی حامل بن گئیں۔ مثال کے طور پر مولانائے روم کو دیکھو۔ "بشنو از نے" سے لے کر والسّلام تک ایک مسلسل اور متواتر تعلیم جہد و جہاد کی ہے قسم قسم کی کہانیاں اور رنگا رنگ کی باتیں ہیں۔ لیکن اگر کتاب کو بنظرِ غور لفظ بہ لفظ پڑھتے جاؤ تو معلوم ہوگا کہ ایک سے لیکر دوسرے سرے تک فلسفہ جہاد ہے اور کچھ نہیں۔ اس امر کی تصریح ایک مفصل بیان چاہتی ہے جو کسی فرصت پر رکھا جاتا ہے۔ لیکن صوفیائے کرام کی اپج ملاحظہ ہو کہ مثنوی کی صوفیانہ شرحیں لکھتے ہوئے وہ ایمون گھول کر رکھدی ہے کہ بقول حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار +

مثنوی تو خیر کس باغ کی مولی تھی۔ ان بزرگوں نے قرآن کریم کو تصوف کی کتاب (اور اس کے مصنف کو گویا ایک بہت بڑا صوفی) ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مشتِ نمونہ از خروارے پر ذرا غور فرمائیے۔ مشرکین و منافقین کے لئے ایک وعید قرآنی ہے وَلَہُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (اور ان کے لئے ہے بہت بڑا عذاب) بھلا وہ بزرگ جو وحدت وجودی کے قائل ہوں۔ اور کفر و اسلام کی تمیز کرنے والے کو احول کہتے ہوں وہ عذاب و ثواب کو کب ماننے لگے تھے۔ فرماتے ہیں کہ عذاب کا مادہ ہے عذب و عذوبت اور اس کے معنے ہیں شیرینی۔ اس لئے اس عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کے لئے (یعنی کافروں مشرکوں منافقوں اور فاسقوں کے لئے) اگلے جہان میں ہونگی شیرینیاں بہت بہت لیکن ان اللہ کے بندوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ اگر کفار و فجار وہاں جا کر مٹھائیاں کھائیں گے تو صوفی لوگ کیا زہر کھائینگے +

اسیطرح کلمۂ توحید کی ایک تحویل بھی قابلِ داد ہے۔ لا الہ الا اللہ (نہیں کوئی معبود مگر اللہ تعالے) یعنے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی (سچا) معبود نہیں۔ یہ بزرگ کہتے ہیں کہ اس کلمہ کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ

(نہیں کوئی معبود مگر وہ خدا ہے) یعنے ہر وہ شخص اور ہر وہ چیز جس کی پرستش ہوتی ہے خواہ وہ سونے چاندی یا پتھر کا بت ہو خواہ آدمی۔ خواہ درخت ہو خواہ ندیا خواہ پہاڑ ہو خواہ چاند یا سورج فی الواقعہ وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ سبحان ربی الاعلیٰ +

بات یہ ہے کہ مسلمان جب تک فتوحات ملکی میں مصروف رہے اور اعلائے کلمۂ حق میں کوشاں۔ اُس وقت تک انہیں تصوف یا دیگر فلسفی مباحث میں وقت صرف کرنے کی فرصت نہ تھی۔ بقول اکبر۔ (با دنیٰ تغیر)

فلسفی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

لیکن جب سلطنت وسیع ہوتی گئی اور دنیاوی جاہ و حشمت اور مال و دولت کی فراوانی ہوئی۔ تو لوگ آرام کی زندگی بسر کرنے لگے اور عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ پھر اپنے اس طرز عمل کے درست اور برحق ہونے کے ثبوت میں دلیلیں پیدا کرنے کی سوجھی۔ اُس دن سے فلسفۂ تصوف نے زور پکڑا اور نتیجہ یہ ہوا کہ کفر و اسلام کے تفرقے مٹ گئے حتیٰ کہ ع زمین شعر میں بس رہ گئی زلف بتاں کافر۔ آخرکار جدو جہاد کا نام تک باقی نہ رہا۔ اور صرف تصوف ہی تصوف رہ گیا۔ کافروں سے جہاد کرنے کا نام جہاد اصغر رکھا اور جہاد بالنفس (یا بالفاظ دیگر خودکشی) کا نام جہاد اکبر مقرر ہوا۔ صوفیوں نے اور اُن کے متبعین نے اس نئی قسم کے جہاد یعنی جہاد اکبر پر اسقدر زور دیا کہ وہ سروں پر فتح حاصل کرنے کی بجائے اپنے آپ کو مفتوح مغلوب اور مقہور بنا کر رکھدیا۔ قوائے جسمانی نفسانی اور روحانی قطعاً مضمحل ہو گئے اور نوبت یہانتک پہنچی کہ جہاں پہلے کفار کو غلام بنایا کرتے تھے۔ اب خود کفار کے غلام بن گئے۔ اور غلامی کی سیمیں اور زریں زنجیروں کو (عورتوں کی طرح) پاؤں میں ڈال کر انہیں پازیب سمجھنے لگے +

خدا بھلا کرے علامہ (شیخ۔ ڈاکٹر۔ سر) محمد اقبال کا کہ انہوں نے بیسویں صدی ہجری کے آغاز کے ساتھ ہی شاعری کے ایک نئے دور اور ایک علیحدہ رنگ کا آغاز کر دیا۔ اور خدا بھلا کرے اس کیفیت

قلبی کا جس کی برکت سے علاّمہ موصوف کے دل میں ایک دن جبکہ وہ آرام کرسی پر لیٹے تھے۔ اور عین فیاض زندگی بسر کر رہے تھے معاً یہ خیال پیدا ہوا کہ تصوّف نے اسلامی شاعری اور اسلامی زندگی پر جو ہمہ گیر اثر پیدا کر دیا ہے وہ ہماری ابتدائی قومی روایات کے قطعاً منافی ہے اور ہمارے اخلاقی مدنی اور سیاسی اغراض و مقاصد کے حق میں سمّ قاتل۔ اُن کے اپنے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ علاّمہ ممدوح کے تلازمِ خیالات میں یہ طوفانِ انقلاب مولانا جلال الدینؒ رومی کے کلام کے مطالعہ نے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ ان کی پہلی مثنوی اسرارِ خودی اُن کی بنا یا بالفاظِ دیگر ان کے تمام فلسفہ اور ان کی تمام شاعری کی بنا مولانا روم کے ان اشعار پر رکھی گئی ہے

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
جانم ملول گشت ز فرعون و ظلمِ او
آں نورِ روئے موسیٰ عمرانم آرزوست
دی شیخ با چراغ ہمے گشت گردِ شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت مے نشود آنم آرزوست

اسرارِ خودی کے بعد کا تمام کلام علامہ اقبال کا اسی رنگ میں ہے۔ وہ خودی کو جسے صوفیائے کرام مٹانے کی فکر میں رہتے تھے سنوارنے اور اُبھارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔

صوفی کہتے ہیں کہ اُدھر سب کچھ ہے۔ لیکن ہم کچھ بھی نہیں۔

علاّمہ اقبال صاحب کہتے ہیں کہ صرف ہم ہی ہم ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ مئے دو سالہ ہیچ ہے اور معشوق چاردہ

سالہ ہیچ۔ نارِ جہنم اور باغِ جناں ہیچ ہے اور حور وغلمان ہیچ۔ جو کچھ تم دیکھتے ہو وہ بھی ہیچ ہے اور جو کچھ تم سنتے ہو وہ بھی ہیچ۔ کوہ وصحرا ہیچ ہے اور دشت ودریا ہیچ۔ فلسفۂ مغرب ہیچ ہے اور فلسفۂ مشرق ہیچ۔ دنیا ایک تبخانہ ہے اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے وہ بُت۔ بت خانہ ہیچ ہے اور بُت ہیچ۔ اپنے آپ کو دیکھو اور بے خوف۔ چلے جاؤ۔ کیونکہ یہ جہان بھی ہیچ ہے اور وہ جہان بھی ہیچ۔ نوک مژہ سے اپنا راستہ کاٹ کر ہموار کرتے جاؤ۔ کیونکہ منزل وکارواں ہیچ ہے اور ریگ رواں ہیچ اگر کچھ ہو تو صرف تم ہو اور بس +

کسی نے سچ کہا ہے ع خدا رکھے تم ہی تم ہو نظر پڑتی ہے عالم کی +

صوفی کہتے ہیں کہ ہماری کائنات ہی کیا ہے۔ ہماری ہستی مستعار شبنم کے ایک قطرے کی مثال ہے۔ کہ ابھی تھا اور ابھی نہیں۔ ہمارا مجازآفتاب حقیقت کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا +

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ہم ایک قطرۂ شبنم ہی سہی لیکن یہ قطرہ ایک بحرِ زخار ہے کہکشاں جس کا ساحل ہے اس قطرہ نما قلزم کی اگر کوئی چھوٹی سی موج بھی جوش میں آجائے تو ساحل کہکشاں کے اُس پار چلی جائے اور طوفان وطغیان کی وہ قیامت برپا ہو کر زمین؛ آسمان اور کون ومکان بلکہ لامکان تک کو بہا لے جائے عرش وکرسی۔ کے متعلق یقیناً کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شاید وہ بچ نکلیں +

صوفی کہتے ہیں کہ خودی کو چھوڑ دو۔ کیونکہ تمہاری خودی تمہاری ہستی اور تمہارا وجود تمہارے اور تمہارے محبوب کے درمیان ایک پردہ ہے۔ جب تک تم اس پردے کو دور نہ کرو گے اپنے محبوب کے دیدار اور وصال سے محروم رہو گے +

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ تمہارا محبوب مع اپنے دیدار اور وصال کے جاے بھاڑ میں۔ تم اپنی خیر مناؤ۔ تم نہ ہو گے تو محبوب تمہارے کس کام آئے گا۔ اپنے آپ کو قربان کر کے اپنے محبوب کو غیروں کے لئے چھوڑ جانا کہاں کی عقلمندی ہے اور کون سی غیرت +

صوفی کہتے ہیں کہ جب سو سال زندہ رہ کر بھی آخر کار مرجانا ہے تو پھر ابھی مرجاؤ۔ کیونکہ آج کا کام کل پر چھوڑنا بیوقوفی کی بات ہے +

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ہرگز نہ مرو - اتنا جلدی مرجانا تو بالکل قرین مصلحت نہیں - سو سال بلکہ ہزار سال کے بعد بھی مرنے کا نام نہ لو کوشش کرو کہ ابد الآباد تک جیتے رہو - تاریخ پیدائش کے تقرر میں تو شاید تمہارا اختیار نہ تھا - تاریخ وفات خود مقرر کرو - اور اگر ملک الموت تاریخ مقررہ سے پہلے آجائے تو اسے امروز فردا پر ٹالتے رہو - مگر قطعی انکار کرکے بنا بنائے مخاصمت پیدا نہ کرو +

صوفی کہتے ہیں کہ تگ و دو فضول ہے - انسان اشرف المخلوقات ہے - جنگلی جانوروں کی طرح روزی کے پیچھے دن رات دوڑتے پھرنا اس کے لئے نازیبا ہے - جو کچھ نصیب میں ہے مل ہی جاتا ہے خواہ وہ پہاڑ کے نیچے مدفون ہی کیوں نہ ہو - راحت سکون میں ہے - دوڑنے سے چلنا زیادہ آرام دہ ہے چلنے سے کھڑا رہنا زیادہ فرح بخش ہے - کھڑے رہنے سے بیٹھ جانا زیادہ راحت رساں ہے - اسیطرح بیٹھ جانے سے لیٹ رہنا بہتر ہے - اور لیٹ جانے سے سو جانا اچھا ہے - اور جب سو جانے میں اتنا آرام ہے - تو مر جانے میں تو بیحد لطف ہوگا +

علامہ اقبال مرنے کو تو بالکل مانتے ہی نہیں - سوتے رہنے کو خودکشی - لیٹ رہنے کو زہر ہلاہل - بیٹھنے کو سم قاتل - کھڑے رہنے کو دشمن جان اور چلنے پھرنے کو مقاصد عالیہ کے لئے ضرر رساں سمجھتے ہیں - ان کا نظریہ حیات یہ ہے کہ دن رات دوڑتے رہو - جستجوئے محمل لیلیٰ میں ہر وقت صحرا نوردی کرتے رہو - اور اگر محمل لیلیٰ کا کوئی نشان نہ ملے یا محمل لیلیٰ ہی کوئی نہ ہو یا خود لیلیٰ ہی معدوم الوجود ہو - تو پھر اپنے لئے ایک خیالی لیلیٰ پیدا کرو - اور اس خیالی لیلیٰ کے لئے ایک نہایت شاندار - خوبصورت - خوش وضع - خوش قطع اور مرصع خیالی محمل تیار کرو اور پھر اپنے کشور خیال میں ایک ایسا طویل و عریض بیابان بناؤ جسکی وسعتیں صحرائے عدم و وجود کی لمبائی اور چوڑائی پر خندہ زن ہوں جس کی حدود اربعہ کے تعینات مکان سے نکل کر لامکان کی پہنائیوں سے بھی ماورا ہوں - جس کے چپے چپے پر غول بیابان اور خطرہ جان و ایمان موجود ہو جس کے سراب بے پایاں میں ریگ رواں کی موجوں کو دیکھ کر بحر اوقیانوس کی موجیں بھی پانی پانی ہوجائیں جس کے قدم قدم پر ان سابقون الاولون کی ہڈیوں کے ڈھیر لگے ہوں جن کی جانیں یکم اپریل ۱۹۳۲ء

قبل مسیح سے لے کر ۱۳ مارچ ۱۹۳۲ء بعد مسیح تک اس خونی صحرا میں تلف ہو چکی ہوں۔ پھر اس خیالی بیابان میں اپنے خیالی لیلیٰ کے خیالی محمل کو ایک وحشت آشام ناقہ پر لاد کر روانہ کر دو۔ اور جب محمل کئی ہزار میل آگے نکل جائے تو ننگے پاؤں تم بھی اس کے پیچھے ہو لو۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ دور جاکر تمہارے پاؤں چھالوں سے بھر جائیں گے۔ اور تمہاری رفتار فیرلنگ کی رفتار سے کئی میل فی گھنٹہ کم ہو جانے گی لیکن ہمت نہ ہارو اور آگے آگے بڑھے چلو! ہاں ہاں بڑھے چلو)

عصا بکف نہ و تکبیر فتح خوان و برو
کہ نشنود ز تو ہمت کہ نا توانائی

صوفی کہتے ہیں کہ خود بینی شرک خفی ہے جس کی سرحدیں شرک جلی کی سرحدوں سے ملتی ہیں۔ اپنے آپ کو مٹا دو۔ تاکہ پھر اپنے آپ کو دیکھنے کا موقع ہی نہ ملے ہمیشہ اپنے محبوب کو دیکھتے رہو اور اس طرح دیکھتے رہو کہ اس کے دیدار میں محو اور حیران ہو کر رہ جاؤ +

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو دیکھو اور صرف اپنے آپ کو دیکھو اور اس شد و مد سے دیکھو کہ اگر محبوب اپنی تمام نیرنگیوں اپنے تمام ناز و تبختر اپنے تمام غمزوں کرشموں اور عشووں کے ساتھ جلوہ فرما ہو اور اس زور سے جلوہ فرما ہو کہ اس کے جلوے تحت الثریٰ سے لیکر فلک الافلاک تک تمام کائنات کو معمور کر دیں تو بھی تم آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھو تاکہ اسے بھی معلوم ہو جائے کہ تم ان خوشامدی عاشقوں میں سے نہیں ہو جنہیں عرف عام میں لوڈی کہتے ہیں۔ اور جو ایک ایک جلوے کے لئے کبھی وادیوں میں اور کبھی پہاڑوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ اگر تم ایسا کرو گے تو یقین جانو کہ وہ اپنی لن ترانیوں سے باز آجائے گا ۵

مریض طفل مزاجند عاشقان ورنہ
علاج درد تغافل دو روزہ پرہیز است

صوفی کہتے ہیں کہ دریا کے کنارے پر مجلس سماع سرود قایم کرو۔ قوالی سنو۔ کھاؤ پیو۔ گاؤ بجاؤ۔

ناچو اور وجد میں آؤ لیکن پانی کے نزدیک ہرگز نہ جاؤ۔ کیونکہ دریا کا پانی اکثر بہا لے جاتا ہے۔ اور اگر دریا تمہیں بہا لے گیا تو طوعاً وکرہاً تمہیں موجوں کے ساتھ لڑنا پڑے گا اور لڑنا شانِ نفاہت و متانت کے خلاف ہے۔ اور اگر لڑو گے نہیں تو پھر بھی سراسیمگی کی حالت میں بوجہ اضطراب و اضطرار تم ایسے حرکات کے مرتکب ہوگے جو از روئے اصولِ تصوّف لغو اور بیہودہ ہونگی۔ فلہذا بہتر یہی ہے کہ پانی سے کم از کم پچیس فٹ دور کنارے پر بزم آرائی کیا کرو ✦

علاّمہ اقبال اس خیال سے بالکل اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ کنارے پر بیٹھ رہنا بڑی بزدلی ہے اور بزدلی غازیانِ اسلام کے شایانِ شان نہیں۔ ساحل پر مجلس آراستہ کرنے سے آدمی سُست ہو جاتا ہے۔ اور ایسی مجلس میں گانے بجانے کا لطف بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں سازِ ہستی سے جتنی سُریں بھی نکلتی ہیں مدھم، نرم اور سُست ہوتی ہیں۔ دل میں بجائے جوش کے رقّت پیدا کرتی ہیں۔ اور انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتیں۔ دریا کے کنارے پہنچتے ہی آنکھیں بند کرو اور پانی میں کود پڑو۔ اور ایک لمبی چھلانگ مار کر پنجاب یونیورسٹی کے لانگ جمپ کا ریکارڈ مات کر کے دریا کے عین درمیان جا رہو وہاں پہنچکر موجوں کے ساتھ لڑنا شروع کر دو۔ لاتوں مکّوں اور طمانچوں سے موجوں کا منہ پھیر دو اسی طرح مدّت العمر لڑتے رہو۔ ایسی زندگی کا ایک ایک لمحہ ہزار ہزار سال کے برابر معلوم ہوگا۔ اسی زندگی کا نام حیاتِ جاوداں ہے کہ خواجہ خضر دریاؤں میں رہتے ہیں ✦

صوفی کہتے ہیں کہ ہم طالب ہیں اور خدا مطلوب۔ ہم ملکِ عدم میں تھے کہ ہمارا مطلوب ہم سے جدا ہوگیا۔ اپنے اُس گم شدہ محبوب کی تلاش میں ہم ملکِ عدم سے دیارِ وجود میں آئے ہیں۔ اور تا حال اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور ابھی کیا معلوم ہے کہ اس جستجو میں اور کون کون سے ملکوں کی صحرا نوردی ہمارے مقدر میں لکھی ہے۔ ہزارہا میل کا سفر پہاڑوں جنگلوں اور بیابانوں میں ہم پا پیادہ طے کر چکے ہیں۔ ہزارہا میل ٹانگوں اور ٹمٹموں پر۔ ہزارہا میل موٹر کاروں اور موٹر لاریوں پر۔ ہزارہا میل ریل پر۔ اور ہزارہا میل کشتیوں، جہازوں اور طیاروں میں سوار ہو کر ہم طے کر چکے ہیں۔ مگر ابھی تک اُس

یارِ گم گشتہ کا کوئی نشان نہیں ملا ؛

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے اور قطعاً غلط۔ اصل بات یہ ہے کہ طالب خدا ہے اور ہم مطلوب۔ ہم اُس سے گم ہو چکے ہیں اور وہ ہمیں ڈھونڈھ رہا ہے۔ ہم آگے آگے جا رہے ہیں اور وہ پیچھے پیچھے آ رہا ہے اُس سے چھپ چھپ کر کشورِ وجود و عدم کے مختلف ملکوں میں ہم پھرتے رہے ہیں اور ابھی تک پھر رہے ہیں۔ لیکن ہر ملک میں اور ہر زمانے میں (اور بقول بعض ہر جنم میں) ہم مختلف جامے بدلتے رہے ہیں۔ تاکہ ہمارا طالب ہمیں آتے جاتے کہیں پہچان نہ لے۔ ہمارے فراق میں اُس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ وفورِ اشتیاقِ ملاقات میں وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے۔ دن بھر سورج کا دِیا لے کر اور رات بھر چاند کا چراغ جلا کر وہ ہمیں ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔ کبھی رعد کی زبان سے گرج گرج کر ہمیں بلاتا ہے۔ کبھی برق کی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی برگِ لالہ و گل پر اپنا پیغام لکھ جاتا ہے۔ کبھی قمریوں، طوطیوں اور عندلیبوں کے سینے سے نالہ و فریاد کرتا ہے تاکہ ہمیں اپنے دردِ دل سے آگاہ کرے۔ شوقِ دیدار میں ہمہ تن آنکھ بن کر کبھی گلِ نرگس کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کبھی بادام کی۔ ہمارے ہجر میں ہر صبح کے وقت نفسِ صبح کی صورت میں اُس کے دردآشنا سینے سے آہیں نکلتی ہیں۔ نہ معلوم لوگ اسے بے نیاز کیوں کہتے ہیں حقیقت میں وہ ہم سے زیادہ نیازمند ہے اور گرفتارِ آرزو۔ ہمارے عشق میں اُس کی حالت اگر قابلِ رحم ہے تو ہمارا اندازِ معشوقانہ قابلِ داد۔ کہ صبحِ ازل سے لے کر آج تک وہ ہماری تلاش میں ہے۔ لیکن ہم اسے نہیں ملتے۔ اور ارادہ ہے کہ شامِ ابد تک نہ ملیں گے ؛

صوفی کہتے ہیں کہ چیونٹی بنو تاکہ لوگ تمہیں پاؤں کے نیچے روند کر زندانِ ہست و بود سے نجات دلائیں۔ بھڑ نہ بنو کیونکہ اگر بھڑ بنو گے تو خواہ مخواہ کسی کو ڈنک مارو گے۔ وہ بیچارا درد سے چیخے چلائے گا۔ اور ممکن ہے کہ اس کی بددعا سے تم بلکہ بھڑوں کی تمام قوم قہرِ الٰہی کی مستوجب بن جائے۔ بھیڑ بنو تاکہ لوگ تمہارے بالوں سے گرم کپڑے بنا کر موسمِ سرما کی شدت سے اپنے تن بدن کو محفوظ کر سکیں۔ اور تمہارے گوشت سے اپنا پیٹ بھر سکیں۔ بھیڑیا نہ بنو۔ کیونکہ اگر بھیڑیا بنو گے تو ناچار روزانہ کئی جانوروں کو ہلاک کرو گے۔ اور ان کی بددعائیں تو تمھیں

مچھلی ہو تاکہ آدمی تمہیں پکڑ پکڑ کر کھائیں۔ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالیں۔ نہنگ نہ ہو ورنہ انسانوں اور مچھلیوں کی ہلاکت کا باعث ہو گے۔ اور یہ فعل نہایت قبیح ہے۔ وغیرہ وغیرہ +

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ چیونٹی نہ ہو ورنہ لوگ تمہیں پاؤں کے نیچے کچل کر مار ڈالیں گے۔ بھڑ ہو اور جو کوئی سامنے آئے اُسے ڈنک مارو۔ بھیڑ نہ ہو ورنہ لوگ تمہیں مار کر کھا جائیں گے۔ بھیڑیا ہو تاکہ جو کوئی ملے تو اُسے ہڑپ کر جاؤ اور آدمی ملے تو اُسے چٹ کر جاؤ۔ شبنم کا قطرہ نہ ہو۔ ورنہ کوئی حقیر سا پرندہ آکر تمہیں پی لیگا۔ ریزۂ الماس ہو تاکہ پرندوں کی چونچ توڑ سکو۔ ہرن نہ بنو۔ شیر یا چیتا ہو۔ سانپ ہو۔ اژدہا ہو۔ عقاب ہو شہباز ہو۔ الغرض اگر جمادی زندگی پسند ہو تو پتھر ہو تاکہ کسی کا سر توڑ سکو۔ حیوانی جامے میں رہنا چاہو تو کسی قسم کا کوئی درندہ بن جاؤ تاکہ باقی جانوروں کو چیر پھاڑ سکو۔ سست عناصر صوفیوں کی باتیں نہ سنو وہ اپنی جان کے بھی دشمن ہیں اور تمہاری جان کے بھی) +

ہم نہیں کہہ سکتے کہ صوفی سچ کہتے ہیں یا اقبال۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جہاں صوفیوں کا کلام پڑھ کر دل سرد ہو جاتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ دنیا کے شور و غوغا سے دور ہو کر کہیں گوشۂ تنہائی میں جا کر بیٹھ جائیں اور سامنے حقہ اور چائے کی پیالی رکھ کر رباعیات عمر خیام پڑھتے رہیں۔ وہاں علامہ اقبال کا کلام سنکر خون میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ تیغ بدست ابھی اُٹھ کر کہیں نکل جائیں۔ اور جہاں کوئی سلطنتِ جم ملے۔ اس پر ٹوٹ پڑیں +

لیکن علامہ اقبال[1] کی شاعری اور فلاسفی اور زندگی کا سب سے بڑا لطیفہ یہ ہے کہ جہاں اُن کی شاعری اللہ

---

[1] حضرت ادیب اسے آبادی نے جو کچھ علامہ سر اقبال کے متعلق لکھا ہے۔ اُس میں دو باتوں کو مدنظر نہیں رکھا۔ ایک تو علامہ موصوف کو اپنی قوت لایموت کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اُنہیں کسی والئی ملک سے شاہانہ وظیفہ نہیں ملتا۔ اس لئے اُنہیں اپنے قیمتی وقت کا ایک حصّہ حصولِ روزی کی نذر کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ بیرسٹری اور دیگر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اُن کی فلاسفی سراسر مجاہدانہ اور غیر صوفیانہ ہے۔ وہاں اُن کی زندگی سراپا صوفیانہ ہے۔ قوم کو خودی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور اسرارِ خودی کے نکتے بیان کرتے ہیں لیکن خود بیخود طرح کے انسان ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو دیکھو اپنے آپ کو پہچانو اور اپنے آپ کو محکم و مستحکم بنانے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ اپنے آپ کو دیکھتے پہچانتے اور محکم و مستحکم بنانے کی کوشش کرتے۔ تو دن رات ایک ایسی کوٹھی میں جس کی چھتیں اور دیواریں محض ان کی فلاسفی اور شاعری کی برکت سے کھڑی ہیں۔ ورنہ کب کی بیٹھ گئی ہوتیں۔ آرام کرسی پر لیٹے نہ رہتے۔ بلکہ یورپ کے تمام ممالک کی سیر کرتے۔ مصر جاتے ایران جاتے۔ افغانستان جاتے۔ جا بجا تقریریں کرتے لکچر دیتے اور دنیا کو بتاتے کہ اُن کا فلسفہ کیا ہے اور اُن کی شاعری کیا۔ اگر ایسا کرتے تو دنیا کے تمام ملک اُن کی قدردانی کرتے۔ اُن کے نام کی سوسائٹیاں بناتے۔ اُن کے مجسمے تیار کر کے چوراہوں پر نصب کرتے بلکہ اُن کے بت بنا کر اُن کی پرستش کرتے۔ اُن کی کتابوں کو لاکھوں کی تعداد میں چھپواتے اور خریدتے۔ آج زمانہ فی الحقیقت بیخودی کا نہیں۔ اپنی خودی کے پراپیگنڈا کرنے کا زمانہ ہے۔ جو قومیں اپنی خودی کا پراپیگنڈا کرتی ہیں۔ وہ دوسری قوموں پر حکمرانی کرتی ہیں۔ جو افراد اپنی خودی کا پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ باقی افراد سے اپنی پرستش کراتے ہیں۔ جو قومیں بیخودی کے نشہ میں چور ہو رہی ہیں وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ خواہ وہ ملت اسلامیہ کی طرح نہایت شاندار روایات کی حامل ہی کیوں نہ ہوں اور جو افراد صہبائے خودی کے نشہ سے محروم رہ کر گھروں میں بند پڑے ہیں۔ اُن کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ خواہ علم و فضل شعر و سخن اور فلسفہ میں علامہ اقبال کی طرح ان کی مجددانہ حیثیت کا پایہ ساتویں آسمان سے بھی بلند تر کیوں نہ ہو۔ نہایت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۵) ذرائع سے یہ کام پورا کیا جاتا ہے۔ و ہم علامہ موصوف پروپیگنڈا کرنے اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو خودداری کے منافی سمجھتے ہیں۔ اگر علامہ موصوف کو قوم نے اس فکر سے بے نیاز کر دیا ہوتا۔ تو یقیناً علامہ موصوف اپنا تمام وقت فلاح قوم میں صرف کرتے۔ اس پر بھی آپ نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کی ایک ہلکی سی جھلک اقبال نمبر میں موجود ہے۔ (ایڈیٹر)

افسوس کی بات ہے کہ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کے باوجود۔ بانگِ درا اور پیامِ مشرق کے باوجود زبورِ عجم اور جاوید نامہ کے باوجود علامہ اقبال اب تک نہ اپنے آپ کو دیکھ سکے اور نہ اپنے آپکو پہچان سکے۔ آج جبکہ جاوید نامہ شایع ہوچکا اور علامہ اقبال کا علمی معراج تکمیل پاچکا۔ مولانا جلال الدین رومی کی روحِ پُرفتوح ایک "آشنایانہ" انداز سے علامہ موصوف سے مخاطب ہوکر بصد حسرت و یاس یہ شعر پڑھتی ہوگی ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی   کہ باآسماں نیز پرداختی

کہا جاسکتا ہے کہ طلب جاہ و حشمت و مال و دولت اور نام و شہرت ایک صاحب کمال مرد کا شیوہ نہیں اور نہ ان چیزوں کی تلاش استحکام خودی کی تعریف میں آسکتی ہے۔ ممکن ہے یہ درست ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ علامہ اقبال اس کے جواب میں فرمائیں کہ ؎

خودی را مردم آمیزی دلیلِ نارسائی ہا
تو اے دردآشنا بیگانہ شو از آشنائی ہا
بدرگاہِ سلاطیں تا کجا ایں چہرہ سائی ہا
بیاموز از خدائے خویش نازِ کبریائی ہا
محبت از جوانمردی بجائے مے رسد روزے
کہ افتد از نگاہش کاروبارِ دلربائی ہا
چناں پیشِ حریمِ او کشیدم نغمۂ دردے
کہ دادم محرماں را لذتِ سوزِ جدائی ہا
ازاں برخویش مے بالم کہ چشمِ مشتری کوراست
متاعِ عشق نافرسودہ ماند از کم روائی ہا
بیا بر لالہ پا کوبیم و بے باکانہ مے نوشیم

که عاشق را بهل کردند خون پارسائی ها
برون رو از مسلمانان گریز اندر مسلمانی
مسلمانان روا دارند کافر ماجرائی ها

لیکن اس کا کیا جواب کہ ایک مجدد فن کے لئے اپنے خیالات کی عالمگیر تبلیغ فرض اولین ہے علامہ ممدوح کے فلسفیانہ اور شاعرانہ اسرار و رموز کی اشاعت جب تک اتنی وسیع نہ ہو کہ ہر ملک ہر گھر اور ہر فرد بشر تک اسے پہنچا دیا جائے اُس وقت تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے مشن کی تکمیل ہو چکی۔ یا اُن کا پیغام جہاں جہاں پہنچانا چاہیئے تھا وہاں وہاں پہنچایا جا چکا۔ پھر جب اس کام کو علامہ موصوف خود سرانجام دینے کی فکر نہ کریں گے تو اور کون کرے گا +

پھر سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ علامہ[1] ممدوح ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے جو مردم شناس نہیں۔ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جسمیں قدردانی نہیں اور ایسی قوم میں پیدا ہوئے جسے زندہ اقوام کی فہرست سے مدتیں ہوئیں خارج کر دیا گیا ہے۔ ہندوستانی دل و دماغ اس زمانے میں جس ذہنیت سے معمور ہے اس سے کچھ توقع رکھنی ہی فضول ہے۔ اور مسلمانوں کی آجکل جو حالت ہے وہ صد درجہ یاس انگیز ہے۔ ملک میں اور خاص کر مسلمانوں میں اگر کچھ احساس باقی ہوتا تو آپ دیکھتے کہ اقبال کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے کے لئے ہندوستان میں متعدد جماعتیں ایک خاص نظام کے ماتحت کام کر رہی ہوتیں اور کلام اقبال کا اسقدر پراپیگنڈا ہوتا کہ ان کی کتابوں کے سینکڑوں ایڈیشن مختلف شکلوں اور مختلف رنگوں میں شائع ہو کر اُن کے نسخے ہر خواندہ آدمی کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہوتے +

---

[1] یہی سب سے بڑا سبب ہے۔ ٹیگور کو دربار دکن سے سوا لاکھ روپیہ مل گیا تھا۔ کیونکہ وہ مانگنے گئے تھے۔ علامہ سر اقبال مانگنے نہیں گئے تھے۔ اس لئے محروم رہے +

ابھی کچھ نہیں گیا۔ آج بھی اگر ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمان ایران اور افغانستان کے ساتھ مل کر اس کام کے سرانجام دینے کا بیڑا اُٹھائیں۔ تو تلافی مافات ہو سکتی ہے۔ تمام ملکی اور ملی اخبارات اور رسالے اگر ذاتیات سے دور رہ کر اور معاصرانہ رشک و حسد کے اثرات سے محفوظ ہو کر اس کام کو خدا کا نام لے کر شروع کر دیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اخبار اور رسالے جو ہر سال سالنامے اور دیگر کئی قسم کے نمبر نکالتے رہتے ہیں۔ اگر گاہے گاہے اس پراپیگنڈے کے لئے بھی خاص نمبر نکالنے شروع کر دیں تو ملک اور قوم کی بہترین خدمت کر سکتے ہیں۔ نیرنگ خیال والوں نے اس مسلک پر پہلا قدم اُٹھا کر گویا اپنے تمام معاصرین کو زبان حال سے کہہ دیا ہے کہ "ایجاد[له] ہمارا کام تھا اب تقلید آپ کا کام ہے"

علامہ اقبال چونکہ خود تقلید کے قائل نہیں اور اپنے تمام اقوال و افعال میں اپنی آزادانہ راست روی سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

نکردم کدیۂ چشمے ز افلاطون و فارابی — بچشم خود تماشائے جہانِ رنگ و بو کردم

اس لئے امید ہے کہ دوسرے رسائل اور اخبارات کے ایڈیٹر اس کام میں جو علامہ موصوف سے متعلق ہے۔ محض کورانہ تقلید سے کام نہ لیں گے۔ بلکہ نیرنگ خیال کے اس فخریہ جملے کے جواب میں اپنے اپنے رسالوں اور اخباروں کے اقبال نمبر نہایت مجددانہ شان سے نکالنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ وہ اپنی جدت و ندرت کی بدولت اس نیک کام میں انہیں پوری پوری کامیابی حاصل ہو سکے +

ادیب [illegible] آبادی

له ہم نے نیرنگ خیال کے صفحہ اوّل سے یہ فقرہ محض اس لئے کاٹ دیا ہے کہ ہمارے بعض معاصر کو اس سے رنج پہنچتا تھا۔ نیرنگ خیال کا مسلک صلح کل ہے۔ اس لئے ہمیں اس فقرے کے کاٹ دینے سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ہمارا فرض صرف خدمت فن ہے۔ خدا کے فضل سے جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے اُس سے دریغ نہیں کرتے + ایڈیٹر

علامہ اقبال

(بقلم عالیجناب شہزادہ احمد علی خان صاحب "درانی" مدیر "انجمن ادبی" - کابل)

"ترجمہ حضرت نجاری لکھنوی"

جب قوم پستی و گمراہی سے اُبھرنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ تو سب سے پہلے اُس میں خود اپنی تباہ حالت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اُس بیدار شدہ جماعت میں سے کوئی فرد (جس میں سیادت و قیادت کی اہلیت ہوتی ہے) اُس کاروانِ ساکت و صامت کو اپنے بانگِ درا سے صحیح جادہ پر سرگرم عمل و جستجو بنا دیتا ہے +

چنانچہ وہ سارا جمود اور خواب غفلت جو کہ ملل اسلامیہ پر طاری تھا۔ اب اُس کا کافی احساس ہوتا جاتا ہے۔ اور اکثر ممالک میں قائدین ملت عقلِ رسا سے کام لے کر اپنی قوم کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ چنانچہ اقبال بھی اُنہیں قائدین میں سے ایک ہیں۔ جن کی دردبھری آواز نے قوم و ملت کے حق میں صور اسرافیل کا کام کیا ہے +

یہ نامور ہستی شہر سیالکوٹ (پنجاب) کی اُس سرزمین میں جو کہ مسعود سلمان۔ امیر خسرو۔ فیضی۔ غنی۔ واقف۔ غنیمت۔ بیدل اور غالب کا مولد و منشا اور بدر چاچ۔ عرفی۔ نظیری۔ صائب۔ ظہوری۔ آشکی۔ کلیم اور سلیم کی پرورش گاہ رہا ہے ۱۸۷۶ء میں ظہور پذیر ہوئی ؎ اقبال

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد　　　حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاک جہانِ مجبور　　　خودگرے۔ خودشکنے۔ خودنگرے پیدا شد!

اُن کے آبا و اجداد کشمیر کے نومسلمین میں سے تھے۔ چنانچہ توصیف کشمیر کے ضمن میں وہ خود رقمطراز ہیں ؎

سبت گردم اے ساقی ماہ سیما　　　بیار از نیاکان ما یادگارے

لہ پیری

ازاں می فشاں قطرۂ بر کشیری[لہ] کہ خاکسترش آفریند شرارے

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اقبالؔ اسکول کی ابتدائی تعلیم ختم کر چکنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور دیگر انگریزی علوم کی تحصیلات کے علاوہ فارسی زبان شمس العلما مولوی سید میر حسن صاحب مرحوم (جو نظم و نثر فارسی میں حد درجہ کا کمال اور شہرت رکھتے تھے) کے زیر سایہ اختتام کو پہنچایا۔ اور چونکہ بچپن ہی سے طبع موزوں رکھتے تھے اور اُس پر ایسے اُستاد یگانہ کی تعلیم جس کا نتیجہ لازمی یہ ہونا تھا کہ فارسی زبان اُن کے خمیر میں بس گئی۔ اور شاعری اُن کے حصّہ میں آگئی! پروفیسر آرنلڈ نے جو علاوہ فلسفہ جدید کے ادبیات عرب میں بھی ماہر تھے فلسفہ اور رموز حکمت سے اُنہیں آشنا کر دیا +

اقبالؔ نے تھوڑے ہی زمانہ میں بہت شہرت حاصل کر لی۔ اور اپنے ہم عصروں میں تعجب کا باعث بن گئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی! شروع میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر رہے۔ اور پھر علوم عالیہ کی تحصیل کی غرض سے ۱۹۰۵ء میں یورپ گئے اور تین سال کے بعد جرمنی سے پی۔ایچ۔ڈی کی سند اور ڈاکٹر کا خطاب حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے +

اقبالؔ ایام طفلی سے اُردو میں اچھا شعر کہتے ہیں۔ اور اُن کی ابتدائی شاعری میں بھی حُسن کی رعنائیاں اور عشق کی زیبائیاں کام کرتی رہی ہیں۔ اور چونکہ اُنہیں تصوّف کے ایک خاندان سے تعلق ہے۔ اس لئے اپنے کلام کو چاشنیٔ تصوف سے کچھ اس طرح آراستہ کر دیتے ہیں کہ عقل حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ چونکہ اسرار کائنات اور رموز حکمت اُن پر کھل گئے ہیں۔ اس لئے حقایق کے لاینحل عقدوں کو اپنے تخیل فلک پیما کو کام میں لا کر نہایت آسان کر دیتے ہیں۔ اور مظاہر فطرت و مناظر قدرت مثلاً لب ساحل۔ روانی آب۔ نمود سبزہ۔ سکوت دشت۔ درخشانی انجم وغیرہ کو بھی کچھ اس طرح نظم کر دیتے ہیں کہ ناظرین حیرت زدہ ہو جائیں۔ شیریں استعارے۔ لطیف تشبیہیں اور دلکش محاورات کے استعمال نے ان کے کلام کو

گویا موتیوں کا ہار بنا دیا ہے۔ نشاط باغ کشمیر میں لکھتے ہیں:۔

خوشا روزگارے خوشا نوبہارے — نجوم پرن رست از مرغزارے
زمیں از بہاراں چو بال تدروے — ز فوارہ الماس بار آبشارے
نہ پیچد نگہ جز کہ در لالہ و گل — نہ غلطد ہوا جز کہ بر سبزہ زارے
لب جو خود آرائی غنچہ دیدی؟ — چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے
نوا ہائے مرغ بلند آشیانے — در آمیخت با نغمہ جوئبارے
تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را — نہاد است در دامن کوہسارے

گوئٹے کی تعریف کرتے ہیں ؎

یک زرہ بے مایہ متاع نفس اندوخت — شوق اثر آموخت کہ پروانگی آموخت
پہنائے شب افروخت

وا ماندہ شعاعے کہ گرہ خورد و شرر شد — از سوز حیات است کہ کارش ہمہ زر شد
دارائے نظر شد

پروانۂ بیتاب کہ ہر سو تگ و پو کرد — بر شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ او کرد
ترک من و تو کرد

یا اختر کے ماہ مبینے بہ کمینے — نزدیک تر آمد بہ تماشائے زمینے
از چرخ بریںے

اُنہوں نے حسن و عشق کے میدانوں میں دشنہ ہائے جگر دوز کو زلف عنبریں میں چھپا دیا ہے اور جبین جبیں میں بجلیاں چمکا دی ہیں۔ ان کا ہر شعر شجاعت سلف کی داستان سے کہ سو ہزار داستان

سامعین پر سے نثار ہیں!

اقبال کے یہاں اگرچہ تغلقات نہیں ہوتی لیکن بات یہ ہے کہ رفعت خیال اور فلسفیانہ طرز ادا نے ان کے کلام کو بادی النظر میں مشکل بنادیا ہے جسمیں اختصار اور جامعیت کلام کے ساتھ ہر نکتہ میں حقائق و معارف کا سمندر موجزن ہے۔ بقول حضرت بیدل ؒ

معنیٔ بلند من فہم تند می خواہد   سیر فکرم آسان نیست کوہم و کوتل دارم

اقبال فلسفہ، تاریخ، الٰہیات اور سیاسیات سب میں کمال رکھتے ہیں اور اس لئے وہ ایک ہی وقت میں مدبر بھی ہیں، شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی! لیکن اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے یعنی مذہبیات۔ چنانچہ علامۂ موصوف مذہب اسلام کے بہت بڑے رہنما بھی ہیں!

اقبال نے شاعری کے سکون و اضمحلال (کہ شاعری کا روال درحقیقت اقوام کے زوال کا پیش خیمہ ہوتا ہے) کی بیخ کنی کردی ہے اور کاروانِ ملت کو قیس[1] "عشق" کے جادۂ جہاد اور علم و عمل کے میدان میں سرگرم کردیا ہے۔ اقبال

بیا کہ غلغلہ در شہر دلبران فگنیم   جنون زندہ دلاں ہرزہ گرد صحرا نیست
مرید ہمت آں رہروم کہ پا نگذاشت   بجادۂ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست

لیکن اقبال بعض اس قسم کے شعراء میں سے نہیں ہیں جنہوں نے اپنی جادو بیانی کو کام میں لاکر اپنی قوم کو محوِ حیرت تو بنادیا ہو۔ مگر بجائے زندگی کی روح پھونکنے کے موت کی تعلیم دیدی ہو! چنانچہ وہ اُن لوگوں کے خلاف ہیں جنہوں نے چند ناممکن الحصول تخیلات کی تخم ریزی کی ہے۔ یا مثلاً اکثر صوفیان مشرق کے بیجا توکل، قناعت کی تلقین دی ہے۔ اس لئے کہ اس طرح قوم سعی و عمل کے میدان سے بھٹک جاتی ہے اور ادبار و پستی میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اپنے ایک انگریزی مقالہ

۱؎ عرب کا ایک نابینا شاعر جسکے اشعارِ "حماسی" میدانِ کارزار میں شجاعت کی روح پھونکتے تھے۔

میں بھی وہ ان الفاظ میں رقمطراز ہیں :-

" انسان کی جدوجہد کا تمامی "مقصد" حیات" ہے۔ اور تمام علوم و فنون بھی اسی مقصد کے تحت میں آتے ہیں۔ اس لئے ہر علم و فن کی منفعت کا اندازہ بھی اسی نقطۂ نظر سے کرنا چاہئے۔ مثلاً بہترین فن وہ ہے جو فطری قوت ارادی کو نشو و نما پہنچائے۔ اور ہمیں کارزار حیات میں "مقابلہ" کی صلاحیت بخشے۔ چنانچہ وہ تمام سُلا دینے والے موثرات جو "حقیقت" سے گریز کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ فی نفسہ انحطاط و ممات کا پیغام ہیں۔ اور اس قسم کے ادبیات جو ہمیں نشہ میں ڈال دینے والے ہوں قابل اخراج ہیں۔ اور " علم کو علم" کی غرض سے حاصل کرنے کا اصول، زمانۂ تنزل کی ایجاد ہے جو ہمیں جذبۂ عمل اور ذوقِ حیات سے محروم کر دیتا ہے" ۔ (مقتبس مقالۂ اقبال از "نیو ایرا")

لیکن غم و الم کی داستانیں جو اُنہوں نے قلمبند کی ہیں۔ وہ اُن کی سحر بیانی کا ثبوت دے رہی ہیں۔ ان میں ہر ہر بات اسلاف کے کارناموں کی تفسیر ہے۔ اور ایک ایک شعر گویا محبّتِ قومی کا داغ ہے۔ جسمیں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ اور اس طرح وہ صفحۂ تاریخ کو ایک حدیقۂ رنگیں بنا رہے ہیں !

اقبال نے بھی رومی کی قیادت میں معرکۂ حسن و عشق طے کرنے میں تصوّف میں فلسفہ کی چاشنی دیکر آب رکنا باد و گلگشت مصلّی کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ علو تفکر اور نزاکت تخیال میں وہ کلیم کی یادگار ہیں اور حسن تخاطب میں بلبل شیراز (عرفی) ہیں۔ تمثالیہ میں غنی کشمیری اور صائب اصفہانی کا جواب ہیں۔ تغزل میں بھی حافظ اور نظیری کے جرعہ کش ہیں۔ اور شاعرانہ حیثیات کے علاوہ اقوام و اُمم کا فلسفہ و تاریخ اور ان تمام رموز حکمت و الہیات سے بھی واقف ہیں۔ جو نوع انسانی کی ترقی کے سامان بن سکتے ہوں۔ پھر علوم دینیہ اور اسلامی معلومات بھی بدرجۂ کمال رکھتے ہیں ! کتب یورپ کے مطالعہ نے اُنہیں حسیات و جذبات انسانی کا نبّاض بنا دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ان کی تصانیف شرق و غرب میں ایسی مقبولیت کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں جن کی صفت میں ایک کلمہ لکھنا بھی میرے

قلم کی طاقت سے باہر ہے!

اقبال نے اپنے قلم کو اُن نقائص سے جو قوم و ملّت کے ادبار و پستی کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً نفاق و بے مروتی وغیرہ۔ باز رکھا ہے۔ اور پند و نصائح کا باب کبھی تو طیور کی زبانی اور کبھی اجرام فلکی کی زبانی کھولا ہے۔ چنانچہ ایک جہانِ ساکت و صامت کے ادبار و فلاکت کو چاند کی زبانی جیب دہشتناک تشبیہوں کے وسیلے سے حسب ذیل انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

شورہ بوم از نیش کژدم خارخار — مور او اژدر گر و غضب شکار
صرصر او آتش دوزخ نژاد — نہ رون ابلیس را باد مراد
آتشے اندر ہوا غلطیدۂ — شعلۂ در شعلۂ پیچیدۂ
آتشے از دود پیچاں تلخ پوش — آتشے تندر غو و دریا خروش
در کنارش مارہا اندر ستیز — مارہا با کفچہ ہائے زہر ریز
شعلہ اش گیرندہ چوں کلب عقور — ہولناک و زندہ سوز و مردہ نور

اے خدا چشم کبود و کور بہ — اے خدا ایں خاکداں بے نور بہ

اقبال نے ایک نظر میں انحطاط عالم اسلامی کا احساس کر لیا۔ اور پستی ملّت، زبونیٔ قوم، مصائب امت، زوال مفاخر اسلامی اور قائدین کے مُہر سکوت کو بھی توڑ دیا۔ اُن کی خداداد طبیعت نے سینہ سوز آہوں اور جانکاہ نالوں کو نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ پہلے اردو اور پھر فارسی کے ذریعہ تمام مشرق میں پہنچا دیا ؎ اقبال

عشق پامالِ خرد گشت و جہاں دیگر شد — بود آیا کہ مرا رخصت آہے بخشد

اقبال نے نالہ ہائے بیتاب کو جو جگر میں تڑپتے ہوئے تھے آزاد کر دیا۔ اور اس داستان غم آلود کو

جو نظروں سے پوشیدہ تھی نمایاں کر دیا۔ اور تمام عالم اسلامی کو امتیاز ملت و وطن کے نقائص اور ان کے نتائج سے متنبہ کر دیا۔

اقبال حدود جغرافیائی اور امتیاز رنگ و بو کو ذوق طلب توحید مطلق و نیز مذہب اسلام کے ارتقا میں رکاوٹ پاتے ہیں اور اس بنا پر خواہش کرتے ہیں کہ تمام افراد و اقوام پریشان کو ایک ہی سلک میں منسلک ہونا اور تمام عالم اسلامی کے لئے ایک ہی قلب مشترک ہونا چاہئے ؎

قلب ما از ہند و روم و شام نیست　　مرز و بوم او بجز اسلام نیست

اور پھر ان کا یہ عقیدہ ہے ؎

گوشے باید کہ گردوں از ضمیر روزگار　　دوش من باز آرد اندر کسوت فردائے من

وہ محض قرآن کی پیروی چاہتے ہیں ؎

گر تو میخواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بقرآں زیستن

دل بسلمیٰ عرب باید سپرد　　تا دمد صبح حجاز از شام کرد

اندکے از گرمی صحرا بخور　　بادۂ دیرینہ از خرما بخور

اقبال ہر جگہ اپنی ملت کو گمراہی سے آگاہ کرتے ہیں ؎

ترسم کہ تو میرانی زورق بسراب اندر　　زادی بحجاب اندر میری بحجاب اندر
چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فروشستم　　تقدیر امم دیدم پنہاں بکتاب اندر
برکشت و خیاباں پیچ برکوہ و بیاباں پیچ　　برقے کہ بخود پیچد میرد بسحاب اندر
بے درد جہانگیری آں قرب میسر نیست　　گلشن بگریباں کش اے بوئے گلاب اندر

اقبال خدا سے بھی یہی آرزو کرتے ہیں کہ ایسی تاثیر اور سوز مرحمت ہو کہ اپنی سوتی ہوئی قوم کو بیدار کر سکیں۔ قوم طلب جستجو میں سرگرم عمل ہو جائے۔ اور گلشن خزاں رسیدۂ اسلام دوبارہ خرم و شاد ہو جائے ؎

اے کہ زمن فزودہ گرمئی آہ و نالہ را　　زندہ کن از صدائے من خاک ہزار سالہ را
غنچۂ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشای　　تازہ کن از نسیم من داغ درون لالہ را

اشک چکیدہ ام بہ بیں ہم بنگاہ خود نگر　　ریز بہ نیستان من برق و شرار ایں چنیں

اقبال دنیائے اسلام سے ناامید نہیں ہیں۔ وہ اس خاکستر گرم کی ایک چھوٹی سی چنگاری میں بھی آفتاب دیکھتے ہیں۔ اور ان کی آنکھ رات کی تاریکی میں اقبالمندی کے ان تاروں کو دیکھ رہی ہے۔ جو تعلیمات قرآن کے فیوض سے مسلمانوں کو حاصل ہو سکتے ہیں ؎

بخواں از بر صداقت عدالت شجاعت را　　کہ عالم باز می گیرد ز تو کار امامت را

اقبال کے تمام تعلیمات آرزوؤں سے لبریز ہیں اور ناامیدی و یاس سے وہ ہمیشہ مخالف رہے ہیں ؎

در طلب کوش و مدہ دامن امید ز دست　　دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے!

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار　　ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار

ز قید و صید نہنگاں حکایتے آور　　مگو کہ زورق ما روشناس دریا نیست

اقبال ہر جگہ خودی کا درس دیتے ہیں تاکہ قوم بغیر کسی دوسرے کی اعانت کے اپنے مقاصد حاصل کر سکے اور میدان علم و عمل میں قدم زن ہو سکے ؎ "بمنزلے رسد آں ملتے کہ خود نگر است"

ناک خویش طلب آئینے کہ پیدا نیست — تجلی دگرے درخور تماشا نیست

مرید پیر خراباتیان خود بیں شو! — نگاہ او ز عقاب گرسنہ تیز تر است

اے زاہد ظاہر بیں گیرم کہ خودی فانیست — لیکن تو نمی بینی دریا بحباب اندر

من فقیر بے نیازم مشربم اینست و بس — مومیائی خواستن نتوان شکستن میتوان

مثل آئینہ مشو محو جمال دگراں — از دل و دیدہ فروشوی خیال دگراں

آتشی از نالۂ مرغان حرم گیر و بسوز — آشیانے کہ نہادی بہ نہال دگراں

شہزادہ احمد علی خاںؒ

اقبال کی شاعری پر قیامِ یورپ کا اثر

(از جناب مسٹر ممتاز حسن ایم۔اے۔ اسسٹنٹ اکونٹنٹ جنرل پنجاب)

قیامِ ولایت کے دوران میں اقبال کی اردو شاعری ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے اُس کی ذہنی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس اعتبار سے بانگِ درا کے حصۂ دوم کی نظمیں ایک غیر معمولی دلچسپی رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں اقبال کے شاعرانہ ماضی کی یاد دہانی اور اُس کے شاعرانہ مستقبل کا پیش خیمہ ہیں۔ سوامی تیرتھ کی وفات پر جو نظم لکھی گئی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال پر ابھی تک تصوف کے ازلی خیالات کا اثر باقی تھا ؎

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا　　لا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلّا اللہ کا

مگر دوسری نظموں میں یہ اثر معدوم ہے۔ اگر ان نظموں پر ایک غائر نگاہ ڈالی جائے تو ان میں ذیل کی خصوصیات نظر آتی ہیں:

(۱) زندگی کا شدید احساس جو ایک حد تک ابیقوریت تک جا پہنچا ہے۔ حسن اور خصوصاً انسانی حسن سے دلبستگی جو عشق کے مترادف ہے +

(۲) جذبات کی غیر معمولی نزاکت اور محبت کا لطیف مضمون۔ ایک ہلکا سا تنوطی انداز جو حساس نوجوانوں سے مخصوص ہے۔

(۳) زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کی ترجمانی یعنی اقبال کے دل و دماغ سے بتدریج اس خیال کا ظہور کہ زندگی کوششِ پیہم کا نام ہے۔ اقبال کی "پیغمبری" کا آغاز ۔ یہ تمام خصوصیات یکساں طور پر اہم نہیں ہیں۔ بلکہ اگر اقبال کی اردو شاعری کا یہ حصہ ارتقائی حیثیت سے اہم نہ ہوتا تو شاید ۳ کے علاوہ اور کوئی خصوصیت قابلِ ذکر نہ ہوتی +

*

یورپ میں جہاں ہر شے سے زندگی کے آثار ابلے پڑتے ہیں۔ جہاں تہذیب و تمدن کے لاکھوں رنگین کھلونے آنکھوں کو فریب دینے کے لئے موجود ہیں۔ ایک نوجوان کے دل میں "عشرتِ امروز" کی تمنا پیدا ہو جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ مگر ہم اس "احساسِ زندگانی" کو ابیقوریت کہنے میں شاید حق بجانب نہ ہوں۔ کیونکہ اقبال کو کائنات کی ہر ایک چیز اس عشرت سے لبریز نظر آتی ہے اور وہ خود بھی اس میں شریک ہونا چاہتا ہے ؎

ہے گرم خرام موجِ دریا   دریا سوئے بحر جادہ پیما

بادل کو ہوا اڑا رہی ہے   شانوں پہ اٹھائے لا رہی ہے

عادت گیر ہے وجود ہر شے   سرمستِ مئے نمود ہر شے

کوئی نہیں غمگسارِ انساں   کیا تلخ ہے روزگارِ انساں

اقبال کے لئے یہی احساس حسن کا احساس بھی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حسن کا جتنا وسیع احساس اقبال کو اس زمانے میں ہوا ہے کسی کو نہیں ہوا۔ حسن سب سے پہلے اقبال کو مناظرِ قدرت میں دکھائی دیتا ہے ؎

ہے تختِ لعلِ شفق پر جلوسِ اخترِ شام   بہشتِ دیدۂ بینا ہے حسنِ منظرِ شام

... تکیہ میں چشموں کے لبری ہو [illegible]   دعائے طفلکِ گفتار آزما کی مثال

مگر اس حسن کی انتہا انسانی حسن میں چمکتی ہے ؎

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا   آنکھوں میں ہے سلیمیٰ تیری کمال اس کا

حسن ارتقائے کائنات کی آخری منزلِ مقصود ہے۔ اس کا احساس انسان سے خاص نہیں (ملاحظہ ہو "..." کی خود میں بھی ممکن نظامِ عالم کا ہر جزو حسن کی تکمیل میں کوشاں ہے۔ اسی کوشش کا نام عشق ہے ؎

. . . .

مگر اس حسنِ بے پایاں کا جو تمام کائنات کا منتہا ہے۔ کائنات کی موجودہ منزلِ ارتقا میں کامل جلوہ نہیں ملتا۔ حسن ناپائدار ہے "حقیقتِ حسن" میں اقبال نے انگریز شاعر ہیرک کی طرح اس ناپائداری کا نوحہ کیا ہے کبھی کبھی اسے یہ بھی شک ہوتا ہے کہ وہ حسن جس کی تمنا میں انسان بیتاب ہے کہیں محض انسان کے بیقرار دل کا ایک وہمِ رنگین ہی نہ ہو ؎

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بیتاب   پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب

آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں   خاتمِ دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں

"کلی" میں بھی شاعر اسی حسن کی تلاش میں ہے۔ مگر ان سب جذبات کا عطر "عاشقِ ہرجائی" ہے۔ میرے خیال میں یہ نظم اقبال کی کیفیاتِ شباب کی زندہ تصویر ہے۔ ایسی نظم کوئی شاعر چالیس سال کی عمر کے بعد نہیں لکھ سکتا۔ شاعر کی

وسعت طلب کا اندازہ ایک شعر سے ہو سکتا ہے ؎

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں

اس آتشین تمنا کے ساتھ ساتھ ایک اور نفسی کیفیت (مایوسی) کا پیدا ہو جانا بھی ناگزیر ہے۔ کیونکہ ایسی آرزوئیں پوری ہونے کے لئے پیدا نہیں کی گئیں حقائق زندگی میں کبھی وہ لطافت اور کمال پایا نہیں ہو سکتا جس سے وہ انسان کے اس تخیل کی پرواز کو جا لیں ؎

فیض ساقی شبنم آسا ظرف دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں آتش زیر پا رکھتا ہوں میں

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں

محفل ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن
پھر تخیل کس لئے لا انتہا رکھتا ہوں میں

" نوائے غم " میں کم و بیش یہی قنوطی انداز قائم ہے۔ " ایک شام " بھی، جس میں اداسی کے ازالے کے لئے فطرت کے سکون سے سبق لیا ہے۔ یہ نظم ورڈزورتھ کی شاعری کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ایک اور جگہ کہا ہے ؎

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل

اس صنف کی اداسی یورپ کے رومانی شعرا کا خاصہ ہے۔ اقبال کا انداز اس زمانہ میں شعرائے مغرب کی اسی جماعت سے ملتا ہے۔

اگر اقبال کے قیام ولایت کی شاعری کی دوسری خصوصیت کو دیکھنا ہو تو " حسن و عشق " " حقیقت حسن " " کلی " " کی گود میں بلی دیکھ کر " " فراق " ہر ایک نظم میں اس کی جھلک نظر آئیگی۔ یہ خصوصیت کوئی انوکھی چیز نہیں۔ احساس حسن اور احساس محبت دو الگ چیزیں نہیں جن سے دلبستگی ہی کا نام عشق ہے۔ اور عشق جب وارد ہوتا ہے تو اپنے اظہار کی قوت بھی ساتھ ہی لے آیا کرتا ہے ؎

جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمین قمر
نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر

جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول

جلوۂ طور میں جیسے ید بیضائے کلیم
موجۂ نکہت گلزار میں غنچے کی شمیم

ہے ترے سیل محبت میں یونہی دل میرا

میرے خیال میں یہ نظم بجائے خود دنیا کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ ایسے لطیف اور نازک جذبات کی نظیر امرؤ القیس یا چند اور عرب شاعروں ہی میں مل سکتی ہے ۔

محبت کا دائرہ اقبال نے مجنوں و لیلیٰ کے معاملات ہی پر محدود نہیں کیا۔ بلکہ اسے نظامِ عالم کی روح سمجھا ہے جب عالمِ بالا میں "محبت" کا نسخہ مختلف اجزا سے تیار ہو چکا۔ تو ؎

مہوّس نے یہ پانی ہستیِ نوخیز پر چھڑکا گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

شیلے کا فلسفۂ محبت بھی یہی تھا۔ یعنی وہ اجزائے عالم کی باہمی وابستگی کو محبت سے تعبیر کرتا تھا اور محبت کے بغیر کائنات کا وجود ناممکن خیال کرتا تھا۔ اقبال کہتا ہے ؎

شیشۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے عشق
دلِ ہر ذرّہ میں پوشیدہ کسک ہے اسکی نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اسکی

اس زمانے میں اقبال کی طبیعت پر ایک خاص قسم کی رقت چھائی ہوئی تھی۔ اکثر نظموں میں ایک سوز ہے۔ جو کسی میٹھے راگ کی لَے کی طرح دل میں بس جاتا ہے ؎

نغمۂ یاس کی دھیمی سی صدا اٹھتی ہے اشک کے قافلے کو بانگِ درا اٹھتی ہے
سکوتِ شامِ جدائی ہُوا بہانہ مجھے کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے

ایسی مثالیں عام ہیں۔ مگر اقبال نے جس پیار سے سسلی کو مخاطب کیا ہے۔ اس کے سامنے سب ہیچ ہیں ؎

آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے
ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام
تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

بلاشک و شبہ قیامِ ولایت کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اقبال کی "پیغمبرانہ" شان کا آغاز ہے۔ اس سے پہلے

کا اقبال شاعرِ محض ہے۔ مگر اس کے بعد کا اقبال دنیا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً ایک حیاتِ تازہ کا پیغام دینے کیلئے بیتاب ہے۔ اور اس پیغام کو ہزاروں طریق سے دُہراتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اگر اقبال ولایت نہ جاتا تو اس کی شاعری۔ بلکہ اسکی زندگی کا رُخ کچھ اور ہوتا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ اقبال کے روحانی ارتقا کی اہم ترین منزل ہے۔ اس عرصہ میں اقبال کو تہذیب مغرب کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ ہی اقبال نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے سلسلے میں اسلامی فلسفہ اور اسلامی علوم کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور اسے تہذیب اسلام اور تہذیب مغرب کا جائزہ کرنے کا موقع ملا۔ اس موازنے کا اثر یہ تھا کہ اقبال کی زندگی کا عظیم الشان نصب العین یعنی اسلام کے اصولوں کی علمبرداری اس کے سامنے معین ہو گیا۔ اور اس کے تخیل اور جذبات نے اپنے لئے ایک راہ مقرر کر لی۔

اس سے قبل کہ اقبال کی زندگی کا نصب العین معین ہو۔ اس کے فلسفۂ زندگی کی تشکیل ہوئی۔ جو اس کے پیغام کے ہر پہلو میں مضمر ہے۔ اور جس کی بنیاد ذوقِ تپش اور ذوقِ عمل پر رکھی گئی ہے۔ یہ فلسفہ ولایت جانے سے پہلے کلام میں بھی جھلکتا ہے ؎

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو   کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

مگر ولایت کی چند نظموں مثلاً "طلبہ علیگڑھ کالج کے نام" "چاند اور تارے" وغیرہ میں اس فلسفے نے ایک باقاعدہ صورت اختیار کر لی ؎

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں   کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

اس رہ میں مقام بے محل ہے   پوشیدہ قرار میں اجل ہے

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے   زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

اس فلسفے نے اقبال کو اس کی "پیغامی" شاعری کی راہ دکھائی۔ سب سے پہلے اقبال مغرب کی سرد روحانیت سے بیزار ہوا ؎

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر   اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھکو تو خانہ ساز دے

پھر "عبد القادر کے نام" میں اس کے پیغام کا دُھندلا سا آغاز ہوا ؎

رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اٹھالیں اپنا   سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلےٰ بیکار   قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

اور مارچ ۱۹۰۷ء کی نظم میں اقبال نے مکمل طور پر اپنے شاعرانہ ماضی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ؎

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے   بنے گا سارا جہاں میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

اسی نظم میں اقبال نے "طلوع اسلام" کی پیشینگوئی کی ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا   سنا ہے میں نے یہ قدسیوں سے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

تہذیبِ مغرب کی زر پرستی اور انسانی ہمدردی کے فقدان کی تنقید مخالفانہ بھی پہلے پہل اسی نظم میں ہوئی ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے   کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی   جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس سلسلے میں اقبال کی ایک غزل کے دو شعر بھی اہم ہیں جن سے مغربی قوموں کا مطالعہ اور اسلام اور وطنیت کا باہمی تعلق واضح ہوتا ہے ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا   بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے
مدیرِ مخزن سے جا کے اقبال کوئی میرا پیام کہہ دے   جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اقبال کے دل کی یہ کیفیت بھی جنگِ طرابلس کے نظارہ نے ملی جذبات میں آگ لگا دی۔ اور اسکی آنکھوں کے سامنے قدیم اسلامی عظمت کا نقشہ پھر گیا ؎

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی   بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے   بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور   کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

اگر اس مضمون میں تفصیل کی گنجائش ہوتی تو میں چند اور چھوٹی چھوٹی خصوصیات کا بھی ذکر کرتا۔ مثلاً اقبال کا اندازِ بیان پختہ اور اسکے کلام کا تغزلی عنصر بہت نمایاں ہو گیا۔ جیسے ؎

یہ کیفیت ہے مری جانِ ناشکیبا کی   مری مثال ہے طفلِ صغیرِ تنہا کی

یا ؎   ستاروں کو نہ ہونا شوق بحر کا نہ ہونا عشق   ہے بحر کو تپش ماہِ تمام کے لئے

مزید برآں، اکثر نظمیں ایسی ہیں جنکو یورپ کے نقاد "ادب للادب" سے تعبیر کرینگے یعنی جو محض شاعری کا نمونہ ہیں جیسے "اخترِ صبح" "ایک شام" وغیرہ ؎

تاروں کا خموش کارواں ہے   یہ قافلہ بے درا رواں ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے   نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

اگر اقبال کے تمام ولایت کی شاعری کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے۔ تو اس میں ایک حساس بیقرار اور آتشیں شباب نوجوان کی تصویر نظر آتی ہے۔ اقبال کا شعر ہے ؎

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے   گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

یورپ کی دلفریب دنیا ایک پر بہار گلستاں کے مانند تھی جہاں سے اقبال ایک جوئے نغمہ خواں ہو کر گذرا۔ مگر جب زندگی کے کوہ و بیاباں اسکی نظروں کے سامنے آئے تو وہ ایک سیلِ تند رو بن گیا۔ اور ایک دنیا کو اپنے طوفانِ محشر خیز میں بہا کر لے گیا +

ممتاز حسن

علامہ اقبال کی شاعری

(از صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم۔ اے اورینٹل کالج۔ لاہور)

کسی فن کار کے کمالات فن پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس فن کے لوازمات کو سمجھنا اور اس کا ایک صحیح معیار قائم کرنا از بس ضروری ہے۔ اس کے بغیر تنقید و تبصرہ کی تمام کوششیں بے سود ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ جواہرات کو پرکھنے کے لئے نظر درکار ہے۔ یہاں نظر سے مراد یہی معیار ہے جس کے ذریعہ نہ صرف ہم کھوٹے کھرے میں تمیز کر سکتے ہیں۔ بلکہ جواہرات کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ لازمی ہے۔ کہ شاعری کا صحیح اور معیاری مفہوم ہمارے ذہن میں ہو۔

شاعری کیا ہے؟ شعر اور اس کے لوازمات کیا ہیں؟ مشرق و مغرب کے مختلف نقادانِ فن نے اپنے اپنے معیار، اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور طرح طرح کی گل افشانیاں کی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ شعر منظوم کلام کا نام ہے۔ الفاظ کی برجستگی، تراکیب کی چستی، انداز بیان کی سادگی کا نام ہے۔ اگر ان ظاہر پرست، ناقدانِ فن کے اس مادیت آگین نظریہ کو درست تسلیم کر لیا جائے۔ تو لکھنؤ کے ایک چرب زبان، شوخ گفتار پان فروش لونڈے کی موزوں گفتگو، فسانہ عجائب کی مقفیٰ عبارت شیخ ناسخ کی منظومات اور غالب مرحوم کے شعری الہامات میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ صاحب ذوق سمجھتا ہے۔ کہ شاعری کا یہ معیار پست شعر کو بام فلک سے حضیض ثریٰ میں گرا دیتا ہے۔ یہ ایسی ذلت ہے۔ جسے شیدایان شعر و شاعری کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتے وہ جانتے ہیں۔ کہ ایسا کلام ایک بت ہے۔ جس کا جسم حسین خط و خال، جمیل نقش و نگار تو رکھتا ہے لیکن روح غائب ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ شاعری علوئے تخیل کا نام ہے۔ بلند اور لطیف جذبات و احساسات کا نام ہے۔ جو الفاظ

کی قید و بند سے آزاد بذات خود مستقل حیثیت رکھتے ہیں ۔ اگر یہ درست ہے ۔ تو ایک فلسفی کے تخیلات کی آزاد و بلند پروازیاں بزرگان دین کے الہامی فقرات ، عاشقان تفتہ جگر کی دل ہلا دینے والی فریادیں شعر کہلانے کی مستحق ہیں ۔ شعراء و جذبات و احساسات کے عام اظہار میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا ہے ۔ اس حقیقت سے کس کو انکار ہے کہ دنیا کے تمام صنعت گر یا فن کار تخیل ہی کی بدولت دنیا میں اپنا نام روشن کرتے ہیں ۔ اُن کا آئینہ دماغ دوسروں کی نسبت زیادہ جاذب نقوش ہوتا ہے ۔ اُن کے دل عوام کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتے ہیں ۔ وہ قدرت کے جلووں کو دیکھتے ہیں ۔ وہ فطرت کی نیرنگیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔ کائنات کا ہر ذرہ اُن کے لئے حسین و جمیل ہے ۔ دنیا کا ہر واقعہ اُن کے لئے آئینۂ عبرت ہے ۔ وہ ہر لحظہ ہر شئے میں ایک نئی حقیقت کو جلوہ گر دیکھتے ہیں ۔ اور اس احساس حسن و درس عبرت ، اس فلسفۂ حقیقت کے اظہار کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں ۔ تمام فنون لطیفہ کے ماہرین کا یہی حال ہے ۔ لیکن کیا ان میں سے ہر ایک کے اظہار کی نوعیت ایک سی ہے ۔ کیا ہر ایک کے صنعتی نتائج یکساں ہیں نہیں معمار کا حسن فن معماری ، مصور کا اظہار کمال مصوری اور شاعر کا نتیجہ فکر شاعری ہے ۔ پس کوئی چیز ہے ۔ جو ان تینوں اہل فن کے انداز بیان کو حسن کے احساسات عالم تصور میں کم و بیش مساوی درجہ رکھتے ہوئے ۔ ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں ۔ کیوں ایک معمار اپنے فن کے اظہار کے لئے خشت و سنگ تلاش کرتا ہے ۔ کیوں ایک مصور رنگ آمیزی اور شاعر الفاظ آفرینی سے کام لیتا ہے ؟ یہی شئے ان تینوں صنعت گروں کے کمالات فن کو جداگانہ حیثیت سے سرفراز کرتی ہے ۔

پس نہ تو محض لفظ آرائیوں کا نام شاعری ہے ۔ اور نہ محض تخیل کی بے قید و بند بلند پروازیوں کا ۔ دونوں کا وجود نہایت ضروری ہے ۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں ۔ لیکن ان لفظ آرائیوں کی نوعیت کیا ہے ؟ ہم دیکھتے ہیں ۔ کہ جب تک معمار اپنے تخیلی تعمیرات کو ظاہری موزونیت سے آراستہ نہیں کرتا ۔ اس کا نتیجۂ فن شاہکار کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا ۔ اسی خاص موزونیت نے دنیا کی عظیم الشان عمارات کو صنعت گری کا بہترین نمونہ بنا دیا ہے ۔ اگر مصور اپنے خاص انداز میں رنگ آمیزیوں سے کام نہ لے ۔ تو اس کے نقوش فنی اعتبار سے ناقص رہ جائیں ایک عام

معمار کی غیر صنعتی تعمیر اور ایک ماہر فن صنعت گر کے شاہکار میں وہی فرق ہے جو ایک حشت و سنگ کے ڈھیر اور تاج محل میں ہے۔

پس دوسرے فن کاروں کی طرح شاعر کو بھی اظہار خیال کے لئے موزوں ذرائع کی ضرورت ہے۔ جو اس کے جذبات و احساسات کی کما حقہٗ ترجمانی کر سکیں۔ اور اس کے تخیلی مجسمات کو زندہ کر دینے میں ممد ہوں۔ اگر موزوں اور مؤثر الفاظ میسّر نہ آئیں۔ تو تخیلات انداز بیان کی نامربوطی سے اپنی ہستی کھو بیٹھتے ہیں۔ اور اگر علوئے تخیل، جذبات و احساسات کی لطافت مفقود ہو۔ تو محض الفاظ تراشی بت گری ہوگی۔ شاعری نہ ہوگی۔ مؤثر پیرایۂ بیان اور تخیل کا امتزاج ایسا ہی ہے۔ جیسے کسی جری۔ دلیر بہادر سپاہی کے ہاتھ میں تلوار لیکن بلندیٔ خیال کے بغیر الفاظ نگاری کی بھی حیثیت ہوگی۔ جو تلوار کی کسی نامرد کے ہاتھ میں جو بالکل اس شعر کے مصداق ہے ؎

نامرد کے ہاتھ میں پہنچ کر شمشیر نیام ہوگئی ہے

جب علوئے تخیل کے ساتھ دلکش انداز بیان شامل ہو جائے۔ جب الفاظ و معانی اپنی لطافت و وسعت کو قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے میں جذب ہو کر "او ورمن ومن درو۔ شد چوں بوئے گلاب اندر" کا ورد کرتے ہوئے نظر آئیں۔ جب دونوں کی آمیزش اس شراب و شیشے کے وصال کی طرح ہو جنہیں دیکھ کر یہ بتانا مشکل ہو۔ کہ شراب شیشے میں ہے یا شیشہ شراب میں۔ تو سمجھ لیجئے۔ کہ شاعر اپنی مساعی میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اور صوری اور معنوی دونوں اعتبارات سے اس کا شاہکار شاہکار کہلانے کا مستحق ہے۔

خیالات کی بلند آہنگی، جذبات کی نفاست، الفاظ کی برجستگی، انداز بیان کی موزونیت اور پھر دونوں کی باہمی لطیف آمیزش جس قدر زیادہ کامیاب ہوگی۔ اسی قدر شاعر کا کمال اور شاعری کا معیار بلند ہوگا۔

آج سے چند سال پیشتر حضرت اقبال کی شاعری کے متعلق دو متضاد رائیں سننے میں آتی تھیں۔ اور آج بھی جبکہ ان کے کمال فن کے اظہار نے متعدد تصانیف کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ اختلاف رائے بعض حلقوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک گروہ انہیں ہندوستان بلکہ ایشیا کا بہترین شاعر سمجھتا ہے۔ اور دوسرے گروہ کو اپنی پست ذہنیت

اور کور ذوقی کے ، بحث اس میں شک ہے ۔ یہ مؤخرالذکر ادبی کافروں کا گروہ اگر کبھی اپنی بدذاتی کے اخفا کی غرض سے اُس کے کمالات شاعری کا اعتراف دبی زبان میں کرتا بھی ہے ۔ تو عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوتا ہے ۔ کیونکہ ایسے اصحاب کی تحسین ؏ "تحسین ناسخن شناس" کا حکم رکھتی ہے ۔ حضرت اقبال کی شاعری تو خیر ایک بلند شے ہے کسی معمولی شاعر کے کلام کو سمجھنے اور اس کی صحیح داد دینے کے لئے سلیم المذاق ہونا نہایت ضروری ہے ۔ اور حق تو یہ ہے ۔ کہ شعر گوئی کی طرح شعر فہمی بھی ایک فطرتی عطیہ ہے ۔ جو اکتسابِ علم سے حاصل نہیں ہو سکتا ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بسا اوقات ایک فاضل اجل ، ایک ماہر عروض ، ذوقِ سلیم سے عاری ہونے کے باعث شعر وسخن کی گوناگوں دلچسپیوں سے لذت اندوز نہیں ہو سکتا ۔ وہ اس اندھے کی طرح ہے ۔ جو کسی باغ میں فضائے رنگ و بو کی سیر کے لئے نکل آئے ۔ اور اپنی کوشش میں ناکام رہنے پر باغ کی شکایت کرے ۔

مذاق کی بلندی اور پستی کے ظاہری اختلاف کے علاوہ حضرت اقبال کے کلام میں ایک خصوصیت اور بھی ہے جو بعض اوقات اشعار کی تہ تک پہنچنے میں حارج ہوتی ہے ۔ وہ اُن کے تخیل کی فلسفیانہ دقت طرازیاں ہیں ۔ وہ لوگ جو اُن کے کلام کو محض تفریح کی غرض سے دیوانِ داغ کی طرح اٹھا کر پڑھنے اور اس سے لذت اندوز ہونے کے متمنی ہیں اکثر مایوس ہو جاتے ہیں ۔ اور اگر وہ کچھ سمجھتے بھی ہیں ۔ تو وہ حقیقت سے بہت دُور ہوتا ہے ۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا   اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

یہ انہی دقت طرازیوں کا نتیجہ ہے ۔ کہ اُن کا کلام ہمیشہ معرضِ بحث میں رہا ۔ اور ایک عرصہ تک رہیگا ۔ انہیں خود اس بات کی شکایت ہے ۔ کہ اُن کے پیغام کے سُننے والے بہت کم ہیں ۔ بلکہ زمانہ حال کی فضا ہی اُن کے لئے موافق نہیں ۔ وہ ہر ذی ہوش مخترعِ فن کی طرح اپنے ہمعصروں سے ، بہت بلند نظر واقع ہوئے ہیں ۔ اُن کا پیغام "شاعرِ فردا" کا پیغام ہے ۔ اُن کے اسرار کو کما حقہ سمجھنے کے لئے آئندہ نسلیں زیادہ موزوں ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں ؎

بے نیاز از گوشِ امروز آمدم   من صدائے شاعرِ فردا ستم

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست یوسفِ من بہر ایں بازار نیست

اور پھر اپنے ہم عصروں کی بے خروش زندگی افسردہ اور جامد زندگی کا اپنی بے تاب طبیعت سے موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

نغمہ ام یاراں چوں شبنم بے خروش شبنم من مثل یم طوفاں بدوش
نغمۂ من از جہانے دیگر است ایں جرس را کاروانے دیگر است

دنیا اکثر ایسے ذی ہوش اصحاب کمال سے بے اعتنائی کی مرتکب ہوتی رہی ہے۔ اور اپنی کم فہمی کے باعث اُن کے حیات افزا پیغامات کو گوش غفلت سے سنتی رہی ہے۔ اگر دنیا کی آنکھیں کھلی ہیں۔ تو ان ارباب کمال کی موت کے بعد جاں لوگوں نے اُن کے نورانی جسموں کو نظر بھر کے دیکھنے کی پروا نہیں کی۔ وہاں پھر اُن کے آرام گاہوں کی تیرہ خاک کی پرستش ہوئی۔ وہ لوگ مرنے کے بعد زندہ ہوئے۔ بڑے بڑے بلند پایہ شاعروں کا بھی یہ حال ہوا۔ مرزا غالب کو دیکھئے۔ اُن کے ہمعصروں کی بے التفاتیوں پر نظر ڈالئے۔ اور پھر اُن کی موت کے بعد اُن کے بالغ نظر پرستاروں کی عبادت آمیز عقیدت مندیوں کا مشاہدہ کیجئے۔ تو آپ پر یہ مثال روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔ خود حضرت اقبال اسی مسئلہ کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد چشم بر خود بست و چشم ما کشاد
رخت باز از نیستی بیروں کشید چوں گل از خاکِ مزارِ خود دمید

میرا موضوع اقبال کی شاعری ہے۔ میں اس موضوع کے تین پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا:۔

(۱) اقبال کا پیغام اور اس کی نوعیت۔

(۲) اقبال کا کلام یا فن شاعری۔

(۳) اقبال کی شاعری کی حیثیت اور اس کا اثر

اقبال کے پیغام کے متعلق میں کسی قدر اختصار سے کام لوں گا۔

حضرت اقبال کا پیغام کیا ہے؟ اُن کے خیالات واحساسات کی نوعیت کیا ہے؟ اُن کے دل ودماغ کے خلوتکدہ دنیا میں کون سے اسرار مضمر ہیں۔ جن کے اظہار کے لئے وہ بےتاب ہیں۔ وہ کونسی آگ ہے۔ جو شرر افشاں آہوں شعلہ ریز فریادوں اور برق پاش نالوں کے باوجود ابھی تک اُن کے سینے میں فروزاں ہے۔ وہ بےنوا زیاں، وہ نغمہ سرائیاں کیا ہیں۔ جن سے وہ خود تڑپتے اور دوسروں کو تڑپانا چاہتے ہیں؟

یہ پیغام، راز حیات ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا راز، جسے انہوں نے برسوں کی دلسوزیوں، جگر کاویوں، اشک ریزیوں کے بعد سمجھا۔ اور اب وہ دوسروں کو سمجھانے کے لئے بیتاب ہیں۔ لیکن جہان میں ایک بھی محرم راز نہیں ملتا۔ جس کے سامنے وہ اس حقیقت کا اظہار کرسکیں۔ وہ اپنی اس بےچارگی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:-

تابِ گفتار اگر ہست شناسائے نیست ‏ ‏ ‏ وائے آں بندہ کہ درسینہ او رازے ہست

واقعی کس قدر بےبسی کا عالم ہے! ؎

سخن تازہ زدم کس بہ سخن وانرسید ‏ ‏ ‏ جلوہ خوں گشت و نگاہے بہ تماشا نرسید

ایک اور جگہ اسی خیال کو ظاہر کیا ہے ؎

تو مرا ذوق بیاں دادی و گفتی کہ بگوے ‏ ‏ ‏ ہست درسینہ من آنچہ بکس نتواں گفت

خدا نے شاعر کو ذوق بیان تو عطا کر دیا لیکن اس کے رموز واسرار کو سننے والا مفقود ہے۔ اور اگر کوئی جرأت کرے۔ تو کیونکر، یہ رموز و اسرار تو شعلوں کا حکم رکھتے ہیں۔ سوائے اہل دل کے کون ان کا متحمل ہوسکتا ہے ؎

رمز عشق تو بہ ارباب ہوس نتواں گفت ‏ ‏ ‏ سخن از تاب و تب شعلہ بہ خس نتواں گفت

حضرت اقبال شاعر فردا ہیں۔ وہ ان خاکیان افسردہ خاطر سے الگ تھلگ ایک نیا جہان بناتے ہیں جس کا آدم اول وہ خود ہی ہیں۔ اور جہاں کوئی دوسرا اُن کا ہمراز ودمساز نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

دریں مےخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر ‏ ‏ ‏ کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

انھوں نے کائنات کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اسرار ہستی کو سمجھنے سے پہلے تجسس حقیقت کی مختلف منازل طے کر چکے ہیں۔ اول اول جب اُن کی آنکھ کھلتی ہے۔ تو اُن کی نظر ہندوستان کی تنگ وطنی فضا پر پڑتی ہے۔ وہ وطن کے شیدائی کی حیثیت سے ہندوستان کے گیت گاتے ہیں۔ کوہ ہمالہ کو وطن کا نگہبان سمجھتے ہوئے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں۔ ابنائے وطن کی پست حالت پر نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ اور انہیں بیدار کرنے اور اُن کی خوابیدہ روح جگانے کے لئے دردبھری فریادکرتے ہیں۔ "نیا شوالہ" "قومی گیت" اور "تصویر درد" اسی عہد کی واردات ہیں۔

لیکن جستجوئے حق کی یہ پہلی منزل ہے۔ جب اُن کی نظر ملک ہندوستان کے تنگ دائرہ سے نکل کر وسیع فضائے عالم پر پڑتی ہے۔ تو وہ وطن جو کچھ عرصہ پہلے اُن کا نصب العین تھا۔ اپنی ہستی اس وسیع کائنات میں کھو دیتا ہے۔ جہاں انسان کی حیثیت، ہندوستانی، ایرانی، تورانی، افریقی نہیں۔ بلکہ اس معمورۂ عالم کی کثیر التعداد آبادی میں ایک ادنیٰ فرد کی سی رہ جاتی ہے۔ وطنیت عالمگیر اخوت میں بدل جاتی ہے۔ لیکن اُن کی تجسس کوش نظریں یہاں آکر بھی نہیں رکتیں۔ وہ معمورۂ عالم کو کائنات کا ایک جزو خیال کرتے ہیں۔ جہاں انسانی ہستی ایک ذرہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ حقیقتِ کائنات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ حیات انسانی کے راز کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ علوم فلسفہ سے استمداد کرتے ہیں۔ اور علم و دانش سے اس عقدے کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں پتہ چلتا ہے کہ موجودہ تہذیب و تمدن کی خرد فروزیاں اس حقیقت کو منکشف نہیں کرسکتیں۔ لکھتے ہیں:۔

قدح خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا　　ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر ندارد

دانایانِ فرنگ کائنات کو دیکھتے ہیں۔ فطرت کے گوناگوں مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ قدرت کی زبردست طاقتوں سے مفید کام بھی لیتے ہیں۔ لیکن اس کی نیرنگیوں کی حقیقت کو سمجھنا اُن کے فہم سے بالا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک قلب تپاں، ایک چشم بینا۔ ایک خلیلی روح۔ ایک کلیمی نظر کی ضرورت ہے۔ کیا خوب کہا ہے:۔

از کلیمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ　　جگر بحر شگافید و بہ سینا نرسید

بحر پیمائی کے لئے تو آبدوز جہاز کام دے سکتے ہیں۔ لیکن تجلی حق کے مشاہدہ کے لئے کلیم اللہ کی آنکھ درکار ہے۔

انسانی عقل اشیا کی سطح تک رہتی ہے۔ باطن کی خبر لانے کے لئے روحانی بیداری ضروری ہے ؎

دل بیدار ندادند بہ دانائے فرنگ — ایں قدر ہست کہ چشم نگرانے دارد

علم و دانش کی یہ افسردہ روحانیت۔ یہ ٹھوس مادیت۔ حقیقت کائنات کے انکشاف کا جہاں تک تعلق ہے محض سطحیت کا حکم رکھتی ہے۔ ہمارا شاعر اپنے منازل جستجو کو روحانی بیداریوں کے سہارے طے کرتا ہے۔ یہ راستہ اگرچہ بہت دور و دراز ہے۔ لیکن عاشق صادق کے لئے عرصۂ یک گام سے بڑھ کے نہیں۔ اور اگر یہ شرح صدر، یہ روحانی کشف، یہ نور عشق حاصل ہو جائے۔ تو دونوں جہان پر حاوی ہو جانا آسان ہے۔ یہ آسمان، یہ ستارے، یہ کہکشاں، یہ مہر و ماہ، واضح ہو کر نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ جبریل تو درکنار عرش الٰہی تک رسائی ہو سکتی ہے۔ ہمارا شاعر کہتا ہے ؎

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

حضرت اقبال نے انسانی دلوں کی تڑپ، سوز و گداز جستجو و تلاش حق، اور پھر وادیٔ عشق کے تمام منازل کا صحیح نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان میں یہ تڑپ فطری ہے۔ انسان اگرچہ خاک کا پتلا ہے لیکن اس کی روح اپنے مرکز کی طرف کھنچی چلی جاتی ہے۔ یہ چیز ہے۔ جو اسے جستجو پر مجبور کرتی ہے۔ یہ چیز ہے۔ جو اسے بیتاب رکھتی ہے۔ استفہامی رنگ میں فرماتے ہیں ؎

دروں سینۂ ما سوز آرزو ز کجاست — سبو ز ماست و لے بادہ در سبو ز کجاست
گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ما کف خاکیم — بذرہ ذرۂ ما درد جستجو ز کجاست
نگاہ ما بگریبان کہکشاں افتد — جنون ما ز کجا شور ہاے و ہو ز کجاست

وہ خود اسی سوز میں جلتے ہیں۔ یہی شراب عشق انہیں مسرور رکھتی ہے۔ اور یہی جستجو انہیں سرگرم عمل۔ وہ اسی نظر سے کائنات کے ہر ذرّے کو دیکھتے ہیں۔ اور اسی بصیرت افروز روحانی بیداری سے دونوں جہان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جب یہ کیفیت طاری نہ ہو۔ تو یہ آنکھیں ایک پرِکاہ کے پڑ جانے سے بند ہو جاتی ہیں لیکن اسی روحانی بصیرت سے دونوں جہان کے جلوے نظروں میں سما جاتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

می شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے
وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

پھر دوسروں کو بھی اسی شاہراہِ حق پر گامزن ہونے کی تلقین فرماتے ہیں۔ اور امید دلاتے ہیں کہ جستجو کبھی خالی نہیں جاتی ؎

در طلب کوش و مدہ دامنِ امید ز دست دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

وہ اپنی اس وسیع مشربی اور کشادہ دلی، سوزِ قلب اور جوشِ حرارت کے باوجود بیگانہ وار [illegible] اس تڑپ، اس سوز، اسی روحانی بیداری کے متمنی ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں [illegible] وہ جستجوئے حقیقت کا خاتمہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ وہ اس نصب العین کے حصول کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے نزدیک یہی باطنی ہنگامہ آرائی، یہی کشمکش "حیات" ہے۔ وہ نہ صرف خود زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ بلکہ اپنی گرم نوائیوں سے دوسروں کو بھی بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے بھی اسی بارگاہِ ایزدی سے التجا کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ یہ کام نہایت دشوار ہے۔ مُردہ قوم میں روحِ حیات پھونکنے کے لئے دمِ عیسیٰ، عزم راسخ، بلند ہمتی اور استقلال کی ضرورت ہے۔ دیکھئے فرماتے ہیں ؎

یارب درونِ سینۂ دل باخبر بدہ در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ
ایں بندہ را کہ با نفسِ دیگراں نزیست یک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ
سیلم، مرا بجوئے تنک مایہ مپیچ جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ

شاہین من بصید پلنگاں گذاشتی / ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ
رفتم کہ طائران حرم را کنم شکار / تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ
خاکم بنور نغمۂ داؤد بر فروز / ہر ذرّۂ مرا پر و بال شرر بدہ

حضرت اقبال اپنی دُور رس نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کہ مغربی تہذیب جو آج نوع انسان کے دل و دماغ پر مسلّط ہو رہی ہے۔ دنیا کے لئے مفید نہیں۔ وہ روحانیت کو افسردہ کرتی ہے۔ وہ مادیت کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کا انحصار محض علم و دانش پر ہے۔ دانایان فرنگ کی آنکھیں روشن ہیں لیکن دل بجھے ہوئے ہیں اور روحیں سو رہی ہیں۔ اُن کے قلب سوزِ دل سے عاری ہیں۔ وہ دور حاضرہ کے علوم و فنون کی ترقی میں روحانیت کے زوال کو دیکھتے ہیں۔ یہ ترقی نہیں تباہی ہے۔ یورپ کی آزادی کی بلند آہنگیاں حقیقت میں غلامی کی زنجیروں کی جھنکاریں ہیں۔ سائنس کی روز افزوں ترقی نسل انسانی کی فلاح و بہبود کیلئے نہیں۔ بلکہ تباہ کار آلات حرب کی ساخت کے لئے ہیں۔ نئی تہذیب کی یہ خوش منظر عظیم الشان عمارت نہایت سست بنیاد ہے۔ اس کی تعمیر ہی میں بربادی مضمر ہے۔ حضرت اقبال ان تمام غیر محسوس اثرات کو دیکھتے ہیں۔ اور ایشیا والوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اس سے بچنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ کون ہے۔ جس نے علامہ موصوف کی وہ نظم و الہامی نغمہ نہیں سُنا۔ جس میں انہوں نے جنگ عظیم سے برسوں پہلے "آئینہ امروز" میں "واقعات فردا" کو منعکس کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں :-

دیار مغرب کے رہنے والو۔ خدا کی بستی دکاں نہیں ہے / کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ ہی زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی / جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

"شمع و شاعر" میں لکھتے ہیں ؎

دیکھ لوگے سطوتِ رفتار دریا کا مآل / موج مضطر ہی اُسے زنجیر پا ہو جائے گی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائیگی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

یہ اشعار انقلابات زمانہ کی کیسی شوخ تصویریں ہیں۔ اُردو زبان اور اس کے کم ظرف الفاظ اس سے زیادہ معانی کے کہاں متحمل ہو سکتے ہیں!

لیکن یہ تصویریں خاموش تصویریں ہیں۔ میں آپ کو زندہ دکھاتا ہوں۔ جہاں الفاظ و معانی سرگوشیاں کرتے ہوئے اتراتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ جہاں شاعر کے الہامی فقرات دلوں میں خود بخود اُترتے چلے جاتے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر آنکھیں بینائی حاصل کرتی ہیں اور روح عبرت۔

یہ بھی مغرب کی تہذیب اور اس کی فریب کاریوں کا نقشہ ہے ؎

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

وہ "پیام مشرق" میں "نقش فرنگ" کے عنوان کے تحت میں تہذیب مغرب پر اپنے خیالات کا اظہار اور بھی زیادہ مؤثر، زیادہ بلیغ اور زیادہ فصیح انداز میں کرتے ہیں ؎

از من اے بادِ صبا گوے بدانائے فرنگ عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بجگر می زند آں رام کند عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است

تیر گر از دل ارباب نہ بیند ورنہ　　　آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

خیر از آن جست کہ اعجاز مسیحا داری　　　عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است

دانش اندوختہ دل ز کف انداختہ‌ام

آہ ازاں نقد گرانمایہ کہ در باختہ‌ام

علم و عشق کا کتنا خوبصورت مقابلہ کیا ہے۔ کس بلیغ پیرائے میں دونوں کے کارنامے نمایاں دکھائے ہیں۔ علم دوسرے صاحب علم و دانش کی محبوبہ ہے۔ جسے ہر تشنہ کام علم و تحقیق چشمۂ فیض جانتا ہے۔ مسیحائی تو کرتی ہے لیکن اس کی مسیحائی مردوں کو زندہ نہیں کرتی۔ افسردہ طبائع کو بیدار نہیں کرتی۔ سوئی ہوئی روحیں نہیں جگاتی۔ بلکہ انہیں اور بھی افسردہ کر دیتی ہے۔ وہ بیماروں کو بیمار تر کر دیتی ہے۔

کیسا دلکش انداز بیان ہے۔ کیا مؤثر پیرایہ ہے۔ کیا کوئی شخص عقل کی افسردہ کار فسوں گری، نامسیحائی اس طرح بیان کر سکتا۔ یقیناً یہی چند اشعار شاعر کی شہرت دوام کے لئے کافی ہیں۔

کائنات کے ذرے ذرے کی شناخت اور واقعات عالم کی حقیقت کو جب سمجھتے اور جس طرح سمجھے ہیں اس پر وہ بجا طور پر فخر خیال کرتے ہیں۔ وہ اس پر نازاں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

من درین خاک کہن گوہر جان مے بینم　　　چشم ہر ذرہ چو انجم نگران مے بینم

دانہ را کہ بآغوش زمین است ہنوز　　　شاخ در شاخ و برومند و جوان مے بینم

کوہ را مثل پر کاہ سبک مے یابم　　　پر کاہ صفت کوہ گران مے بینم

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیر افلاک　　　بینم و ہیچ ندانم کہ چسان مے بینم

خرم آنکس کہ درین گرد سوارے بیند

جوہر نغمہ ز لرزیدن تارے بیند

دیکھئے وہ اپنی حقیقت شناس نظروں سے ہر ذرہ کے دل کو بیدار پاتے ہیں۔ وہ اس شباب کو جو عام درخت کے نام سے مشہور ہے۔ دانہ کی صورت میں دیکھ کر ہی اندازہ کر لیتے ہیں۔ کہ اس میں کتنی ...

کی نابہ گری کی حد کیا ہے۔ اس کے ایک ایک پتے کو گنتے اور ہر پھول کو سونگھتے، اور ہر پھل سے سیر کام ہوتے ہیں۔ آئندہ واقعات کے رونما ہونے اور مختلف ارتقائی منازل طے کرنے کو کیسی نادر تشبیہوں اور کنایوں میں بیان کیا ہے۔

دنیا میں ایک طرف عظیم الشان حکومت ہے۔ اور اس کی باجبروت فوجیں، دوسری طرف محکوم قوم کی حکومت ہے۔ اور اس کی بے چارگی اور مظلومیت، لیکن حضرت اقبال نظیری کے اس نکتہ راز سے واقف ہیں ؎

گلہ ز تنگی منزل قصد ضعیفاں کن کہ در ریگ قافلہ گاہ ہے قدر اندازے ہست

وہ جانتے ہیں کہ انقلاب زمانہ گردش روزگار کے بارہا ایسے کرشمے دکھاتے ہیں۔ کہ ایک بے دست و پا محکوم مظلوم قوم نے اٹھ کر جابر سلطنتوں کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔ وہ زیردستوں کی اس طاقت غیبی اور زبردستوں کی اس بے اساس سطوت کی حقیقت کو جانتے ہیں۔ جبھی تو فرماتے ہیں ؎

کوہ را مثل پرِ کاہے سبک می یابیم بپرِ کاہ صفت کوہ گراں می بینیم

وہ اس چیز سے بھی بے خبر نہیں۔ کہ دنیا ایسے انقلابات کو ہمیشہ استعجاب سے دیکھتی ہے۔ آسمان حیرت سے تکتا ہے۔ خود کارکنانِ قضا و قدر کو تعجب ہوتا ہے ؎

انقلابے کہ نہ گنجد بضمیر افلاک بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

جاوید نامہ میں جو ان کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ جاوید سے خطاب کرتے ہیں۔ اور اسے مغربی تہذیب کے [illegible] آئندہ رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ دنیا محض عقل و دانش کی اسیر ہو کر رہ جائے گی۔ دلوں میں سوز و گداز نہ ہوگا۔ آنکھیں مجاز پرست ہو جائیں گی۔ دنیا کے لوگ اصنامِ آب و گل کے پرستار ہو جائیں گے ؎

گر خدا سازد ترا صاحب نظر روزگارے را کہ می آید نگر

عقلہا بے باک و دلہا بے گداز چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز

علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل	زوج زوج اندر طواف آب و گل

اس اثر سے ایشیا بھی نہ بچ سکے گا ؎

آسیا آں مرز و بوم آفتاب	غیر بیں از خویشتن اندر حجاب
قلب او بے وارداتِ نو بنو	حاصلش را کس نگیرد با دو جو
روزگارش اندریں ویرینہ دیر	ساکن و یخ بستہ و بے ذوقِ سیر
صید ملاّیان و نخچیرِ ملوک	آہوئے اندیشۂ او لنگ و لوک

ان حقائق و معارف میں اقبال کا فلسفۂ خودی بھی شامل ہے۔ جس پر اس کی رائے میں ہر شے کی زندگی کا انحصار ہے۔ خودی سے کائنات کے ہر ذرّے کا وجود ہے۔ خودی سے انسان کی ہستی قائم ہے۔ ہاں تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ خودی کیا ہے؟ اور اس کے لوازمات کیا ہیں؟

وہ فرماتے ہیں۔ کہ انسان کے لئے اپنی ہستی کا احساس ہی خودی ہے۔ اس کے اپنے اندر کمالات کے تمام اسرار پوشیدہ ہیں۔ جس قدر یہ احساس زیادہ تیز اور استوار ہوگا۔ اسی قدر زندگی زیادہ استوار ہوگی۔

اس حیات خودی کو قائم رکھنے کے لئے آرزوئے مسلسل کی حاجت ہے۔ جس انسان کے دل میں کسی مدعا کے حصول کے لئے آرزوئیں۔ تمنائیں بے تاب نہ ہوں۔ اس کا وجود مشت خاک سے زیادہ نہیں۔ اس کا جسم ایک مزار ہے۔ انسانی قلب میں آرزوؤں کی یہی تڑپ اُسے سرگرم عمل رکھتی ہے۔ وہ محو جستجو رہتا ہے۔ یہ جستجو ہی اس کی روح رواں ہے۔ جسم اسی سے زندہ ہے۔ دل اسی سے ہنگامہ آرا ہے۔ روح اسی سے بیتاب و بیدار رہتی ہے۔

دیکھئے ان سب کی شرح "اسرار خودی" میں اس طرح سے کی ہے ؎

زندگانی را بقا از مدعا است	کاروانش را درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است	اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دل خود زنده دار — تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

اور پھر کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں ؎

از تمنا رقصِ دل در سینه ها — سینه ها از تابِ اُو آئینه ها
طاقتِ پرواز بخشد خاک را — خضر باشد موسیٰ ادراک را

*

آرزو هنگامه آرائے خودی — موجِ بیتابے ز دریائے خودی

یہ خودی اُسی سوزِ عشق سے جس کو ہم پہلے بیان کر آئے۔ نور حاصل کرتی ہے۔ وہ خود نور ہے۔ زندگی کا سوز و ساز ہے۔ محبت اس نور کو زیادہ روشن کرتی۔ اس آگ کو اور بھی بھڑکاتی ہے۔ دل اس سے توانا ہوتے ہیں۔ بیباک ہوتے ہیں۔ اور روحانی ارتقا کو حاصل کرتے ہیں ؎

نقطۂ نورے کہ نامِ اُو خودی است — زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پاینده تر — زنده تر، سوزنده تر، تابنده تر
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست — اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست
دل ز عشقِ اُو توانا می شود — خاک همدوشِ ثریا می شود

یہ عشق، عشقِ حق ہے۔ اس کے لئے کسی خارجی معشوق و محبوب کی ضرورت نہیں۔ وہ محبوب انسان ہی کے دل میں نہاں ہے۔ ہاں اُسے دیکھنے کے لئے چشمِ بینا درکار ہے۔

فرماتے ہیں ؎

عاشقی آموز و محبوبے طلب — چشمِ نوحے قلبِ ایوبے طلب
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے — بوسه زن بر آستانِ کاملے
شمعِ خود را همچو رومی بر فروز — روم را در آتشِ تبریز سوز

ہست معشوقے نہاں اندر دلت چشم اگر داری بیا بنمایمت

ایک عارف کی حقیقت شناس نظر اور قلب تپاں دونوں مل کر اس شاہد حقیقی کے جلوے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

بے خودی کیا ہے؟ خودی جب تک انفرادی زندگی میں ہے۔ خودی ہے۔ لیکن جب ایک فرد جماعت میں شامل ہوجاتا ہے۔ تو اس کی حیثیت کچھ اور ہوجاتی ہے۔ وہ پہلے ناز ہوتا ہے۔ پھر نیاز۔ وہ پہلے اگر قطرہ ہوتا ہے تو پھر سمندر بن جاتا ہے۔ وہ اگر خودی کی حالت میں محض ایک برگ گل تھا۔ تو اب وہ ایک چمن زار ہے۔ دیکھئے کس دلکش پیرایہ میں کہتے ہیں:

فرد را ربط جماعت رحمت است جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش رونقِ ہنگامۂ احرار باش
فرد می گیرد ز ملت احترام ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
در جماعت خود شکن گردد خودی تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

ان اشعار میں شاعر نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے فرق کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ فرد کی زندگی بغیر جماعت کس قدر محدود ہے۔ اس انسان کو جو ان حدود سے گذرنے کے لئے بیتاب ہو "قطرۂ وسعت طلب" کہنا کیسا پیارا انداز بیان ہے۔ بظاہر قطرے کا وسعت حاصل کرنا کتنا ناممکن ہے۔ لیکن قلزم بننا بھی کس قدر نمایاں ہے۔

کون اس حقیقت سے انکار کرسکتا ہے۔ پریشان افراد بکھری ہوئی پھولوں کی پتیاں ہیں۔ لیکن ایک جماعت میں شریک ہوکر وہی چمن بن جاتی ہیں۔

حضرت اقبال کا مخاطب کون ہے۔ اُن کا مخاطب دنیا کا ہر فرد بشر ہے۔ ہر وہ شخص جو سینے میں ایک مضطرب دل، ایک بے قرار روح رکھتا ہو جو جستجوئے حقیقت میں سرگرم رہ کر بنی نوع انسان کو حیات تازہ بخشنے کا متمنی ہو۔ اُن کی مخاطب ہر وہ قوم ہے۔ جو دنیا میں اپنے وجود کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ جو صحیح شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونے کی خواہشمند ہے لیکن وہ مسلمان ہیں۔ ایشیائی سوز و گداز اُن کے رگ و پے میں ہے۔ وہ عالمگیر اخوت کے جس کا دوسرا نام اسلام ہے علمبردار ہیں۔ وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ دنیا اور بالخصوص مسلمان اگر پھر ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ تو اُن کے لئے اسلاف کا ہی طرزِ عمل مفید ہے ؎

"خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اس اعتبار سے کہ اخوتِ اسلامیہ کی بحث نامکمل رہ جائے گی میں مثنوی اسرار سے چند اشعار اور رموز سے ایک حکایت نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہوں جس سے آپ کو حضرت شاعر کے صحیح تصورِ اخوت کا پتہ چلے گا۔ بلکہ اُس کے زورِ کلام اور اندازِ بیان کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔ اس خیال کو کہ مسلمان ایک ہیں۔ اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم
چون نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنمِ یک صبحِ خندانیم ما
مستِ چشمِ ساقیِ بطحاستیم
در جہان مثلِ مے و میناستیم
امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او این خس و خاشاک سوخت

رموز میں عربوں کے ایران پر حملہ آور ہونے کے وقت کا ایک واقعہ درج ہے۔ یزدجرد کے ایک سپہ سالار کو لڑائی میں ایک مسلمان اسیر کر لیتا ہے۔ وہ مکار سپہ سالار اپنی بلند شخصیت کو چھپاتا ہے۔ اور معمولی سپاہی کی حیثیت میں اس سے "جاں بخشی" کرا لیتا ہے۔ جب جنگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور ایران کی سلطنت تباہ

ہو جاتی ہے۔ تو پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ جاپانی ہے۔ اس اسیر کو حجازی افواج کے سپہ سالار ابو عبیدہ کے حضور میں لاتے ہیں۔ اور اس جھوٹ کے لئے قتل کی سزا دلانا چاہتے ہیں۔ لیکن ابو عبیدہ جواب دیتے ہیں:۔

گفت اے یاراں مسلمانیم ما ۔۔۔ تار چنگیم و یک آہنگیم ما
نعرۂ حیدر نوائے بوذر است ۔۔۔ گرچہ از حلق بلال و قنبر است
ہر یکے از ما امینِ ملت است ۔۔۔ صلح و کینش صلح و کیں ملت است
ملت ار گردد اساس جانِ فرد ۔۔۔ عہد ملت می شود پیمانِ فرد
گرچہ جاپاں دشمنِ ما بودہ است ۔۔۔ مسلمے او را اماں بخشودہ است

خونِ او اے معشر خیر الانام
بر دم تیغ مسلماناں حرام

یعنی فرد کا فیصلہ ملت کا فیصلہ ہے۔ اگر ایک مسلمان کسی کی جاں بخشی کی حامی بھرتا ہے۔ تو قوم پر اس کا خون حرام ہو جاتا ہے۔

اقبال کا فنِ شاعری۔ میں نے حضرت اقبال کے پیام یا اُن کے خیالات و احساسات پر بہت کچھ کہا ہے۔ اب یہ دکھانا مقصود ہے۔ کہ بحیثیت فن شاعری کے اُن کے کمالات کیا ہیں؟ جہاں تک زبان کا تعلق ہے۔ انہوں نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ اُردو کلام کا مجموعہ بانگ درا اور فارسی کی متعدد تصانیف اس امر کی کافی شہادتیں ہیں۔ اُن کی شاعری کا آغاز اُردو زبان سے ہوتا ہے۔ اور اس میں دوسرے شاعروں کی طرح غزل سے ابتدا کرتے ہیں۔ اُردو کے مشہور غزل گو شاعر حضرت داغ کے تلمیذ بنتے ہیں۔ اور اس سے اصلاحیں لیتے ہیں۔ مختلف بحروں میں طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ قافیوں اور ردیفوں کو چمکایا جاتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر قائم نہیں رہتا۔ شاعر کی وسعت تخیل "تنگنائے غزل" میں نہیں سما سکتی۔ وہ دوسری اصناف شاعری سے کام لیتا ہے۔ لیکن علوے تخیل ان سے بھی اُبھر اُبھر کر نکلتا

ہے ۔ اُردو زبان کی کم مائگی جواب دے جاتی ہے ۔ وہ فارسی میں شعر کہنے لگتے ہیں ۔ جو اُن کے لئے بے حد موزوں ہے ۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است | طرز گفتار دری شیریں تر است
فکر من از جلوہ اش مسحور گشت | خامۂ من شاخ نخل طور گشت
پارسی از رفعت اندیشہ ام | در خورد با فطرت اندیشہ ام
خردہ بر مینا مگیر اے ہوشمند | دل بذوق خردۂ مینا بہ بند

کہتے ہیں کہ زبان پر جو بمنزلہ مینا ہے ۔ اعتراض نہ کر کہ اُردو کیوں نہیں ۔ فارسی کیوں ہے ۔ بلکہ تو اس مینا کی شراب کے ذوق سے سیراب ہو ۔

انہوں نے جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں ۔ تقریباً تمام مشہور اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے ۔ غزل رباعی، قطعہ، مثنوی، مسدس سبھی لکھے ہیں ۔ وہ ہر ایک میں کامیاب ہوئے ہیں ۔ لیکن اُن کا کمال فن شاعری کی ان ظاہری رسوم و قیود سے بالاتر ہے ۔ اُن کے کمال کا انحصار علو تخیل پر ہے ۔ شوخی بیان اور زور کلام پر ہے ۔ الفاظ و تراکیب کی رنگینی اور چستی پر ہے ۔

اُن کا انداز بیان فلسفیانہ ہے ۔ وہ ہر شے کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں ۔ طلوع صبح کا ذکر ہو یا شفق شام کا، کوہسار کا منظر ہو یا سبزہ زار کا موسم بہار کا تذکرہ ہو یا خزاں کا کشمکش زیست کا سوال ہو ۔ یا فسردگی مرگ کا وہ انہیں دیکھتے ہیں ۔ اور اُن میں یکسر محو ہو کر حقیقت کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں ۔ اشیا یا واقعات کی سطح تک رہنا اُن کے لئے ناممکن ہے ۔ یہی باعث ہے کہ منظر کشی میں زیادہ کوشاں نہیں ہوتے ۔ اُردو اور فارسی کی متعدد نظمیں اس قول کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں ۔ بانگ درا میں موج دریا، ستارہ، بچہ اور شمع اور خود اُن کی والدہ کا مرثیہ جس میں سوز و الم کے مقابلے میں فلسفۂ غم زیادہ ہے ۔ ایسی ہی مثالیں ہیں لیکن اس فلسفیانہ انداز بیان سے اُن کے جوش بیان میں فرق نہیں پڑتا ۔ الفاظ کی سادگی اور عبارت کی سلاست میں فرق نہیں پڑتا ۔ بلکہ کلام کی شوکت اور اس کی دلآویزی اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ فلسفہ کا خشک موضوع رنگینی اختیار کر لیتا ہے ۔ یہی شاعر

کا کمال فن ہے۔ دیکھئے ایک نظم کا عنوان ہے۔

"پھول کا تحفہ عطا ہونے پر"

فرماتے ہیں ؎

وہ مست ناز جو گلشن میں آ نکلتی ہے — کلی کلی کی زبان سے دعا نکلتی ہے
الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھکو کرے — کلی سے رشک گل آفتاب مجھکو کرے
تجھے وہ شاخ سے توڑیں زہے نصیب ترے — تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے
اٹھا کے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا — تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا

مرا کنول کہ تصدق ہیں جس پہ اہل نظر — مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر
کبھی یہ پھول ہم آغوش مدعا نہ ہوا — کسی کے دامن رنگیں سے آشنا نہ ہوا
شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے

یہ اردو کلام کی مثال تھی۔ فارسی میں جہاں شاعر کا جلوۂ تخیل کام کرتا ہے۔ وہاں اشعار تیر و نشتر بن جاتے ہیں میں یہاں چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

محفل انس میں جہاں عاشق و معشوق باہم راز و نیاز میں مصروف ہوں۔ عاشق کے لبریز شوق الفاظ کس قدر فصیح و بلیغ ہوتے ہیں۔ وہ ایک حرف میں ہزار داستانیں بیان کر سکتا ہے۔ بلکہ اس کا ایک آنسو ایک آہ لاکھوں الفاظ کی لفظی صورتوں سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے لیکن عاشق اپنی داستان کو مختصر نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اس وصل کی لذت کا جس میں دنیا بھر کے سرور پنہاں ہیں۔ لاکھوں جنتیں جلوہ فرما ہیں۔ خاتمہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس ذوق حضوری کے لئے داستان کو طویل کئے جاتا ہے۔ اس مضمون کو شاعر نے کس بلیغ انداز میں بیان کیا ہے ؎

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را   من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

انسانی ہستی کا یہیں خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ یہ موت محض عارضی انقطاع ہے۔ اس کے بعد انسان کو ابدی زندگی عطا ہونے والی ہے۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے۔ کہ اس موت کے بعد ہمیں ہمیشہ کے لئے سو جانا ہے۔ اور یہ مرگ، مرگ دوام ہے۔ تو بھی انسان کو اس فانی دنیا میں اپنی زندگی اس خوش اسلوبی سے گذارنی چاہئے۔ کہ خدا بھی اس بات پر پشیمان ہو کہ میں نے انسان کو جو اپنی ذاتی مساعی سے اس قدر ارتقا حاصل کر سکتا ہے کیوں نہ موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا اہتمام کیا۔ ایسی عظیم الشان ہستی کو اتنی ترقیوں کے بعد یک لخت ہمیشہ کے لئے تباہ کر دینا ناانصافی ہے۔ اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگ دوام   خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

دیکھئے کتنا بڑا مضمون ہے۔ اور کس سادگی سے ادا کیا ہے۔ انسان کو سعی عمل اور اکتساب کمال کے لئے اس سے بڑھ کے اور کون سا درس ہو سکتا ہے

علم و دانش انسانی ہستی کے ارتقا کے لئے ضروری ہے۔ لیکن وہ علم و دانش جس کے حصول سے انسانی قوتیں باطل ہو کر رہ جائیں بے سود ہے۔ جو علوم ایک جری سپاہی کو بزدلانہ تعطل کی طرف لے جائیں۔ وہ کس قدر خطرناک ہیں، کس قدر مہلک ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے ؎

من آں علم و فراست با پر کاہے نمی گیرم   کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

دیکھئے مرد غازی کے سپاہیانہ جذبے کو جو سرتا سر عمل ہوتا ہے۔ زندہ رکھنے کے لئے وہ کس قدر بیتاب ہیں۔ تلقین عمل اُن کا خاص شیوہ ہے۔ وہ لوگ جو دنیا میں حسن اسلوبی کے متلاشی ہیں۔ اپنی ذاتی سعی

کوشش سے کچھ حاصل نہیں کرنا چاہتے۔ سرگرمیٔ عمل کی لذت سے بے نصیب ہیں۔ جن کو ورثے میں سب کچھ مل جائے۔ انہیں جدوجہد کے عیشِ پنہاں کی کیا خبر۔

کہتے ہیں ؎

پشیماں شو اگر لعلے ز میراث پدر خواہی کجا عیش بروں آوردن لعلے کہ در سنگ است

پتھر سے خود لعل نکال لانے میں جو مسرت انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ لعل کے ورثتہً لینے میں نہیں۔ عالی حوصلہ وہ انسان ہے۔ جو ایسی دولت کے حصول پر خوش نہ ہو بلکہ پشیمان ہو۔

انسان کو چاہیئے۔ کہ وہ ہر لحظہ کائنات کے اسرار و حقائق پر غور کرے۔ اس کی ہر نگاہ فطرت کی گہرائیوں تک پہنچنی چاہیئے۔ ورنہ یونہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے کیا فائدہ۔

دیکھئے اس مضمون کو کیسے ادا کیا ہے ؎

اگر بہ سینۂ ایں کائنات در نروی نگاہ را بہ تماشا گذاشتن ستم است

فرماتے ہیں۔ کہ جو نگاہ کائنات کے سینے کو شگاف نہ کرے۔ اس کا آنکھوں سے باہر آنا ہی بے کار ہے۔

جن لوگوں کی آنکھیں حقیقت کو دیکھنے کے لئے ترس رہی ہوں۔ جن کے دل حقائق کو سمجھنے کے لئے بیتاب ہوں۔ اُن کے احساسات کی کیا حالت ہوگی۔ جو شاعر ہمہ تن سوز و گداز ہو کر نغمہ آرائی کرتا ہے۔ وہ نظاہر "نے نواز" ہے۔ لیکن اس ترنم نَے کے لئے اسے معمولی سانس سے نہیں۔ بلکہ دم شمشیر سے کام لینا پڑتا ہے۔

فرماتے ہیں ؎

اگر ایں کار را کار نفس دانی چہ نادانی! دم شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را

شاعر کی نغمہ سازیاں آسان نہیں۔ یہ تلوار سے کھیلنا ہے۔ ایک شعر نغز کہنے کے لئے سیروں خون جگر پینا پڑتا ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

خشک سیروں تنِ شاعر سے لہو ہوتا ہے تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

ان چند اشعار سے آپ کو پتہ چل گیا ہوگا۔ کہ ہمارے شاعر کا تخیل شعری کس قدر بلند ہے۔ اُس کا انداز بیاں کس قدر پاکیزہ ہے۔ دقتِ مضامین کے باوجود سادگیٔ الفاظ کتنی حیرت انگیز ہے۔ زبان کیسی پیاری ہے۔ اس میں کتنی روانی، کتنا زور، کتنا اثر ہے۔ اسی کو معجز نگاری کہتے ہیں۔ اس کا نام نکتہ آفرینی اسی کا نام شاعری ہے۔ اسی اعجاز کاری نے گرامی مرحوم ایسے بلند پایہ شاعر کو بھی بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور کیا۔ کہ ؎

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

حضرت اقبال کی فلسفیانہ متانت میں کبھی کبھی شاعرانہ شوخی بھی آجاتی ہے۔ میں یہاں ایک غزل کے دو شعر پیش کرتا ہوں ؎

دگر ز سادہ دلی ہائے یار نتواں گفت نشستہ بر سر بالین من ز درماں گفت

معشوق کی سادگی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ اس سے زیادہ سادگی کیا ہوگی۔ کہ اپنے مریضِ عشق کے بالیں پہ بیٹھا علاج کی تدبیریں کر رہا ہے۔ اور یہ نہیں جانتا۔ کہ ان تمام دکھوں کا درماں تو وہ خود ہی ہے۔ ایسے سادہ لوح معشوق کی بے خبری کا رنج عاشق کو بیمار کر دے تو کر دے۔ ورنہ اس کے موجود ہوتے ہوئے دکھ درد کہاں۔

تمام شاعر، واعظ، مفتی، اور شیخ سے الجھتے رہے ہیں۔ حضرت اقبال کو بھی اُن سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ ان لوگوں کا ذاتی تقدس تو اس قابل نہیں ہوتا۔ کہ انہیں نجات دلا سکے۔ البتہ وہ رند مشرب لوگوں پر فتوے لگا کر سرمایۂ زہد و اتقا فراہم کر لیتے ہیں۔ اور یہی اُن کے سفرِ آخرت کے لئے زادِ راہ کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ کہ میں "کافر شیوہ" اس لئے ہو گیا ہوں۔ کہ شیخ شہر کو مجھے کافر کہہ کر مرد باخدا ہونے کا موقع مل سکے ؎

از آں پیشِ بتاں رقصیدم و زنار بر بستم کہ شیخ شہر مرد باخدا گردد ز تکفیرم

حضرت اقبال کی پختگی کلام۔ زور بیان۔ نادر تشبیہات و استعارات کو جو اُردو۔ فارسی شاعری کی روح رواں ہیں۔ دیکھنا ہو۔ تو اُن کی وہ نظمیں دیکھئے۔ جو اُنہوں نے ایرانی شعرا کی تازہ بحروں کے انداز میں لکھی ہیں۔ آپ کو پتہ چل جائیگا۔ کہ اُن کے قلم میں کتنا زور ہے۔

"کرمک شب تاب" نظم لکھتے ہیں۔—

یک ذرۂ بے مایہ متاع نفس اندوخت   شوق این قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت

پہنائے شب افروخت

وا ماندہ شعاعے کہ گرہ خورد و شرر شد   از سوز حیات است کہ کارش ہمہ زر شد

دارائے نظر شد

پروانۂ بیتابے کہ ہر سو تگ و پو کرد   بر شمع یتیماں سوخت کہ خود را ہمہ او کرد

ترک من و تو کرد

یا اختر کے ماہ مبینے بکمینے   نزدیک تر آمد بتماشائے زمینے

از چرخ برینے

یا ماہ تنک نور کہ یک جلوہ تمام است   ماہے کہ برو منت خورشید حرام است

آزاد مقام است

دیکھئے کیسی چبھتی ہوئی زندہ تشبیہیں ہیں۔ جگنو کو کہتے ہیں کہ ایک پروانہ ہے۔ جو شمع پر جل کر خود چھوٹی سی شمع بن گیا۔ اس عاشق کا یہ وصال معشوق سے اسقدر ہے کہ "من و تو" میں تمیز نہیں رہی۔

فصل بہار۔ سرود انجم۔ حُدی۔ قطرہ آب ایسے ہی شاہکار ہیں۔

بعض تنگ نظر کور ذوق لوگ اُن کی اُردو زبان پر معترض ہوتے ہیں۔ اُن کے مشکل الفاظ، جدید اور انوکھی تراکیب پر تنقید کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے۔ کہ اُردو زبان اُن کے وسعت تخیل کی کہاں متحمّل ہو سکتی ہے! وہ اگر نئے الفاظ وضع نہ کریں۔ اگر نئی تراکیب نہ تراشیں۔ تو زبان میں وسعت بیان کیسے پیدا ہو۔ کیا نیا پیرایۂ بیان اختیار کرنا فصاحت و بلاغت کے منافی ہے۔ کیا ان تمام جدت طرازیوں، و مشکل بیانیوں کے باوجود اُن کے کلام کو لوگ نہیں سمجھتے؟ اور اُن پر سر نہیں دھنتے کیا فارسی کے علاوہ اُن کی اکثر اُردو نظمیں مثلاً "نوید سنا" "شکوہ" "شمع و شاعر" "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" بچے بچے کی زبان پر جاری نہیں۔ کیا اُن کے تتبع میں ہندوستان کے اکثر نوجوان آغاز شاعری ہی میں اُن کا سا پیرایۂ بیان اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیا اُن کی تعلیمات کو ادبی اور سیاسی حلقوں میں بطور سند کے پیش نہیں کیا جاتا اگر ان سب کا جواب ہاں میں ہے۔ تو پھر کیا یہ اعتراضات بے معنی نہیں؟ اس وقت نوجوانوں کا ایک زبردست گروہ انہیں نہ صرف ہندوستان کا بلکہ ایشیا کا بہترین شاعر مانتا ہے۔ ایک شاعر کی خوش قسمتی اس سے بڑھ کے اور کیا ہوگی۔ کہ اُسے خلاف معمول اپنی زندگی ہی میں اپنے کلام کی شہرت و قبول کے دیکھنے کا موقع مل جائے۔ حضرت اقبال اپنی سحر نگاریوں کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اور آئندہ نسلیں اُن کے الہامی نغموں سے اقتباس سوز کرتی رہیں گی۔

مضمون بہت طویل ہو گیا لیکن ذوق ابھی تشنہ ہے۔ میں اس بحث کو "جاوید نامہ" کے اُن چند اشعار کا خلاصہ جو انہوں نے "خطاب بہ جاوید" کے اخیر میں قلمبند کئے ہیں۔ درج کئے بغیر ختم نہیں کرنا چاہتا۔ یہ اشعار مثنوی "رموز" کے "عرض حال" کے رقت انگیز انداز بیان کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ خطاب حقیقت میں محض جاوید سے نہیں۔ بلکہ ہر نوجوان سے ہے۔ جو زندگی کی شاہراہ میں گامزن ہونے والا ہے۔ اور جسے صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے۔

"دنیا اس وقت مادیت میں گرفتار ہے۔ دل سو رہے ہیں۔ اور روحیں خوابیدہ ہیں۔ مرد حق کا وجود عنقا ہے۔ لیکن تلاش اور ذوق طلب لابدی ہے۔ اگر ایسے مرد باخبر کی صحبت میسر نہ آئے۔ تو اسلاف سا سوز و گداز پیدا کرنا چاہیئے۔ تاکہ دل مضبوط اور ایمان قوی رہیں۔ جانیں بے تاب ہوں۔ اور روحیں

رقص کریں۔"

اگر نوجوان اس بیداری روح سے فیضیاب ہو جائیں۔ تو ہمارا شاعر اپنی کامیابی سے تسکین قلب حاصل کرے گا۔ اور اس کی روح مرنے کے بعد بھی انہیں دعائیں دے گی ؎

کلام اقبال کی ادبی خوبیاں

اقبال ایک فلسفی شاعر ہے۔ اُس کے فلسفہ نے مذہب اسلام اور اس کی مقدس روایات کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اس کے تخیل کی وادیاں سرزمین حجاز کے دریاؤں کی آبیاری کی شرمندۂ احسان ہیں۔ اس کے کلام کا اکثر اور بیشتر حصہ خالص اسلامی نقطۂ نگاہ کو پیش کرتا ہے۔ وہ ہر شے کو مذہب کی عینک سے دیکھتا ہے۔ اور اسی پابندی میں رُوح کی آزادی کے خواب دیکھتا ہے۔

بایں ہمہ اقبال کے کلام میں جو ادبی خوبیاں ہیں وہ عہد حاضرہ کے دوسرے شعرا کے حصہ میں کم آئی ہیں ایک مصور کے لئے انتہائے کمال یہ ہے کہ وہ جس چیز کی تصویر کھینچے۔ ہوبہو اُسی کی شکل پیش کر دے۔ اگر ایک خوبرو جواں کی شبیہ بنائے۔ تو اس کے کشیدہ قامت۔ بھرے بھرے بدن۔ چوڑے چکلے سینے۔ مضبوط گردن اور قوی ہاتھ پاؤں۔ اُن کی خاص وضع کی انگلیوں۔ پھر سبزۂ خط اور لباس کی مناسبت تک کا پورا پورا نقش صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دے۔ تصویر کو دیکھ کر وہی رعب، اور اثر دیکھنے والے کے دل پر ہو جو فی الواقع ایک خوبرو اور وجیہ جوان کے دیکھنے سے ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔

کوہ و وادی کا نقشہ ہو۔ تو اس میں ہر وہ چیز دکھائے جس سے ایک عظیم الشان پہاڑ کی صولت اور وادی کی نظر فریبی میں سرمو فرق نہ آئے۔

ادبی مصور اور معمولی آرٹسٹ میں جو فرق ہے۔ وہ ظاہر ہے۔" اس نامور دستکار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح موقلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں۔ لیکن اُس کے استعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوشنما ہیں۔ کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال چہچہا کر دیتا ہے۔ بغیر بوند پانی اس میں ڈالے ایک ہی بات میں اُسے ایسا کر دیتا ہے۔ کہ کبھی نارنجی۔ کبھی گلناری۔ کبھی ایسا بھینا بھینا گلابی رنگ

ہوتا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ اُسی طرح بوقلموں اور رنگا رنگ اور پھر سرتاپا عالمِ نیرنگ اُس کے مرقع آنکھوں والوں کے لئے رہتے ہیں جو دنیا جہان کے دلوں کو تازہ کرتے ہیں۔"

اپنے موڈل کی صحیح شبیہ پیش کرنے کے لئے ادبی مصوّر کو بعض ضروری امور کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اُن کا بیان ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دینا بے موقع نہ ہوگا۔

(۱) اسے اس امر میں خاص احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ کہ اس کی زبان اس قدر ثقیل اس کے محاورے اس درجہ غیر مستعمل اور اس کے استعارات و تشبیہات اس قدر دور از کار نہ ہوں۔ کہ سننے والے کا دماغ محض لفظی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جائے۔ اور اصل مطلب تک پہنچنا اس کے لئے جوئے شیر لانے کے مرادف ہو۔ نہیں تو اس کی تصویر دھندلی اس کا نقش بے رنگ اور اس کا بیان بے لطف ہوگا۔

(۲) اس کے خیالات اور اس کے طرزِ بیان میں وہ اجنبیت نہ ہو۔ جو دونوں کے یکجا ہونے اور ان سے ایک مفہوم کی ادائیگی میں سدِّ راہ ثابت ہو۔ نہیں تو اس کی تمام کوششیں اس بت ساز سے مشابہ ہونگی۔ جو سنگِ سیاہ سے ایک مرمریں مجسمہ تیار کرنے میں منہمک ہو۔ اور بار بار قطراتِ حسرت و یاس اس کی پیشانی پر نمودار ہوں۔

(۳) اس کی تصاویر اسقدر صاف اور اس کے نقش اس درجہ روشن ہوں۔ کہ دیکھنے والے کو نقل پر اصل کا دھوکا ہو۔ مگر نقل اصل کی نسبت زیادہ واضح اور زیادہ جاذبِ نظر ہو۔

(۴) اس کے لئے فلسفیانہ طریقِ استدلال ضروری نہیں۔ اور نہ ہی ناصحانہ طرزِ نگارش اس کا کام ہے۔ اُسے تو جذبات کی صحیح ترجمانی کرنا ہے۔ اور ضروری ہے کہ وہ جذبات کو جُوں کا تُوں بیان کرے۔ لگی لپٹی نہ رکھے اور نہ یہ پروا کرے۔ کہ فلاں جماعت کیا کہے گی۔ اور فلاں طبقے میں میری نسبت کیسے خیالات پھیلیں گے۔ ع

سچ لاگ بات بال برابر لگی نہ رکھ

(۵) چونکہ ایک ہی طرح کی تصاویر دیکھ دیکھ کر ناظرین کی طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ اس لئے اچھے ادبی مصور کے لئے یہ بھی لازم ہے۔ کہ وہ اپنی تصاویر میں جدّت پیدا کرے۔ جہاں تک ہو سکے۔ فرسودہ طرزِ نگارش سے اجتناب اور بیہودہ راہِ عمل سے احتراز کرے۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کارِ نادر آید گناہے ہم اگر باشد ثواب است

"پیامِ مشرق"

اقبال نے بہت کم نظمیں ایسی لکھی ہیں۔ کہ جن کی زبان روزمرّہ اُردو کے عین مطابق بہت زیادہ فارسی تراکیب سے پاک اور عام اذہان کے لئے سریع الفہم ہو لیکن جب وہ سہل نگاری پر اُترتا ہے۔ تو سلاستِ بیان اور روانیِ خیالات میں اُس کا نظیر ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں مرزا کے کلام پر ریویو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ شاعر کا مرتبہ اس کے بہترین کلام سے پہچانا جاتا ہے۔ ہم بھی یہاں اقبال کی ادبی مصوری کو ہی کی سریع الفہم اور اس کے خاص فلسفیانہ رنگ سے بہتر نظموں میں دکھائیں گے۔ اور اس کی فارسی تصانیف پیامِ مشرق۔ اسرارِ خودی۔ رموزِ بیخودی اور زبورِ عجم سے استفادہ کیا جائیگا۔ اور اس سلسلے میں اُن لوازمات کا جو تمہید میں بیان کئے گئے ہیں۔ خاص خیال رکھا جائیگا۔

اقبال کے مجموعہ کلام اُردو "بانگِ درا" میں سے بخوف طوالت معدودے چند اشعار لے کر بحث کی جائے گی۔

ایک مشہور نظم "ایک آرزو" میں شاعر خدا سے یہ دعا مانگتا ہے۔ کہ اے خدا مجھے اس شوروغل کی دنیا سے الگ ایک مکان پرسکوت عطا ہو جائے۔ جہاں کی فضا نہایت دلکش ہو۔ پہاڑ ہوں۔ ندی ہو۔ سبزہ زار ہوں۔ اور فطرت کی ہر دلفریبی وہاں موجود ہو اور اس کے علاوہ۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو سُرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
پھولوں کو آئے شبنم جس دم وضو کرانے رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو

ندی کے کناروں کا جو عکس پانی پر پڑتا ہے۔ اُس کو شاعر کس خوب صورتی اور کس بے تکلفی سے بیان کر گیا ہے۔

پانی کی موجوں کے بلند ہونے کا باعث پانی کی کوہسار کے نظارہ کی دلچسپی کو دیکھنے کی خواہش قرار دینا صنعت حسن تعلیل کی نہایت اچھی مثال ہے۔ شاعر نے اس ایک شعر میں کئی خوبیاں بھر دی ہیں۔

پھول کی ٹہنی کے سطح آب پر جھکنے کو ایک حسینہ کے آئینہ دیکھنے سے تعبیر کرنا کمال شاعری اور نزاکت تشبیہ کا معراج ہے۔ واقعی اس ایک تشبیہ سے یہ معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ شاعر کا دماغ کتنا ندرت آفریں اور جدت پسند ہے۔

غروب آفتاب کے وقت شفق کی سُرخی کو عروس شام کی مہندی لکھنا بھی حضرت اقبال ہی کا حصّہ ہے۔ یہ تشبیہ بھی نہایت نادر ہے۔ اور اس وقت ہر پھول کی قبا کا سرخی لئے سُنہری ہو جانا بھی شاعر کی سلامتیٔ مشاہدہ پر دال ہے۔

وقت سحر جب ہر کوئی بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہوتا ہے۔ شاعر کو پھول پر پڑی ہوئی شبنم آب وضو معلوم ہوئی ہے۔ پاکیزہ خیال ہے۔

نازک اور اچھوتی تشبیہات ایک ادبی مصوّر کے لئے ایسی ہی ضروری ہیں۔ جیسے ایک مصور کے لئے مختلف مو قلم ان ہی سے اُس کے کلام کا رنگ جمتا ہے۔ اور کلام حقیقت سے زیادہ نزدیک آجاتا ہے۔ جس قدر تشبیہات ایک مشتبہ کی نسبت دی جائیں۔ اُس کی اصلیت اُتنی ہی واضح ہو جاتی ہے۔ اقبال کے چند اشعار میں اچھوتی اور نازک تشبیہات کی کس قدر فراوانی ہے۔ جس سے بلاشبہ اُس کی رسائی ذہن کا پتہ چلتا ہے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں ۔۔۔ یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ ۔۔۔ یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا ۔۔۔ غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا ۔۔۔ ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی ۔۔۔ نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

ایک جگنو کے لئے پھولوں کی انجمن کی شمع، آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ - چاند کی کرن، مہتاب، سفیرِ دربارِ سلطنتِ شب، مہتاب کی قبا کا تکمہ - ذرہ بہ پیرہنِ آفتاب - اتنی تشبیہات! لاریب اقبال کو تخلیقِ تشبیہات میں کمال ہے۔

تجنیسِ لفظی و معنوی میں بھی ایک ادبی مصوّر کے کمالِ فن کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اقبال اس میدان میں بھی کبھی کبھی اشہبِ قلم کو ایک آدھ جولانی دیتا ہوا نظر آتا ہے۔

اپنے استاد داغ کے مرثیہ میں امیر مینائی کی وفات پر ان الفاظ میں ماتم کرتا ہے ؎

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر　　چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

شکستِ مینائے امیر کا واقعہ کس قدر آشوبناک اور ترکیب کیسی دلخراش ہے۔ مشہورِ عالم نظم "شکوہ" کو ان اشعار سے شروع کرتا ہے ؎

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں　　فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں　　ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

"میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں"۔ اس ایک مصرع میں ضرورتِ فریاد کو کس خوب صورتی سے ادا کر دیا ہے!

ادبی مصور کا کمال یہ ہے۔ کہ جس چیز کا بیان کرے۔ اس کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جائے۔ دیکھئے اقبال نماز کی تصویر کس خوبی سے کھینچتے ہیں۔ کہ آنکھوں میں کاروانِ حجاز کی فریضہ گذاری کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سامنے نماز پڑھ رہے ہیں ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز　　قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اللہ اللہ مسدس کے ایک بند میں ایک تصویر کھینچ کے دکھا دینا یہ کمالِ مصوری نہیں تو اور کیا ہے؟

اور اگر کوئی مصور بھی نمازیوں کی تصویر ہو بہو کھینچ دے۔ اور اس میں محمود و ایاز کا رنگ بھی دکھا دے لیکن اس حقیقت کا بیان "نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز" اس کے موئے قلم کے احاطۂ نقاشی سے بعید ہوگا۔

واقعی ایسے ہی ایک دو بندوں کی وجہ سے اہل نظر کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے کہ اے اقبال اس میں کچھ شک نہیں ؎

شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے　　ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

خضرِ راہ میں موجِ مضطر کے ساکن ہونے کو ایک طفلِ شیر خوار کے گہوارے میں سو جانے سے تشبیہ دی ہے۔ شعر

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار　　موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب

"اسرار خودی" میں پھول پر پڑی ہوئی شبنم کو "اشکِ چشمِ بلبل" سے تشبیہ دی ہے ؎

قطرۂ شبنم سرِ شاخِ گلے　　تافت مثلِ اشکِ چشمِ بلبلے

اسی کتاب میں صفحہ ۷۶ پر کوہ ہمالہ اور رودِ گنگ کے مکالمہ میں رودِ گنگ ہمالہ سے خطاب کر کے کہتی ہے ؎

اے ز صبحِ آفرینش یخ بدوش　　پیکرت از رودہا زنار پوش

کوہ ہمالہ کو صبحِ آفرینش سے یخ بدوش کر کے پکارنا اور کثیر التعداد ندیوں کو زنار سے تشبیہ دینا کس قدر قرینِ حقیقت اور مقتضائے ذوقِ سلیم ہے۔

"رموزِ بیخودی" میں ایک واقعہ یوں نقل کیا ہے۔ کہ سلطان مراد کے حکم سے ایک معمار نے ایک مسجد تعمیر کی۔ سلطان کو وہ تعمیر پسند نہ آئی۔ غصے ہو کر اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ معمار روتا ہوا قاضی کے پاس گیا۔ قاضی نے ذہن سلطان کو بلا کر قصاص کا حکم جن الفاظ میں دیا ہے۔ ان سے اقبال کی قادر الکلامی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور ادبی مصور ہونا تو اس کا ثابت ہو جاتا ہے۔ قاضی کہتا ہے ؎

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست　　خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

"خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست" اس ایک مصرع میں اخوت و مساوات اسلامیہ کی تصویر کھینچ کے رکھ

دی ہے۔

ز غم پنہاں نہ گفتن مشکل است   بادہ در مینا نہفتن مشکل است

کیا سیدھی سادی مگر درست تشبیہ ہے۔ شراب صراحی میں نہیں چھپ سکتی ضرور نظر آتی ہے۔ اسی طرح مغموم آدمی کا غم اس کے بشرے سے ٹپکا پڑتا ہے ؎

نمے بینی کہ از مہر فلک تاب   بسیمائے سحر داغ سجود است

سورج کی اس ٹکیہ کو جو صبح کے وقت آسمان پر نظر آتی ہے۔ داغ سجود سیمائے سحر لکھنا نرالی اور حسین تشبیہ ہے۔

ادبی مصور کے لئے یہ امر بھی ضروری ہے۔ کہ اس کا مشاہدہ نہایت مکمل ہو۔ پیام مشرق میں شاعر ایک پرندے سے گفتگو کرتا ہے۔ پرندہ جواب دینے سے پہلے پروں کو کھجلا لیتا ہے۔ یہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے بات چھوٹی سی ہے لیکن اس نے سین کو مکمل کر دیا ہے۔ مصرعہ

پرش را بمنقار خارید و گفت

اقبال کو اپنے خیالات کے لئے اکثر فارسی کی مدد لینی پڑتی ہے۔ اور یہی زبان اس کے اپنے قول کے مطابق اس کی رفعت تخیل کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اس لئے وہ جو مطلب چاہتا ہے۔ چند الفاظ کے ہیر پھیر سے اس زبان میں یا اردو میں فارسی اضافتوں کو ملا ملا کر کہہ ڈالتا ہے۔ [illegible] اس طرح اس کے اکثر مطالب ایک آدھ لفظ میں اس خوبی سے ادا ہو جاتے ہیں۔ کہ خالص اردو کے لفظی فقرات میں ان کو ادا کرنا ممکن نہیں۔ تو ناشدنی مشکل ضرور ہوتا۔ اور بہت ممکن ہے ان میں وہ فصاحت نہ پیدا ہوتی۔

بہرحال اقبال اس امر میں غالب سے زیادہ خوش نصیب ہے۔ کہ اس بچارے کو اکثر فارسی ترکیب بھی کام نہ دے سکیں۔ اور بیشتر مطالب یوں الجھ کے رہ گئے۔ جیسے ایک بلبل نازک اندام خاردار اور گھنی جھاڑیوں میں جا پھنسے۔ اور پھر پھڑپھڑا بھی نہ سکے۔

"آفتاب صبح" میں مسدس کے ایک بند کا مصرع اول ہے۔

و … تصور … آتا ہے وہاں نظر

اب … چھوٹی سی ترکیب … کو تصور کی آنکھوں سے دیکھیں۔ تو اس میں ایک مکمل تصویر نظر آتی ہے۔

آگے … صفحہ ۹ … عنوان … یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

… خموش … عجیب … ہے یہ کھا

… ترکیب اس شعر کی جان ہے۔ … کی شکل ہونا اور پھر اس کا خموش ہونا آنکھوں میں ایک تصویر آجاتی ہے۔ جسے شاید مصور کا قلم نہیں پہنچ سکتا۔

… صفحہ پر دوسری نظم ایک پرندہ اور جگنو ہے۔ اس میں یہ شعر ہے ؎

لباسِ نور میں مستور ہوں میں
پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں

اور اس میں "پتنگوں کے جہاں کا طور" ٹکڑا ملاحظہ ہو۔ شاعر نے جو کچھ محسوس کیا ہے۔ ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ اور اس کے … خیالات میں کوئی تصادم ظاہر نہیں ہوتا ؎

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

جزیرہ سسلی یعنی سیقلیہ کو دیکھ کر شاعر اسے تہذیب حجازی کا مزار کہتا ہے۔ جو … کا آئینہ ہے۔ اور ایک المناک حقیقت ہے۔

سکوتِ شب میں جب ہر شے محوِ خواب ہوتی ہے۔ دریا بھی چلتا چلتا تھم گیا۔ معلوم ہوتا ہے … اس منظر کو ان الفاظ میں ادا کرتا ہے ؎

شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نرم سیر
تھی نظر حیران کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب

مصرع ثانی میں ایک پوری تصویر آگئی ہے۔ اور اس کا اثر کانوں کے رستے دل پر … وہ ایک تصویر میں ناممکن ہے۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

دیو استبداد کے ناچنے کے لئے اگر لفظ "ناچنا" مستعمل ہوتا تو مصرع میں وہ شوکت اور ہیبت پیدا نہ ہوتی جو اب موجود ہے۔ اگلے مصرع میں جو نزاکت ہے۔ اس نے پہلے مصرع کی قوی ہیکلی کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ یہی شعر اس بات کی کافی دلیل ہے۔ کہ فارسی ترکیب اقبال کو اپنے نازک خیالات کے ساتھ ساتھ چلنے میں کامیاب کر دیتی ہیں۔ اور شاید اگر اقبال خالص اردو میں لکھنا شروع کر دیں تو ایسے ایسے اچھے اشعار اس کو نصیب نہ ہو سکتے۔

"پیام مشرق" میں جمعیت الاقوام پر جو چوٹ کی ہے وہ ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

برفتند تا روش رزم دریں بزم کہن　　دردمندان جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند　　بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

یہ خیال اردو میں اس خوبی سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ادا بھی ہو جائے تو "دردمندان جہاں" اور "کفن دزدے چند" کی سی نادر ترکیب اردو کی ترکیب دامانی کہاں میسر آ سکتی ہے۔

الغرض فارسی تراکیب اور فارسی استعارات اقبال کو ایک ادبی شعور بخشتے ہیں بہت مدد دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے سوا خیالات اور الفاظ میں کما حقہ مطابقت نہیں ہو سکتی۔

ماہ نو کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل　　ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل

یعنی آسمان کے دریائے نیل میں سورج کی کشتی ٹوٹ گئی۔ اور اس کا ایک ٹکڑا جو نظر آ رہا ہے۔ وہ ماہ نو ہے۔

جواب شکوہ میں اس مطلب کو کہ جب میرے شکوہ عرش اعلیٰ پر پہنچا تو سیارے بولے کہ کس خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ واقعی اس بند کو پڑھ کر پیر گردوں سیارے اور کہکشاں ان کے ساتھ ہمارے کانوں کے نزدیک ہم کلام ہونے لگتی ہیں

پیر گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی!　　بولے سیارے سر عرش بریں ہے کوئی!

چاند کہتا تھا "نہیں اہلِ زمیں ہے کوئی"! کہکشاں کہتی تھی "پوشیدہ نہیں ہے کوئی"!

کچھ جو سمجھا مِرے شکوہ کو تو رضواں سمجھا

مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

رموزِ بے خودی میں سلطان مراد اور معمار کے قاضی کے سامنے حاضر ہونے کا واقعہ یوں لکھا ہے :-

قاضیِ عادل، بہ دنداں خستہ لب کرد شہ را در حضورِ خود طلب

رنگِ شہ از ہیبتِ قرآں پرید پیشِ قاضی چوں خطاکاراں رسید

از خجالت دیدہ بر پا دوختہ عارضِ او لالہ ہا اندوختہ

یک طرف فریادیِ دعوے گرے یک طرف شاہنشہِ گردوں فرے

آٹھ مصرعوں میں کافی سے زیادہ مکمل تصویر سلطان مراد کی حاضریِ عدالت کی کھینچ دی ہے۔ ہیبتِ قرآں سے اُس کا رنگ اُڑنا، مجرموں کی طرح عدالت میں حاضر ہونا اور شرم کے مارے آنکھیں زمین پر گاڑ دینا، غرض کون سی چیز ہے، جو رہ گئی ہے؟

"پیامِ مشرق" میں فصلِ بہار اور پھولوں کے کھلنے، مرغانِ خوش آواز کے گانے اور باغ و راغ کے سبزہ [illegible] کی تصویر اس خوبی سے کھینچی ہے کہ [illegible] نقشہ ادبی مصوری کا [illegible]

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

مست ترنم ہزار طوطی و دراج و سار

کشتِ گل و لالہ زار چشم تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

حجرہ نشینی گزار گوشۂ صحرا گزیں

بر لبِ جوئے نشیں آبِ رواں را ببیں

نرگسِ ناز آفریں بوسہ زنش بر جبیں

حجرہ نشیں گم بار گوشہ صحرا گزیں

تمام نظم فصل بہار کے ہر پہلو کو صد درجہ نمایاں طور پر ظاہر کرتی ہے۔ لیکن اس کے اندراج سے مضمون خواہ مخواہ طویل ہوگا۔ "مشتے نمونہ از خروارے" بس است۔

ایک خاص بات جو اقبال کے کلام کو اور ادبی مصوّروں سے جدا کرتی ہے۔ یہ ہے۔ کہ اس کے کلام میں موسیقی کو بڑا دخل ہے۔ اس کے اکثر اشعار پڑھ کر ناچنے کو جی چاہتا ہے۔ اور یہ صفت کبھی اس کے کلام سے، خواہ وہ "اسرار خودی" کے ضبط نفس جیسا خشک مضمون ہی کیوں نہ ہو۔ دل اُچاٹ نہیں ہونے دیتی۔ مثنوی اسرار و رموز (اسرار خودی و رموز بیخودی ہر دو یکجا) میں تقریباً ہر شعر میں قافیہ اور ردیف دونوں موجود ہیں۔ اور بعض کو تو ترنم کے بغیر پڑھا بھی نہیں جاسکتا مثلاً

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

پیام مشرق کی اکثر نظمیں ایسی ہیں کہ جن کو بغیر ترنم کے پڑھا ہی نہیں جاتا۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ اقبال ایک فلسفی شاعر ہے۔ اکثر اشعار میں اس کا فلسفیانہ رنگ غالب ہے۔ وہ اشعار میں لقین کرتا ہے۔ اور رواداری کا سبق دیتا ہے۔ تڑپ سوز و گداز کا علمبردار ہے۔ اسکے نزدیک حیات کشمکش کا نام ہے

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اور ادبی مصوّر کے لئے واعظ، ناصح وغیرہ کے فرائض تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اور اس کی خالص ادبی ترقی میں مانع ہوتے ہیں۔ اقبال ایک ادبی مصوّر کی حیثیت سے دُنیا کے سامنے آئے گا تو سہی لیکن دنیا اُسے اس صفت کی بجائے اُس کے اصلی رنگ میں دیکھنے کی زیادہ مشتاق ہوگی ؎

محمد اکبر خاں بی۔ اے (آنرز)
مترجم لیجسلیٹو کونسل پنجاب

اقبال ایک مصلح کی حیثیت سے

ہم ذیل میں علامہ موصوف کے کلام کی مصلحانہ حیثیت پر مختلف پہلوؤں سے بحث کرینگے۔ اقبال کے کلام کو بحیثیت مجموعی ایک ترشے ہوئے ہیرے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جو ہر پہلو سے نیا رنگ۔ نئی روشنی اور نئی چمک دمک پیدا کرتا ہے۔ لہذا اس مقصد کے لئے ہم نے چار مختلف عنوانات یعنی مذہب۔ سیاست۔ نفسیات خودی (موت وحیات) میں منقسم کرینگے۔ پھر ہر پہلو پر روشنی ڈال چکنے کے بعد اُن باتوں کا ذکر کیا جائے گا۔ جو اس مایۂ ناز ہستی کے متعلق وجہ اختلاف و انشقاق چلی آتی ہیں:-

انسان کا یقین و ایمان اس کے مذہب کی جان ہے۔ کوئی کام بھی بغیر یقین کے اتمام کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ کوئی مہم بغیر یقین کے سر نہیں کی جاسکتی۔ جسم کے لئے یقین روح رواں کا حکم رکھتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر عمل کو ایک آنکھ تصور کیجئے۔ تو اس آنکھ کا نور یقین ہی قرار پائے گا بلکہ سیماب زندگی یقین ہی کی زندگی ہے۔ اور تمام سعادتوں کا منبع و مخرج بھی!!

بخلاف اس کے ایک زندگی شک و شبہ اور وہم و گمان کی بھی ہے۔ اور جسے شاید زندگی کے لفظ سے تعبیر کرنا بھی ایک فحش اور ناقابلِ اعتذار غلطی کا مرتکب ہونا ہوگا! کیونکہ ایسے شخص کا وجود ننگِ ہستی! اُس کا سر وبالِ دوش۔ اُس کی روح مُردہ اور اس کے جذبات افسردہ ہوں گے۔ ایسا شخص "خس کم جہاں پاک" کا مصداق ہوگا۔ اور اُس کا گوشۂ لحد میں آرام کرنا اس سے کہیں ہزار درجہ بہتر ہوگا۔ کہ وہ سوسائٹی کو بھی اپنے پست خیالات اور منحوس تاثرات سے ملوث کرے!!۔ وہ حقیقت اور وہ روح پرور تعلیم یہی ہے۔ جسے اقبال نے اپنی تصنیفوں میں جابجا بیان کیا ہے

ملاحظہ ہو ص ۵

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اس عالمِ کون و فساد میں شبہات کی تاریکیاں انسان کو گھیرے رہتی ہیں۔ اور ان تاریکیوں کو زائل کرنے والی چیز نورِ یقین ہے ؎

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

غلامی سے بدتر لعنت کا طوق انسانیت کے گلے میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ بھی بغیر یقین کی تلوار کے نہیں کٹ سکتا ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں!

یقین رُوحِ انسانی کے لئے بال و پر کا کام دیتا ہے۔ جس سے انسان قدسیوں کا ہمراز ہو کر عالمِ بالا کی سیر کرنے لگتا ہے ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا!

معنوی حیثیت سے غور کیا جائے۔ تو یقین ہی کا دوسرا نام ایمان ہے۔ اور اس کا اثر نمایاں ہو کر خاک کو بھی اکسیر بنا دیتا ہے ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے پلٹ جاتی ہیں تقدیریں!

سلطنت - حکومت اور دنیوی جاہ و اعزاز تو اس کے ادنےٰ غلام ہیں ؎

ولایت، بادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں!

عمل کی تلوار اُس وقت تک زنگ آلود اور بے کار محض ہے۔ جب تک اسے یقین کا صیقل نہ دیا جائے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں!

اس سلسلے میں یقین کا سب سے پہلا ثمرہ توحید باری تعالےٰ ہے۔ جو ایک مسلمان کے لئے سب سے بڑی اور بیش بہا نعمت ہے۔ جس کے بغیر کوئی عمل قبولیت کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اور جس کی اشاعت و تبلیغ کے لئے خدا نے بڑے بڑے جلیل الشان پیغمبروں کو دنیا والوں کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ اس پر بھی ڈاکٹر صاحب

نے اپنی تصنیفوں میں جگہ جگہ پر نہایت شان و احترام کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے۔ اور اس کے صحیح مقاصد کے بیان کرنے میں کسی طرح کی کمی نہیں رکھی ؎

تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش — خم نگردد پیش باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست — خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد — فارغ از بند زن و اولاد شد

حد یہ ہے۔ کہ اُس معبودِ حقیقی کی رضا جوئی میں بیٹے تک کی قربانی ایک معمولی چیز نظر آتی ہے ؎

می کند از ماسوائے قطع نظر[1] — می نہد ساطور بر حلقِ پسر
با یکے مثلِ ہجومِ لشکر است[2] — جاں بچشمِ او ز باد ارزاں تر است

توحید کی شان یہ ہے کہ مرد مومن اپنے کعبۂ دل کو خدائے واحد ہی کا مسکن بنائے۔ اور پھر اس راہ میں جیسی بھی تکلیفیں پیش آئیں۔ انہیں بغیر کسی شکوہ و شکایت کے بطیبِ خاطر قبول کرے۔ گویا اس کی زندگی [3]ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا الخ کی مکمل تفسیر ہو جائے ؎

عاشقی؟ توحید را بر دل زدن — وا نگہے خود را بہ ہر مشکل زدن!

کیونکہ توحید جیسی نعمت کے ہوتے ع اگر خواہی حیات اندر خطر زی! کے مطابق مشکلات ہی تو انسان کی زندگی کو نتیجہ کار خوشگوار بناتی ہے!

---

[1] جیسا کہ ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ سے کیا ۱۲ منہ

[2] اشارہ آیۂ ان ابراھیم کان امۃ قانتاً للہ الخ ترجمہ۔ ابراہیمؑ (توحید کی برکت سے باوجود فرد واحد ہونیکے) ایک امت اور جماعت کا مرتبہ رکھتے تھے۔" ۱۲ منہ

[3] آیۂ شریفہ: "جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا معبود اور پروردگار خدا ہے اور پھر کسی تکلیف کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ اس پر قائم رہے" ۱۲۔

اب ہم نماز کے متعلق کہ ایوانِ اسلام کے لئے بمنزلہ ستون کے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے قیمتی خیالات نقل کر کے ایک دوسرے عنوان کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

لاالہ باشد صدف گوہر نماز — قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر است — قاتلِ فحشا و بغی و منکر است [۱]

نماز کا مقصد نہ صرف مسلمانوں کے اعمال اور اخلاق کی اصلاح ہی تھا۔ بلکہ ان میں اجتماعِ قومی اور اتحادِ ملی کو برقرار رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ انہیں مساوات اور یکجہتی کا سبق دینا بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس شاندار فریضے کی اہمیت کو جہاد و قتل و قتال کے موقع پر بھی قائم رکھا گیا ؎

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

نماز ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو ایک حبشی غلام کو وہ شرف بخشتی ہے۔ کہ قیصر کا خون بھی اس کے وضو کے ایک قطرہ آب کی قیمت نہیں ہو سکتا ؎

قطرۂ آبِ وضوئے قنبرے [۲] — در بہا برتر ز خونِ قیصرے

سیاست۔ کلام میں بھی ڈاکٹر صاحب نے مختلف مقامات پر نہایت انوکھے پیرائے میں اپنے خیالات

۱؎ اشارہ ہے آیہ:۔ ان الصلوٰۃ تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی کی طرف۔ ترجمہ: "بلاشبہ نماز بے حیائی، سرکشی اور ممنوع اور ناجائز کاموں سے روکتی ہے۔" ۱۲ منہ

۲؎ یہ حضرت علی رض کے غلام تھے ۱۲ منہ

کا اظہار فرمایا ہے ۔ جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے ۔ وہ مروجہ نظام سیاسی کے سخت مخالف نظر آتے ۔ اور اسے کسی لحاظ سے بھی قومی اور ملکی ترقی کا ذریعہ نہیں سمجھتے ۔ اُن کے عقیدہ میں مسلمان اپنی کھوئی ہوئی شان کو حاصل نہیں کر سکتے ۔ تا وقتیکہ ابوبکرؓ کا صدق ۔ عمرؓ کا عدل اور علیؓ کی شجاعت اپنے اندر پیدا نہ کرلیں ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا   لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا !

وہ جمہوریت کو اسی شان میں دیکھنے کے متمنی ہیں ۔ جو خلیفۂ دوم کے زمانۂ خلافت میں تھی ۔ اور جس کے تحت عدلِ فاروقی نے نظام سیاسی کے لئے ایک بہترین اور لاثانی نمونہ چھوڑا ! آجکل کی برائے نام مہذب اور متمدن قوموں میں جمہوریت کا لفظ جتنا کہ عام ہے ۔ اسی قدر وہ اس کی حقیقت سے بیگانہ اور معنی سے ناآشنا نظر آتی ہیں ! اسی حقیقت کو ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ ذیل شعروں میں بیان فرمایا ہے :-

نادان جیسے اپنی نادانی سے جمہوریت اور آزادی خیال کئے ہیں ۔ وہ فی الحقیقت شخصی استبداد کے سوا کچھ نہیں ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام   جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب   تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری !

پارلیمنٹ یعنی "مجلس شوریٰ" کی حقیقت بھی ملاحظہ فرمایئے ! ؎

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق   طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

پھر جو اس فریب کاری کو جانتے بوجھتے اپنے حقوق کے مطالبے پر اڑے ہوئے ہیں ۔ انہیں مخاطب کرکے تنبیہ فرماتے ہیں ۔ ذرا شانِ استدلال پر تو غور فرمایئے ؎

ترا نادان امید غمگساریہا ز افرنگ است ؟   دلِ شاہیں نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است !

پارلیمنٹ کے ممبر ؎

گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری !

تو پھر کیا تم ان ہی داناؤں سے اپنے لئے صحیح فیصلوں کے خواہاں ہو؟ ؎

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی؟ ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید!

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید!

ان رسمی چیزوں میں کوئی شے بھی معتبر نہیں۔ پھر بھی افسوس ہے کہ ؎

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو!

باایں ہمہ وعد اللّٰہ الّذین امنوا وعملوا الصّالحات الخ[1] کے حوصلہ فزا پیمان کے مطابق مطلق مایوسی بھی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ ان لوگوں کو جو شریعت سے مستغنی رہ کر محض سیاسی داؤ سے اپنے مقاصد میں کامیابی کے متوقع ہیں۔ تنبیہ فرماتے ہیں ؎

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر!

کیونکہ کامیابی تو اسی شاہراہ پر ہے۔ اور اس کے سوا تمام چارہ جوئیاں غلط۔ بے سود اور بے نتیجہ ہیں! ولا تھنوا ولا تحزنوا[2] کی حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر ضرورت صرف ایمانِ کامل کی ہے۔ ساری مشکلیں خود بخود حل ہو جائیں گی! ؎

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں!

روحانی قوتوں کا مقابلہ مادی طاقتیں کب کرسکتی ہیں؟ جو برکت یقین و ایمان میں ہے۔ وہ کسی دوسری چیز میں نہیں! ؎

---

[1] آیہ شریفہ:۔ وعد اللّٰہ الّذین امنوا وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الّذین من قبلھم۔ ترجمہ: "خدا نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے۔ وعدہ کیا ہے کہ انہیں اسی طرح زمین کا وارث اور مختار بنادیگا۔ جس طرح کہ پہلوں کو بنایا تھا" ۱۲ منہ [2] آیہ شریفہ۔ ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔ ترجمہ: "سستی کرو اور نہ غم کھاؤ! اگر تم ایماندار ہوئے تو (ہر حالت) میں غالب رہوگے!" ۱۲ منہ

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ　　　تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے!

خودی - انسان کے ذاتی حقائق و معارف، نفسیاتی عوامل و ضوابط اور روحانی عروج و کمال سے عبارت ہے قوم افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوا کرتا ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک زندہ قوموں کی صف میں شمار نہیں کی جا سکتی۔ جب تک اس کے افراد اپنے آپ کو خودی کے لوازم اور صفات سے کامل طور پر مستحکم نہ کریں۔ ہر وہ شخص جو اس حقیقت سے بے خبر ہو جسم قومی کے لئے ایک بیمار عضو کا حکم رکھتا ہے۔ جو کسی حالت میں بھی خطرے سے خالی نہیں! پھر خودی کے یہ مخصوص صفات اس وقت تک ناقابل حصول ہیں۔ جب تک خود اعتمادی کے ساتھ ہی ساتھ انسان اپنے کو الہی صفات اور فطری کمالات کا حامل نہ سمجھ لے۔ اقبال نے اسی روح پرور حقیقت کو مختلف مقامات پر مختلف پیرایوں میں ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

زندگی از طوفِ دیگر رستن است　　　خویش را بیت الحرم دانستن است

یعنی نہ صرف یہ کہ انسان دوسروں کے قید و بند سے آزاد ہو۔ بلکہ خود اپنے اندر ایسی صفات۔ ایسا جاذبہ اور ایسی کشش پیدا کرے۔ کہ لوگوں کے دل بے اختیار اس کی طرف کھنچتے چلے آئیں۔ وہ بنی نوع کے لئے امن اور سلامتی کا مجسمہ بن جائے۔ وہ دوسروں سے بے نیاز ہو۔ اور اس کی اپنی روح ہی اس کے لئے سامانِ حیات پیدا کرے۔ گویا ؎

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ

کر کب نادان طوافِ شمع سے آزاد ہو　　　اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو!

یہ مضمون اس کی عملی زندگی میں جلوہ گر نظر ہو جائے!

وہ "ما ھلك امرؤ عرف قدرہ"[1] کی حکمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ ع

گردِ خود گردندہ چوں پرکار باش!

---

[1] حدیث شریف: جس شخص نے اپنی قدر و منزلت کو دکھا حقہٗ اعلان لیا وہ کبھی ہلاک و برباد نہ ہوگا! ۱۲ منہ

کی حقیقت کو فراموش نہ کر دے! جب یہ مرتبہ حاصل ہو جائے گا۔ تو قدرتی طور پر اس کے دل میں دین کی عظمت اور ملت حنیفی کا احترام پیدا ہوگا۔ وہ محسوس کریگا ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں!

اسے معلوم ہوگا۔ کہ شریعت ہی میرے لئے ایک ایسا مستحکم حصار ہے۔ جس کے اندر رہ کر میں ہر قسم کے خوف وخطر سے محفوظ اور مطمئن رہ سکتا ہوں۔ اور اس سے باہر قدم رکھنے میں ہلاکت اور تباہی! ؎

از سواد کعبہ چوں آہو رمید　　ناوک صیاد پہلویش درید

وہ اپنی ہر سعادت کو شریعت کے ساتھ وابستہ رہنے پر موقوف خیال کرے گا ؎

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ　　پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ!

ڈاکٹر صاحب عمل کے اس پروگرام کو ذکر کر چکنے کے بعد، مسلمان کو نہ صرف اس کی پستی کے اسباب سمجھاتے ہیں۔ بلکہ وہ نسخہ بھی بتلاتے ہیں جس سے کھوئی ہوئی شان دوبارہ حاصل ہو سکے! ؎

خوار از مہجوری قرآں شدی　　شکوہ سنج گردش دوراں شدی

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ　　در بغل داری کتاب زندۂ

تا کجا در خاک می گیری وطن　　رخت بردار و سر گردوں فگن

اپنے "نسخۂ کیمیا" کے امانت دار ہوتے، مسلمان کا مقام پست خاکدان نہیں، عرش بریں ہے! ؎

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی　　ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے!

پھر جو بھی اس "کتاب زندہ" سے کما حقہٗ فائدہ اٹھائے گا۔ اور اسے اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے گا۔ وہ "افرءیت من اتخذ الٰہہ ھواہ"[1] کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر نفس امارہ کے غلبے کو اپنے لئے بدترین غلامی تصور کرے گا اور سمجھے گا کہ ؎

---

[1] آیۂ شریفہ: اے پیغمبر! کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا۔ کہ جس نے اپنے نفس ہی کو اپنا معبود بنا لیا ہوا ہے۔ ۱۲ منہ

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر از دیگراں

پھر نفس کی پابندیوں سے آزاد ہوکر وہ اپنی خواہشات کو خدا کی رضا میں فنا کر دیگا۔ یہاں پہنچکر اس کا دل ایک آئینے سے مثل ہوگا۔ جس میں جمال الٰہی چاروں طرف سے پرتو فگن ہوکر اس کے روئیں روئیں کو دیدۂ بینا بنا دیگا۔ اور یہی، جیسا کہ ذیل کے پیغام سے ظاہر ہے۔ خودی کا انتہائی کمال ہے ؎

ز من گو صوفیانِ با صفا را
خدا جویانِ معنی آشنا را

غلام ہمت آں خود پرستم
کہ با نورِ خودی بیند خدا را

من عرف نفسہ فقد عرف ربہٗ[۱] کی ترجمانی اس سے بہتر الفاظ میں بھی ممکن ہوسکتی ہے؟ - یہاں مجمل طور پر اُن چیزوں کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جن پر بقول اقبال بظاہر بہت کم توجہ کی جاتی ہے لیکن حقیقت میں وہ خودی کو سخت صدمہ اور ضعف پہنچانے والی ہیں:-

خودی کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا جانے والی چیز خوف و ہراس ہے - خوف اسی دل پر غالب آسکتا ہے جو خدا کو چھوڑ کر ما دراء کی طرف مائل ہو۔ اور اسی کا نام شرک ہے ؎

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلب تست
اصل او بیم است اگر بینی درست

ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

حسب و نسب کو وجہ فخر ٹھہرانا اور اسی کو اپنی فضیلت کا معیار قرار دے لینا بھی خودی کو سخت ضعف پہنچاتا ہے ؎

بر نسب نازاں شدن نادانی است
حکم او اندر تن و تن فانی است

نسب کا تعلق محض جسم سے ہے ۔ اور جسم ایک عارضی اور ناپائدار چیز! اس لئے "ان اکرمکم عند اللہ اتقکم"[۲]

---

[۱] حدیث شریف۔ ترجمہ: "جس نے کہ اپنی حقیقت کو جان لیا۔ اس نے خدا کو بھی پہچان لیا!" ۱۲ منہ

[۲] آیہ شریفہ: - خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ (مقبول اور) عزت والا وہ شخص ہے۔ جو سب سے زیادہ پرہیزگار بھی ہو!" ۱۲ منہ

کے مطابق سچی عزت اور حقیقی شرف وہ ہے جو روحانی رشتے سے حاصل ہو ؎

عشق در جان و نسب در پیکر است　　رشتۂ عشق از نسب محکم تر است

یہی وجہ ہے کہ جب سلمانؓ سے اُن کے نسب کے متعلق دریافت کیا جاتا، تو فرماتے "سلمانؓ ابن اسلام"۔
نسب کو شرعی معاملات میں دخل دینا اسلامی اتحاد کو برباد کرنا ہے ؎

گر نسب را جزوِ ملت کردۂ　　رخنہ در کار اخوت کردۂ

گویا ؎

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے　　تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

"الید العلیا خیر من الید السفلی"[1] کی جاں پرور حقیقت کے مطابق ڈاکٹر صاحب سوال کو بھی خودی کے لئے انتہا درجہ نقصان دہ خیال فرماتے ہیں ؎

تا توانی کیمیا شو گل مشو　　در جہاں منعم شو و سائل مشو

یہی وجہ ہے کہ اونٹ پر سوار ہونے کی حالت میں حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے کوڑا بھی گر جاتا۔ تو آپ خود اتر کر اٹھا لیتے کسی سے ہرگز نہ کہتے!

عقدۂ موت و حیات کا حل جس خوبی اور جس تاکید و توثیق سے اقبال نے کیا ہے۔ شاید ہی کسی دوسرے سے بن پڑا ہو۔ اس بارے میں اگر وہ فرمائیں کہ ؎

ہیچ کس رازے کہ من گویم نہ گفت　　ہمچو فکر من دُرِ معنی نہ سُفت

تو کچھ بے جا نہ ہوگا! چند مثالیں درج ذیل ہیں۔ غور فرمائیے!:۔

زندگی غیر متناہی ہے اور موت زندگی ہی کے ایک لمحہ توقف کر لینے کا نام ہے ؎

---

[1] حدیث شریف:۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے اچھا ہے! ۱۲ منہ

سلسلۂ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار   اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار!

زندگی کوئی بے نتیجہ شے نہیں ہے۔ بلکہ وہ بیش بہا شے ہے۔ اور اس کے مقاصد نہایت بلند تر واقع ہوئے ہیں ؎

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں   ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں!

زندگی ہر لمحہ اپنے لئے ایک نئی شان چاہتی ہے۔ اور موت اس آرزو کے اکمل طور پر حاصل ہونے کا ایک وسیلہ ہے! ؎

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو   خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو!

انسانی رُوح بمقتضائے فطرت اپنے لئے بلندی اور رفعت کی خواہاں ہے۔ اور موت اس بے تکلف پرواز کے لئے اسے پوری آزادی دے دیتی ہے ؎

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں   موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

ایک سفینہ پوری تیزی سے سطحِ آب پر رواں ہے۔ اور بالآخر نظروں سے غائب بھی ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسی احساس کو لے کر فرماتے ہیں ؎

جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہیں   ابد کے بحر میں پیدا یونہیں، نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا   نظر سے چھپتا ہے، لیکن فنا نہیں ہوتا!

یعنی ؎

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں   آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں!

موت اگرچہ بظاہر ایک مہیب اور خوفناک چیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں دیکھا جائے۔ تو یہ انسان کے لئے ایک ابدی اور غیر فانی زندگی کا دروازہ کھول دیتی ہے ؎

موت کی تسکین دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں   شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں!
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی   ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی!

یعنی اگر یہ دنیا کا ایک مسلمہ قانون ہے۔ کہ ہر رات کے بعد دن آئے۔ اور ہر تاریکی کے بعد روشنی؛ تو پھر قبر کی تنگ و تاریک کوٹھڑی بھی مسرت کی ہنگامہ آرائیوں اور نورِ فطرت کی تجلیوں سے کیوں معمور نہ ہو جائے؟ ؎

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح / مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح؟

الغرض زندگی ایک غیر فانی شے ہے۔ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ مکان و زمان کی نہ وہ مقید رہی ہے اور نہ رہ سکتی ہے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ / جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!

باایں ہمہ: اسے محدود سمجھ لینا انسانی شرف کو مٹانا اور فطرتِ صحیحہ کو ضائع کرنا ہے!!

شیخ عبدالرحمٰن (منشی فاضل)

پیامِ مشرق

از جناب ڈاکٹر نکلسن کیمبرج یونیورسٹی (انگلستان)

عہد حاضرہ کے سندی شعرا میں اقبال ایک نہایت رفیع پایہ رکھتا ہے۔ اس کے ساز سے دو قسم کے نغموں کی صدا میں نکلتی ہیں۔ پہلی صدا ہندی الاصل (اردو) جو ہندی حریت وطن کے جذبات کے لئے داد طلب ہے۔ اگرچہ اقبال سیاسی حیثیت سے وطن پرست نہیں۔ دوسرا سرود خاک ایران کی شیریں اور سُریلی زبان میں ہے۔ جو مسلمان جماعت کے ساتھ مخصوص ہے۔ درحقیقت یہ جدید اور فیضانی سرود جو اپنی سحر کاریوں سے آتشیں شعلے اور خاکستر دُور دُور پھیلا رہا ہے۔ عنقریب ایک الہامی آواز کی حیثیت پیدا کرنیوالا ہے۔

اقبال نے پنجاب میں جنم لیا۔ اور تعلیم کی تکمیل انگلستان و جرمنی میں کی۔ گویا مشرق و مغرب کا اقتران ہوا۔ لیکن یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ وہ متحد ہوگئے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی قدرتی کمالات سے معمور کیوں نہ ہو۔ اُمید نہیں کرسکتا۔ کہ دونوں تہذیبوں سے جو مختلف اساسوں پر مبنی ہیں۔ کماحقہ لحظ اٹھائے۔ حالانکہ اقبال مغربی تربیت سے خاصہ متاثر ہے مگر اس کا روح خیال خالصاً مشرقی ہی رہتا ہے۔ بیشک گوئٹے۔ بائرن۔ اور شیلے سے وہ باخبر ہے۔ وہ نٹشا کی کتاب "قول زرتشت" (جس میں اس نے اپنی تعلیمات کو دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے) اور برگسان کی کتاب "ارتقا تخلیقی" سے اتنا ہی آشنا ہے۔ جتنا وہ قرآن اور مثنوی مولانا روم سے۔ مگر مغربی تہذیب کے "اصول انسانیت" سے وہ نسبتاً کم باخبر معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ اس کی تنقید جو اگرچہ کبھی سطحی نہیں ہوتی۔ مگر بعض اوقات جامع بھی نہیں ہوتی۔

اس کے فلسفہ کے معتبر نظریئے جو زیادہ تر اسرار خودی اور رموز بیخودی میں اشارتاً نہیں بلکہ صراحتاً مذکور ہیں۔ مختصراً یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے علم کے بغیر اقبال کے کلام کا سمجھنا آسان نہیں۔

وہ حقیقت کو تکوین کا عمل قرار دیتا ہے۔ کہ ایک دائمی حکومت ہستیِ مطلق کا قصرِ سکوت اس کے نظامِ اشیاء میں کوئی محل نہیں رکھتا۔ کل حرکت میں ہے۔ کائنات افراد کے اشتراک کا نام ہے۔ جس کا موجد بے ہمتا یعنی خدا ہے۔ وجود کی تشکیل اور تہذیب اس کا مقصدِ حیات ہے۔ انسانِ کامل نہ محض مادہ کی دنیا پر تسلط جما کر جذب کر سکتا ہے اس لئے حیات کا جوہر محبت ہے۔ جو اپنے اعلیٰ پایہ میں تخلیقِ خواہشات۔ تخیلات اور ان کے اظہار کی سعی ہے۔ چنانچہ خواہشات ہی خواہ اچھی ہوں یا بری۔ شخصیت کو قوی یا کمزور کر دیتی ہیں۔ اور تمام قدر و منزلت اُسی معیار سے جانچی جاتی ہے۔

یہ ضرور نہیں[1] کہ نطشا اور برگسان کو اقبال سے مناسبت دی جائے۔ حالانکہ یہ کم واضح ہے۔ کہ کیوں اقبال اپنی

---

[1] یہاں پر جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسٹر براؤن نے اپنی تالیف "تاریخ ادبیات فارس کی چوتھی جلد صفحہ ۴۰۴ پر جہاں حکمت الاشراق مصنفہ شہاب الدین سہروردی کا ذکر کیا ہے۔ وہاں ڈاکٹر اقبال کی تالیف "مابعد الطبیعات ایران" سے کچھ نقل کرکے اقبال کے نظریۂ مذہب بابی سے کلی طور پر اتفاق ظاہر کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اسی صفحہ پر ایک مختصر سا نوٹ بھی اقبال کا تعارف کرانے کی غرض سے (جس میں آپ کی اسرارِ خودی کے متعلق مذکور ہے) لکھا ہے کہ "یہ کتاب لاہور یونیورسٹی پریس میں طبع ہوئی ہے۔ (جو غلط ہے) یہ مشرقی رنگ میں نیٹشا مشہور جرمن فلسفی کے فلسفہ کا چربہ ہے" یہ یاد رہے کہ جب دو بڑے آدمی اگر اپنے کسی جذبات میں ایک دوسرے سے اتفاقیہ متفق ہو جائیں۔ جن کے نتیجہ میں کلی اختلاف ہو۔ تو ان دونوں کو ایک دوسرے کا کلی طور پر خوشہ چیں یا متشابہ نہیں کہہ سکتے۔ مزید برآں ہم ناظرین کی اطلاع کے لئے ڈاکٹر براؤن کے اپنے الفاظ جو آپ نے لندن کے شاہی مشرقی مجلس کے سنہ ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۴۷ پر چہ میں اسی کتاب اسرارِ خودی کے مترجمہ نکلسن انگریزی پر تبصرہ کیا ہے۔ اور اپنے الفاظ کی نہیں۔ بلکہ جہاں خود ڈاکٹر نکلسن کو ذرہ بھر بھی اس قسم کا شبہ ہوا ہے۔ اُس کی بھی کامل طور پر تردید کی ہے۔ وھو ھذا۔ "جیسا کہ ڈاکٹر نکلسن بیان کرتا ہے۔ کہ زیادہ تر نطشے اور برگسان کا اور بہت کم جدید فلسفہ افلاطون کے ماہرین اور اُن کے مشرقی جانشین کا مرہونِ منت ہے۔ حالانکہ کسی حالت میں بھی مغربی فلسفہ نہیں بلکہ صراحتاً فلسفی حیثیت سے اخوتِ اسلامی کی تعلیم ہے۔ جو استغراق۔ انسداد خودی وہمہ اوست کی امراض کے علاج (باقی صفحہ ۳۱۶)

خیالی مجلس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تصورِ اسلام کے مطابق پیش کرتا ہے۔ اور کیوں اس مجلس کی شرکت کا استحقاق مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جدوجہد کرنیوالے نے فلسفی کو پیدا کر دیا ہے۔ جس کا منطقی نتیجہ غلط مگر شاعری کے لحاظ سے صحیح ہے۔ شاعر اقبال کو معقولات سے سخت نفرت ہے۔ وہ ابن سینا کا مولانا رومی سے تباین ظاہر کرتا ہے ؎

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم　　دستِ رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فروتر رفت و تا گوہر رسید　　آں بگردابے چو خس منزل گرفت
حق اگر سوزے ندارد حکمت است　　شعر میگردد چو سوز از دل گرفت

پیامِ مشرق گوئٹے کے دیوان مغرب کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اقبال ابتدائی اشعار میں جو امیر افغانستان کے تقدیم میں خطاب کئے گئے ہیں۔ کہتا ہے ؎

پیرِ مغرب شاعرِ المانوی　　آں قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی
بست نقشِ شاہدانِ شوخ و شنگ　　داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغامِ شرق　　ماہ تابے ریختم بر شامِ شرق

اگرچہ پیام دیوان سے بظاہر مشابہ ہے۔ کیونکہ دونوں میں مختصر نظمیں ابواب میں مرتب ہیں۔ اور علیحدہ علیحدہ عنوان رکھتے ہیں۔ ویسے اپنے علم مقصد میں نفس مضمون کے لحاظ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ گوئٹے کی صرف "خورد[۵]

(بقیہ حاشیہ ص ۔۔۔) کیلئے لکھی گئی ہے۔ مصنف کے نظریہ کے مطابق جنہوں نے پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندہ تعلیم کے تابعین کو مُردہ کر دیا ہے۔ اس کار روئے سخن جیسا کہ ڈاکٹر نکلس نے بیان کیا ہے۔ محض مسلمانانِ ہند کے لئے نہیں۔ بلکہ مسلمانانِ عالم کے لئے ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے بجائے اُردو کے فارسی میں تصنیف کرتا ہے۔ جو ایک عمدہ مسلک ہے۔ کیونکہ خواندہ مسلمان بہ نسبت اَور زبان کے فارسی سے زیادہ آشنا ہیں۔ جسے بالخصوص اپنے فلسفیانہ تخیلات کو بلا توقف بلند پرواز دلربا پیرایہ میں بیان کرنے کی غرض سے کما حقہ ادا کیا ہے۔ مترجم

۵ جن کے جرمی نام

شاعر اور جو ئٹے آب "نظمیں ہیں - جو دیوان میں شامل نہیں ہیں - اور پیام میں انہیں عنوان سے براہ راست جواب دی گئی ہیں "جلال اور گوئٹے" کے عنوان کے تحت میں اقبال مولانا جلال الدین رومی کو جس کا وہ نہایت مداح ہے. گوئٹے سے بہشت میں ملاقات کرتا ہوا تصور کرتا ہے - اس کو سننے کے بعد فوسٹ مصنفہ گوئٹے کا مطالعہ کیا ہے - رومی اس طرح کلام کرتا ہے ؎

فکر تو در کنج دل خلوت گزید　　این جہانِ کہنہ را بازآفرید
سوز و سازِ جاں بہ پیکر دیدۂ　　در صدف تعمیر گوہر دیدۂ
ہرکسے از رمزِ عشق آگاہ نیست　　ہرکسے شایانِ ایں درگاہ نیست
"داند آں کو نیک بخت و محرم است　　زیرکی ز ابلیس و عشق آدم است"

پیام کے کثیر حصہ کا سمجھنا مشکل ہے - اور اس سے زیادہ مشکل اس کا ترجمہ کرنا ہے - پیچیدہ جذبات اور مشکل فلسفی تخیلات اکثر اوقات فارسی شاعری کے استعارات و تشبیہات میں پنہاں ہو جاتے ہیں - لیکن در اصل اظہار شدہ ہمارے ادراک پر بڑی طلب پیدا کرتے ہیں - مزید برآں ہماری ہمدردی کو بھی حاصل کر لیتے ہیں - ذیل کا خلاصہ خط ہے - جو شاعر کو اس کے کسی مسلمان دوست نے لکھا ہے - واقعی ایک اعلیٰ تربیت یافتہ اور فہمیدہ انسان مادہ کے اصل اصول کی طرف رجوع کرتا ہے - اگر کسی نے کافی پڑھا ہو - کافی تفکر کیا ہو - اور کافی ہی شبہات میں پڑا ہو - تو اعلیٰ تخیل تک پہنچ سکتا ہے - جس پر آپ اپنے مطالعہ کرنے والوں کو اپنے سادہ طریقہ سے لے جانے کی خواہش کرتے ہیں - یہ کتاب محض اُن کے لئے ہے - جو اپنی خودی کو ارادتاً مصروف کرنے کے شغل سے کافی واقف ہوتے ہیں - کیونکہ وہ اسے ایک زینہ سے دوسرے تک لے جانے کے لئے ذریعہ ایمان بناتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تمام انسانی دنیائے جذبات کی غایت

؎ گوئٹے کی مشہور و معروف تصنیف ایک ڈراما ہے - جس میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کا قدیم روایت کے پیرائے میں بیان کیا ہے - اور انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں - کہ اس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آ سکتا ۱۲

بلندی سے لیکر تنگ و تاریک شکوک تک تلاش کر لی ہے۔ آپ کے معاملہ میں نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے "دست از یک بند تا افتاد بند دگر" اور ہم ہیں کہ نہ اتنا محسوس کیا ہے۔ اور نہ اتنا مشاہدہ کیا ہے۔ اس لئے ہم کو اس اعلیٰ روحانی دنیا میں رہنے کی نہ جرأت ہی اور نہ قابلیت ہی رکھتے ہیں۔ گر وقتاً فوقتاً اس میں تفکر کرنے کیلئے میں جو کچھ کر سکتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ شاعر کے تخیل کے اشارات قلمبند کر دوں۔ اس امید میں کہ بعض لوگ جو میرا ترجمہ پڑھیں گے۔ تو اس عجیب و غریب کتاب کو مجموعی حیثیت سے مطالعہ کرنے کی طرف راغب ہونگے یہ اس قابل ہے۔ کہ اقبال کی بلند اور زبردست شخصیت سے تعارف کرا دے۔ یہ مسلمہ ہے۔ کہ جس قدر سخت تکالیف ہوتی ہیں۔ اُتنا ہی عظیم ان کا اجر ہوتا ہے۔ جیسا کہ عرصہ ہوا۔ تسرئیں نے کہا ہے ...

اقبال کے لئے خود شعوری و انفرادیت ہی اصل اصول ہے۔ وہ ہمیشہ علم ذات و اثبات خودی اور ارتقائے نفس کا سبق دیتا ہے۔ اس کا مقصد حیات عمل ہے۔ جس کا انجام روحانی اور اخلاقی قوت ہے۔ جو ضبط نفس و اطاعت سے نشو و نما پاتی ہے۔ ہم مادہ کو تسخیر کرنیکے بعد آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور پُر حدت زندگی اور وقت کے فضائی تصور کے بعد غیر فانی زندگی حاصل کرتے ہیں ۵

زندگی

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست؟ | گفتا مے کہ تلخ تر او نکو تر است
گفتم کہ کرمک است و ز گل سر بروں زند | گفتا کہ شعلہ زاد و مثال سمندر است
گفتم کہ شد بفطرت خام نہادہ اند | گفتا کہ خیر او نشناسی ہمیں شر است
گفتم کہ شوق سیر نبردش بمنزلے | گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است
گفتم کہ خاکی است و بجا کش ہمی دہند | گفتا چو دانہ خاک شگافد گل تر است

۲

گدائے جلوہ رفتی بر سر طور | کہ جان تو ز خود نا محرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن | خدا ہم در تلاش آدمے ہست

۳

میا با بزم بر ساحل که آنجا　　نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز　　حیات جاوداں اندر ستیز است

۴

دل من راز داں جسم و جاں است　　نه پنداری اجل بر من گراں است
چه غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم　　ہنوز اندر ضمیرم صد جہاں است

۵

جہان ما که پایانے ندارد　　چو ماہی در یم ایام غرق است
یکے بر دل نظر وا کن که بینی　　یم ایام در یک جام غرق است

۶

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں　　خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں

۷

می خورد ہر ذرۂ ما پیچ و تاب　　محشر در ہر دم ما مضمر است
با سکندر خضر در ظلمات گفت　　مرگ مشکل زندگی مشکل تر است

۸

حیات جاوید

گماں مبر که بپایاں رسید کار مغاں　　ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است
چمن خوش است و لیکن چوں نواز بیست　　قبائے زندگیش از دم صبا چاک است
اگر ز رمز حیات آگہی مجوے دیگر　　دلے که از خلش خار آرزو پاک است
بخود خزیده و محکم چو کوہساراں زی　　چو خس مزی که ہوا تیز و شعله بیباک است

۹

بشبنم زار نالید ابرِ بہار — کہ این زندگی گریۂ پیہم است
درخشید برق سبک سیر و گفت — خطا کردۂ خندۂ یک دم است
ندانم بگلشن کہ برد این خبر — سخنہا زماں گل و شبنم است

۱۰

زندگی و عمل

(در جواب نظم ہائنا موسوم بہ سوالات)

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم — ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت — ہستم اگر می روم گر نروم نیستم

۱۱

نوائے وقت

خورشید بہ دامانم، انجم بگریبانم — در من نگری ہیچم، در خود نگری جانم
در شہر و بیابانم در کاخ و شبستانم — من دردم و درمانم من عیش فراوانم
من تیغ جہاں سوزم من چشمۂ حیوانم

چنگیزی و تیموری مشتے ز غبار من — ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرار من
انسان و جہاں او، از نقش و نگار من — خون جگر مرداں سامان بہار من
من آتش سوزانم من روضۂ رضوانم

آسودہ و سیارم این طرفہ تماشا بین — در بادۂ امروزم کیفیت فردا بین
پنہاں بضمیر من صد عالم رعنا بین — صد کوکب غلطاں بین صد گنبد خضرا بین
من کسوت انسانم پیراہن یزدانم

تقدیر فسونِ من تدبیر فسونِ من تو عاشقِ لیلائے من دشتِ جنونِ تو
چوں روانِ پاکم از چند و چگونِ تو تو رازِ درونِ من ، من رازِ درونِ تو
از جانِ تو پیدایم در جانِ تو پنہانم
من رہرو تو منزل من مزرع و تو حاصل تو سازِ صد آہنگے تو گرمیِ ایں محفل
آوارۂ آب و گل! دریاب مقامِ دل گنجیدہ بجامے بیں ایں قلزمِ بے ساحل
از موجِ بلندِ تو سر بر زدہ طوفانم

۱۲

سرودِ انجم

ہستیِ ما نظامِ ما مستیِ ما خرامِ ما
گردشِ بے مقامِ ما زندگیِ دوامِ ما
دورِ فلک بکامِ ما مے نگریم و مے رویم
جلوہ گہِ شہود را بُت کدۂ نمود را
رزمِ نبود و بود را کشمکشِ وجود را
عالمِ دیر و زود را مے نگریم و مے رویم
گرمیِ کارزارہا خامیِ پختہ کارہا
تاج و سریر دارہا خواریِ شہریارہا
بازیِ روزگارہا مے نگریم و مے رویم
خواجہ ز سروری گذشت بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت دورِ سکندری گذشت
شیوۂ بُت گری گذشت مے نگریم و مے رویم

خاک بخون غلطد و درد کش   مست نہاد و سخت کوش
گاہ بہ بزم نای و نوش   گاہ جنازہ بدوش
میر جہان و سفتہ گوش!   می نگریم و می رویم

تو بہ طلسم چون و چند   عقل تو در کشا د و بند
مثل غزالہ در کمند   زار و زبون و دردمند
ما بہ نشیمن بلند   می نگریم و می رویم

پردہ چرا؟ ظہور چیست؟   اصل ظلام و نور چیست
چشم و دل و شعور چیست؟   فطرت ناصبور چیست
این ہمہ نزد و دور چیست؟   می نگریم و می رویم

پیش تو نزد ما یکے   سال تو پیش ما دمے
اے بکنار تو یمے   ساختہ بہ شبنمے
ما بتلاش عالمے   می نگریم و می رویم

اخیر حصّہ کا عنوان نقشِ فرنگ ہے۔ جس میں مشرقی ناظر کے لئے اہم ترین مغربی تخیل کی توضیح شاعر کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ (اور مغربی ناظر کے لئے) اپنے آپ کو اس طرح مشاہدہ کرنا جس طرح اُس کو دوسرے کرتے ہیں۔ بہت بہتر ہے۔ اور اس سے بہتر یہ ہے۔ کہ ہم صحیح پیام کو دل سے لگائیں۔ جس میں اقبال خشک عقلی زنجیروں کو اُتار کر پھینکنے اور ہماری حیات و محبت کی اندرونی دنیا میں ظاہر ہونے کی تلقین کرتا ہے ؎

۱۳

دانش اندوختہ دل ز کف انداختہ   آہ ز ان نقد گران مایہ کہ در باختہ
حکمت و فلسفہ کاریست کہ پایانش نیست   سیلی عشق و محبت بہ دبستانش نیست

بیشتر راہِ دلِ مردم بیدار زنند ۔۔۔ فتنۂ نیست کہ در چشم سخن سازش نیست
دل ز نازِ خنکِ او بہ تپیدن نرسد ۔۔۔ لذتے در خلش غمزۂ پنہانش نیست
دشت و کہسار نوردید و غزالے نگرفت ۔۔۔ طوفِ گلشن زد و یک گل بہ گریبانش نیست

چارہ این است کہ از عشق گشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

چشم بکشاے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

زندگی جوئے روان است و روان خواہد بود ۔۔۔ این مئے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود
آنچہ بود است و نباید ز میان خواہد رفت ۔۔۔ آنچہ بایست و نبود است ہمان خواہد بود
عشق از لذتِ دیدار سراپا نظر است ۔۔۔ حسن مشتاقِ نمود است و عیان خواہد بود
آن زمینے کہ برو گریۂ خونیں زدہ ام ۔۔۔ اشکِ من در جگرش لعلِ گران خواہد بود

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

اقبال ادنیٰ ادنیٰ سیاسی واقعات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کی جمعیت الاقوام کے متعلق سطور خاص اس کا اپنا ہی رنگ رکھتی ہیں ؎

۱۴

جمعیت الاقوام

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن ۔۔۔ دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند　　بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

۱۵

فلسفی را با سیاست داں بہ یک میزان مسنج　　چشمِ آں خورشید کوری دیدۂ ایں بے نمے

کے فلسفی بذاتِ خود اثر کن چوٹیں سہتے ہیں۔ خاص کر ہیگل جس کے بلند پرواز دماغ کو کہا جاتا ہے۔ "ماکیاں کز زور مستی خایہ گیرد بے خروس" مثلاً مصنف کا طریقہ جیسے اپنے مسلمان ناظرین کو مغربی فلسفہ سے آشنا کرنے کی خاطر اختیار کیا ہے۔ شوپن ہار اور نیٹشا کے متعلق اس کے کلام کو پیش کرتا ہوں ؎

۱۶

شوپن ہار و نٹشا

مرغے ز آشیانہ بسیرِ چمن پرید　　خارے ز شاخِ گل بہ تنِ نازکش خلید

بد گفت فطرتِ چمنِ روزگار را　　از درد خویش و ہم ز غم دیگراں تپید

داغے ز خون بیگنہے لالہ را شمرد　　اندر طلسمِ غنچہ فریب بہار دید

گفت اندریں سرا کہ بنایش فتادہ کج　　صبحے کجا کہ چرخ درو شامہا نچید

نالید تا بحوصلۂ آں نوا طراز　　خوں گشت نغمہ در دو چشمش فرو چکید

سوزِ فغانِ او بدلِ ہدہدے گرفت　　با نوکِ خویش خار ز اندامِ او کشید

گفتش کہ سود خویش ز جیبِ زیاں برآر　　گل از شگافِ سینہ زرِ ناب آفرید

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی

خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

حالانکہ اقبال بصمیم قلب نیٹشا کے ارادۂ قوت سے متفق ہے۔ اس کا نظریہ کہ اسلام ایک خیالی جماعت تصور کیا گیا ہے۔ جو خدائی اور جمہوری سلطنت ہے۔ اس کا "دیوانہ بکار خویش ہشیار رسید"! سے مقابلہ کرتا ہے[۵]۔ جیسے وہ منتہیٔ فیروزا جہانہ

۵۔ ڈاکٹر اقبال نے ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون بعنوان "جمہوریتِ اسلام" "نیو ایرا" اخبار میں لکھا۔ جس میں آپ نے (باقی بر صفحہ)

ایک دہریہ تصور کرتا ہے ؎

۱۷

نیٹشا

گر نوا خواہی ز پیشِ او گریز — در نئے کلکش غریوِ تندر است

نیشتر اندر دلِ مغرب فشرد — دستش از خونِ چلیپا احمر است

آنکہ بر طرحِ حرم بت خانہ ساخت — قلبِ او مومن دماغش کافر است[1]

خویش را در آں نمرود سوز — زانکہ بستانِ خلیل از آزر است

میں خیال کرتا ہوں۔ کہ یہ مناسب ہوگا۔ کہ مصنف پیغام (اقبال) کو بحیثیت زندہ مسلمان کے بیان کروں۔ ابھی کوئی بھی جدید فلسفی نہیں۔ جس سے اسے اتنی ہمدردی ہے۔ جتنی برگسان جس کی تعلیم کو ان سطور میں بیان کرتا ہے ؎

(بقیہ حاشیہ صـــ) نے نٹشے سے اس سلسلہ میں اختلاف ظاہر کرتے ہوئے یورپ کی جمہوریت کا بھی نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ ہونہا مغربی جمہوریت کو معاشرتی بد امنی اور فساد کے خطرہ میں پناہ دیگئی ہے۔ جو بعض مغربی مجالس کی اقتصادی حیات جدیدہ کو وجود میں آئی ہو۔ نٹشے تاہم جمہوری حکومت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور عام طبقہ سے ناامید نظر آتا ہے۔ وہ تمام اعلیٰ تہذیب کو حکومت شخصی کی تربیت و ترقی پر بنا کرتا ہے مگر کیا عام انسان کلی طور پر اسی طرح ناامید ہیں؟ جمہوریت، اسلام ایزادی اقتصادی عنصر سے پیدا نہیں ہوئی۔ یہ ایک روحانی اصول اس ذہنیت پر مبنی ہے کہ بنی نوع انسان ستور حکومت کا مرکز ہے۔ جس کی ممکنات ایک خاص قسم کے عمل سے پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اسلام نے عوام میں سے بہترین حیات و عمل کی ہستیاں پیدا کی ہیں۔ پھر کیا جمہوریت ابتدائے اسلام نیٹشا کے نظریات کا عملی بطلان نہیں ہے۔

[1] نٹشا نے مسیحی فلسفہ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے۔ اس کا دماغ اس واسطے کافر ہے۔ کہ وہ خدا کا منکر ہے۔ گو بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت سے قریب ہے یہ "قلبِ او مومن دماغش کافر است" نبی کریمؐ نے اس قسم کا جملہ امیہ بن صلت (عرب شاعر) کی نسبت کہا تھا۔ "آمن لسانہ وکفر قلبہ" یعنی "زبان سے مومن ہے اور دل سے کافر ہے"۔ ۱۲

۱۸

پیغام برگسان

تا بر تو آشکار شود راز زندگی　　خود را جدا ز شعلہ مثال شرر مکن
بہر نظارہ جز نگہ آشنا میار　　در مرز و بوم خود چو غریباں گذر مکن
نقشے کہ بستہ ای ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردہ دل است

ظریفانہ اور دلکش تنقید کے قدر دان خاصہ سامان تفریح پائیں گے۔ مثلاً آئین شاہین کے متعلق "کردہ زر دشتے زنسل موسیٰ و ہارون ظہور"! یا لینن کے متعلق جو قیصر ولیم کو غلبہ اشتراکیت کا دعوے کرتے ہوئے جواب دیتا ہے کہ لوگوں نے محض ایک آقا کا دوسرے سے تبادلہ کر لیا ہے ؎

نماند ناز شیریں بے خریدار　　اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

"قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" اور "نوائے مزدور" کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال دل و جان سے مزدور کا طرفدار ہے۔ یہاں نوائے مزدور کے اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے ؎

۱۹

ز مزد بندۂ کرپاس پوش و محنت کش　　نصیب خواجہ ناکردہ کار رخت حریر
ز خوے فشانی من لعل خاتم والی　　ز اشک کودک من گوہر ستام امیر
بطوف شمع چو پروانہ زیستن تا کے
ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ اصول جو فلسفہ میں عقلیت کے خلاف چلتا ہے۔ سیاسیات میں بھی سلطنت کے خلاف چلتا ہے۔ انتہا و اعتدال قوم پرست اقبال کو اپنے مطالب کے مطابق بحوالہ پیش کر سکتے ہیں۔ جیسے فرقۂ سائنڈیکلسٹ برگسان کا حوالہ دیتا ہے۔ مگر روح حیات پھونکنے والے عمل کو لغو تحریک پر بنا کرنے کی

ضرورت نہیں۔ اقبال کھلم کھلا ضبط نفس کو بیان کرتا ہے۔ جو خود شعوری کی اعلیٰ شان ہے۔ اور خیالی آدمی میں تعقل اور فہم ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ یقین رکھنا چاہئے۔ کہ یہ اس کے نقادوں کی تسلی نہیں کریگا۔ جو اس کے نظریات کے استعمال کو کافی وضاحت سے جانتے ہیں۔ ان کو اس کا "خطاب بہ انگلستان" پڑھنا چاہئے ۵

۲۰

خطاب بہ انگلستان

مشرقی بادہ چشیدہ است ز مینائے فرنگ ‌‌ عجبے نیست اگر توبۂ دیرینہ شکست
فکر نوزادۂ او شیوۂ تدبیر آموخت ‌‌ جوش زد خوں بہ رگ بندۂ تقدیر پرست
ساقیا تنگ دل از شورش مستاں نشوی ‌‌ خود تو انصاف بدہ ایں ہمہ ہنگامہ کہ بست
بوئے گل خود بہ چمن راہ نما شد ز نخست
ورنہ بلبل چہ خبر داشت کہ گلزارے ہست

(اسلامیکا ۔ جرمنی) (مترجمہ مولوی محمد عبداللہ صاحب اسلامیہ کالج لاہور)

ٹیگور و اقبال

(خاص "نیرنگ خیال" کے لئے)

ٹیگور

ملک الشعرا! تو جلوۂ معنی کا شہید ہے۔ اور تیرا پیام تہذیب ہند کی قدیم یادگار۔ زندگی کا وہ وقفہ، جب دنیا میدان کارزار بنی ہوئی تھی۔ انتقام کی آگ سینوں میں مشتعل تھی۔ اور آنکھیں غیظ و غضب سے جل رہی تھیں! وہ زمانہ جب آستینوں سے لہو کے دھبے نہیں چھپتے تھے۔ تو نے اپنی پُرسکون داستان ایک خوش آئند لہجہ میں چھیڑ دی۔ اور تھکے ماندوں کو لوری دے کر ایک خاموش نیند سلا دیا!۔ تیری شاعری نگارِ فطرت کا آئینہ ہے۔ اور کمال تہذیب و تمدن کی زیب و زینت!!

اقبال

سیّد الشعرا! تو زمانہ کا ایک خود دار پیغمبر ہے۔ اور تیرا پیام کاروانِ ملت کیلئے بانگِ درا۔ زندگی کی وہ منزل، جب عالم میدان حشر بنا ہوا ہے۔ جہد للبقا اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے۔ اور احساس خودی، خود غرضی کے تمام حدود طے کر چکا ہے! کشمکش حیات کا عالم ہے۔ بہت سے قافلے سر منزل پہنچ گئے ہیں۔ اور کچھ جا رہے ہیں! لیکن ایک قافلہ راہ میں ناتوانی کی گہری نیند سو رہا ہے۔ اس وقت تو نے اپنی پُرشوکت آواز کو حدی خوانی میں صرف کر دیا۔ اور بیداری کی ایک بجلی سی دوڑا دی ۔ تیری شاعری درد ملت کی آواز ہے ۔ اور تہذیب و تمدن کی روح ۔ جس کی زمانہ کو ہمیشہ ضرورت ہے ۔

مرزا عسکری علیخاں مجازی لکھنوی

(مصنف پیام جاوید)

اقبال پر ایک محققانہ نظر

اور

ان کی نفسیاتی تشریح

(از مسٹر راغب احسن صاحب ایم۔ اے کلکتہ)

یہ کوئی تعجب انگیز حقیقت نہیں ہے۔ کہ حکیم عصر علامہ اقبال کے مشرب کو ابھی تک چند بالغ نظروں نے کماحقہٗ سمجھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ورنہ شاید شرق یا غرب میں آج کوئی ایسا مبصر نہیں ہے۔ جس نے اس نابغۂ دہر کی شخصیت کا کلی طور پر مطالعہ کیا ہو۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مگر سب سے بڑا سبب خود اقبال کی حیرت انگیز ترکیب اور اس کے پیغام کی زبردست جامعیت ہے۔ اقبال کو سمجھنے کیلئے سب سے پہلے ان کی نفسیاتی تشریح لازمی ہے۔ کسی ذات کا وجود دنیا میں ازخود نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ہر فرد بشر کی شخصیت اس کی حیاتی تعبیرات۔ تمدنی مہیجات اور تہذیبی پیداوار کے اساس پر محکم ہوتی ہے۔ خواہ وہ اپنی فطرت خام میں کتنا ہی جدت و خلاقیت کی صلاحیت کا سرمایہ دار ہو۔ اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں حکیم مطلق کی مشیت نے معجزنما فیاضی سے کام لیا ہے۔ اور اسی نکتہ سے واضح ہے۔ کہ اس کا پیغام بر ہونا مقدر تھا۔ اقبال ما درگیتی کا وہ فرزند رشید ہے۔ جس کی ذات میں آریت عجمیت۔ سامیت۔ یونانیت۔ رومانیت اور المانیت کی کلچر کی لہریں ہم آغوش ہیں۔ وہ ارتقار کائنات اور عمران انسانی کے مختلف تہذیبی نمود کی معنویت سے آگاہ اور ان کا بالغ نظر نقاد ہے۔ مگر وہ "عارف محض" "عالم محض" "ناقد محض" اور "حکیم محض" ہی نہیں ہے

تھا۔ وہ ان سے بہتر و برتر ایک پیغامبر ہے۔ ہم اس کی شخصیت کی کلید اور اس کے مشرب کی روح کا ادراک نہیں کر سکتے جب تک ہماری بصیرت میں اقبال اپنے تمام احساسات و عادات کے ساتھ عریاں و نمایاں نہ ہو جائے۔ جس کے بغیر دنی منزدی بے روح و بے مغز مطالعہ اس کی بارگاہ باطن میں باریاب نہیں ہو سکتا ہے۔ اور اس کی روح نمائی میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اقبال کی غلط تعبیرات اور اس کے متعلق بعض بیہودہ نظریات کی علت صرف اسی بنیادی حقیقت کا جہل ہے! دماغوں کا جہل اور ذہنوں کی نارسی کا ازالہ آسان نہیں ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اگر مندرجہ ذیل خاکہ کے مطابق اس کا مطالعہ کرنا چاہیں۔ تو بہت حد تک ہماری مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ اور فہم اقبال کا راستہ صاف ہو سکتا ہے۔

۱۔ مادی تعمیر و روحانی ترکیب

اقبال کی مادی تعمیر و روحانی ترکیب یعنی اس کی ذہنی و خلقی اساس حیات کے درج ذیل اصول کا فہم اس کے ایک علمی مطالعہ کی ابجد ہے۔ اور اس تحریر کا مقصود اس کے پورا کرنے کی سعی ہے۔

۱۔ **برہمنیت**۔ اقبال آرین نسل سے ہے۔ وہ ایک برہمن زادہ ہے۔ اور یہ لسانیات کے مسلمات سے ہے کہ آرین علی الخصوص ہندو اور ان میں بھی برہمن جو خالص آرین خون کے مدعی ہیں۔ زبردست صلاحیت ذہنی و ذہنی زندگی رکھتے ہیں۔ اقبال اس حیاتی ورثہ کا ایک جائز و حقدار وارث ہے۔ اور علم الوراثت کی یہ اساس اس کی شخصیت کی اساس ہے۔

۲۔ **کاشمیریت**۔ اقبال آرین نسل سے ہونے کے علاوہ کاشمیری برہمن بھی ہے۔ کاشمیری نسل اپنی مخصوص آرین ذہنی صلاحیت پر مستزاد ایک حیرت انگیز صلاحیت فنی قابلیت کی رکھتی ہے۔ آرٹ اور جمالیات کا جوہر خلقی و ذہنی طور پر جتنا اس کاشمیری آرین نسل میں ہے۔ اتنا کسی دوسری آرین قوم میں نہیں ہے۔ کاشمیر نہ صرف بذات خود جنت نظیر ہے۔ بلکہ عملاً جمال پرور، جمال آرا، جمال خیز و جمال آفرین بھی ہے۔ اقبال کاشمیر کی اس جمال آفرینی کے اولین درجہ کی پیداوار ہے۔

۳۔ **فطانت**۔ اقبال درجۂ اول کا ذکی ([illegible]) ہے۔ اس کی باطنی دنیا فطرۃً غیر معمولی

استعداد سے مالامال ہے۔ اس کی برہمنیت یا کاشمیریت معمولی ذہن وفکر کی سرگرمی کی توجیہہ کر
اس کی غیرمعمولی فطانت وروحانی صلاحیت کی توضیح کے لئے یہ لازم ہے۔ کہ ہم اُسے اُن ذہنی جنات
(intellectual) کی نسل کا ایک ممتاز فرد تسلیم کریں۔ جن کی دماغی ساخت وروحانی
برتری و فوقیت مسلّم ہے۔ مگر جن کی پوری اصلیت و علّت کا سراغ اب تک علوم وراثت
(genetics.) نہیں کر سکے ہیں۔ اور جن کو اب تک انسانی علم و تدبیر حسب ارادہ پید
ضروری ہے۔

جمالیت۔ اقبال کی خلقت میں جمالیات کا خمیر ایک امتیازی و بنیادی عنصر ہے۔ اُس کی طبیعت
نت پسند اور اس کا قلب حسّاس اور صاحب شعور ہے۔ اگرچہ وہ اُسی دور مادیت میں نامحسوس کے
بیانِ محکم کا مبلغ اعظم ہے۔ آرٹ اور فنونِ لطیفہ سے اُس کی روح کو زبردست تعلق ہے۔ لطافت و
کا جوہر حیات ہے۔ شعر و موسیقی۔ تعمیرات و نقاشی میں وہ "دنیائے حسن" کا اور دنیائے حسن میں حقیقت
۔ اقبال۔

جستجو "کل" کے لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے حُسن بے پایاں ہے دردِ لا دوا رکھتا ہوں میں

حسن کے اس عام جلوے میں بھی "یہ" بیتاب ہے زندگی اس کی مثالِ ماہئی بے آب ہے

اقبال کی روحِ جمالیت اشت گری و بت پرستی یا سرخوشی و رندیت کی اسیر تو نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک
نصب العین کی علمبردار ہے۔ اس نکتۂ اہمہ کی فہم سے غفلت، فہم اقبال کے نکتۂ آغاز سے غفلت ہے
ادبیت۔ اقبال بطنِ فطرت سے شعر و ادب میں اپنی شخصیت کی نمود و نمو کی غیر معمولی صلاحیت لے
و ادب کے لئے ہے۔ اور ادب اُس کے لئے اُس کا باطن شعر و بیان کا سرچشمہ ہے۔ مگر جس طرح اس کی
بت ایک عظیم الشان نصب العین کی خدمت گر ہے۔ اُسی طرح اور اُسی سلسلہ میں اُس کی طاقت ادبی

یعنی عین اُسی مقصد وحید کی تابع ہے۔ وہ نہ صرف "تلمیذ الرحمٰن" ہے۔ بلکہ ایک ایسا شاعر ہے۔ جس کی شاعری کے متعلق "جزو یست از پیغمبری" کہنا مناسب ہے۔ اقبال میں شخصی انظمہ ایفس کی ادب اور دنیائے حاضر کی قوم اور اجتماعی ادب کی روح ہم آمیز و ہم باز ہیں۔ اقبال کا ادب اس طرح بیک وقت شخصی ادب اور اجتماعی آدرش ہے۔ کیونکہ اس کی ہستی فی نفسہٖ ایک متن ایک نصب العین، ایک منزل، ایک مقصود اور ایک آئیڈیل کا سراپا ہے اور ادب میں اس کی شخصیت کی نمود اس کی خودی اور اجتماعی آئیڈیل دونوں کی بیک وقت نمود ہے۔

(۲) **حکمت**۔ اقبال نہ صرف ایک پیدائشی شاعر و ادیب ہے۔ بلکہ ایک وہبی حکیم بھی ہے۔ اگرچہ یہ قول زبان زد ہے۔ کہ شاعر پیدا ہوتا ہے اور حکیم بنتا ہے۔ اقبال کی وہبی حکمت سے مراد یہ ہے۔ کہ یہ شخص غیر معمولی طاقت و صلاحیت علمی و فکری زندگی کی لے کر آیا ہے۔ وہ کائنات کو نہ صرف ایک آرٹسٹ کیطرح "جمالیت" کی حیثیت سے اور نہ محض ایک اکانومسٹ (معاشی) کی طرح "افادیت" کی حیثیت سے بلکہ مزید بریں ایک حکیم کیطرح "حقیقت" کی حیثیت سے دیکھنا، جاننا اور ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک "ترجمانِ حقیقت" ہے۔ کیونکہ حقیقت کا عشق اور حقیقت کی طلب اُس کی فطرت میں پھول کا عشق اور پروانہ کی فطرت میں روشنی کی طلب پوشیدہ ہوتی ہے۔ حق یہ ہے۔ کہ اقبال کی الہامی حکمت یا وہ حکمت جس کے لئے اقبال حکیم مطلق کی مشیت سے وجود میں آیا ہے۔ یہی ہمہ گیر حکمت مطلق کے ساتھ اُس کی روحانی و ظاہری زندگی پر محیط ہے۔ اور وہ ہر رنگ میں اسی متین و محکم مذہب کا مبلغ ہے۔

یہ تو ایک اجمالی خاکہ اور غالباً ناقص خاکہ اقبال کی شخصیت کے وہبی استعدادات و خلقی عواطف یعنی . . . . حیاتی (بیالوجیکل) ورثہ کا تھا۔ مگر انسانی سیرت کی تعمیر میں علی الخصوص ذہنی و روحی سیرت کی تعمیر میں فرقہ وارانہ تہذیب (گروپ کلچر) کو بھی کچھ اہمیت حاصل ہے۔ جو ہر فرد اپنی فرقہ سے لازماً حاصل کرتا ہے۔ اس اجتماعی ورثہ کو ہم اسوقت سہولت کے لئے تمدنی ہیجانات اور تہذیبی موثرات کے تحت میں دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۲۔ **تمدنی ہیجانات**۔ ہر شخص پیدائش کے وقت سے موت تک کسی نہ کسی ابتدائی فرقہ یا طبقہ کا ممبر

ہوتا ہے۔ اور اُس کی ذہنی زندگی کی تمام عادات و رسومات اسی سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ زبان کے ذریعہ تبادلۂ خیال کر کے ہر شہر اپنے فرقہ سے اپنی جسمانی زندگی اور اس کی غذا اپنی دماغی زندگی اور اس کی غذا اور اپنی روحانی زندگی اور اس کی غذا کو پاتا اور انسان کہلانے کا مستحق بنتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی فرقہ جس پر فرد کی جماعتی و ذہنی زندگی کا اسقدر انحصار ہے۔ قانونِ محافظت نفس کے مطابق اُس کی اصلی شیفتگی، ابتدائی اور اولین قدردانی کا عنصر ہوگا۔ پرائمری گروپ (معاشرہ اولی و معاشرہ ثانی) ایک سے زیادہ، باہم پیوستہ اور دائرہ در دائرہ کی صورت میں ہو سکتے ہیں۔ اس اصل اجتماعیہ کی روشنی میں اگر ہم ایک علمی تجزیہ اقبال کے سوشل علائق و قدور کا کریں۔ تو یہ روشن ہوتا ہے۔ کہ پیدائشی طور پر اقبال کو (۱) کاشمیری قومیت (۲) پنجابی مرز بوم (۳) ہندی وطنیت (۴) مشرقی مقاربت اور (۵) زمان و مکان اسلامی ملیت کے پرائمری گروہوں (دوائرہ اجتماعیہ) سے وابستگی ہے۔

کاشمیری قومیت نے اقبال کی سیرت کو وہ لوچ، ذہانت اور تہذیب عطا کی ہے۔ جو کاشمیری معاشرہ کا عالمگیر خاصہ ہے۔ کاشمیر اور کاشمیری قوم سے اقبال کی اُنسیت ایک فطری تعلق کا پروردہ ہے۔ اُسکی مجالست و موانست کی زبردست خوبی بھی پرائمری گروپ کا عطیہ ہے۔

پنجابی مرز بومیت۔ یہ مشیت خداوندی کا عجیب کرشمہ ہے۔ کہ کاشمیری الاصل اقبال۔ اسلامت خانۂ کاشمیر سے باہر ایک آزاد و زندہ دل خطہ یعنی پنجاب میں پیدا ہوا۔ اور پروان چڑھا۔ پنجابی سوشل گروپ نے اقبال کو وہ رُوح جسور، فضائے حریت اور محیط موافق بخشا ہے۔ جس کو وہ خود کاشمیر کے قید خانہ کے اندر اور کسی خالص کاشمیری گروپ کی چار دیواری میں محصور رہ کر حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جن کے بغیر وہ قعر گمنامی سے اُبھرنے سے قاصر ہوتا۔ اس طرح پنجابی گروپ کا اقبال پر احسان ہے۔ اور اقبال پنجاب اور زندہ دلانِ پنجاب سے تعلق خاطر رکھنے اور اُس کی فلاح و خود مختاری کے لئے جدوجہد کرنے میں حق بجانب ہے۔

ہندی وطنیت۔ اقبال کا تعلق اُس کے وطن ہندوستان سے بہت پُرانا اور گہرا ہے۔ وہ اپنے وطن کے حقوق و واجبات سے کماحقہٗ آگاہ ہے۔ اور اُس کی فلاح و ترقی کے لئے ابتدا سے اشک فشاں ہے۔ مگر وہ ایک جینیئس (genius) کے دماغ مدبرہ کے ساتھ اس کے مسائل کے زیر سطح حقائق کی

طاقت اور مشرق و مغرب کے مسائل سے اُن کے تعلقات سے پوری طرح خبردار ہے۔ وطن عزیز کے لئے اور آزادی کے لئے اُس نے اپنی بہترین فکر و کاوش سے کام لیا ہے۔ اور اپنا بہترین حکیمانہ مشورہ اُس کے مشکلات کو آسان کرنے میں پیش کیا ہے۔ اور یہ اقبال کی سب سے بیش بہا خدمت وطنی ہے۔ جس کو ہندوستان کے کسی دوسرے فرزند نے انجام نہیں دیا ہے۔ دماغوں کا سخت قحط ہے۔ اور ایسے بالغ دماغ جو مشرق و مغرب اور اسلام اور آریت کی رُوح کو عریاں دیکھنے کے اہل اور اُن کے بہترین باہمی تعلق کی اسکیم پیش کرنے کے قابل ہوں نایاب ہیں۔ اقبال آج دنیا میں ایک ایسا دماغ ہے۔ اور شکر ہے کہ اُس نے اپنے دماغ کا یہ عطیہ وطن کو بخشا ہے۔ اقبال جیسے حکیم اعظم کو الفاظ سے دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ سیاسی ترہات خواہ وہ مشرق و مغرب کے مذہب کیوں نہ بن جائیں کسی طرح سقراط اور اقبال کو مبتلائے فریب نہیں کر سکتے۔ خطابت، زعامت اور سوفسطائیت کا جادو ارسطو اور اقبال پر نہیں چل سکتا۔ پس اس دور بت پرستی میں اقبال وقت کے "صنم اکبر" وطن پرستی اور قوم پرستی کا سب سے زبردست مخالف ہے۔ اور اس کے خلاف جنگ کو وقت کا جہاد اکبر یقین کرتا ہے۔ کیونکہ اس "بت نارجمند" کی بدولت انسانیت خستہ و خراب ہو کر ہلاکت کے جہنم زار کی طرف بہ رفتار برق بڑھ رہی ہے وطن پرستی کے جنونی مذہب کی مخالفت حُب وطن کی مخالفت نہیں ہے۔ بلکہ حُب وطن کا اعلےٰ ترین و نادر ترین کام ہے۔ کیونکہ جب خود انسانیت کا وسیع ترین حلقہ باہم متصادم قومیتوں کی جنگِ جہانگیر و جنگ جہاں سوز سے خاکستر ہو جائے گا۔ تو پھر اُس کے داخلی اجتماعی حلقوں، گروہوں، ملتوں اور مفادوں کا کیا حشر ہوگا۔ اور وطنی دریاؤں، وطنی پہاڑوں، وطنی ویرانوں اور خرابوں کے سوا اور کیا باقی رہیگا؟ آج دنیا اس مسئلہ کے روبرو ہے۔ اور اقبال اس کے جواب کے لئے آیا ہے۔

مشرقی مقامیت۔ اقبال، کاشمیری قومیت کے علاوہ پنجابی مرز بومیت کا، پھر ہندی وطنیت کا، اور پھر مشرقی مقامیت کا مبصر ہے۔ اور اس کو اپنی مشرقیت کا پورا احساس ہے۔ وہ مشرق و مغرب کی نہاد روح اور ساخت فکر سے آگاہ اور دونوں کی خوبیوں اور کمزوریوں سے خبردار ہے۔ اور اُن کے عمدہ و صالح عناصر کے اتحاد یا وفاق کا زبردست حامی ہے۔

غربیاں را "زیرکی" سازِ حیات — شرقیاں را "عشق" رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر شود — نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیزدہ
شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ است — چشمِ شاں صاحب نظر دل مردہ است
زخمہا خوردند از شمشیرِ خویش — بسمل افتادند چوں نخچیرِ خویش
سوز و مستی را مجو از تاکِ شاں — عصرِ دیگر نیست در افلاکِ شاں
زندگی را سوز و ساز از نارِ تست — عالمِ نو آفریدن کارِ تست
اے خدا بیں خویشتن را ہم نگر — بحر را در قطرۂ شبنم نگر

مشرق و مغرب کے اس اتحادِ روحی کا پیغام اس بلیغ مصرع میں دیا ہے ع

ہم ز خدا "خودی" طلب ہم ز خودی خدا طلب

اقبال مشرق اور ہندوستان کی بیداری آزادی اور اظہارِ خودی کا طالب ہے۔ اور یقین کرتا ہے۔ کہ اُن کی محرومی انسانیت پر بارِ عظیم ہے۔ اور اُس کے دُور کرنے کے جہاد میں شرکت اُس کا فرض ہے:۔

"ہندوستان کی سیاسی غلامی تمام ایشیا کے لئے لاتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اُس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے۔ اور اُسے اظہارِ نفس کی اُس مسرت سے محروم کر دیا ہے۔ جس کی بدولت کبھی اس میں ایک شاندار تہذیب پیدا ہوئی تھی!"

(۱) ہم پر ایک فرض ہندوستان کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔ جو ہمارا وطن ہے۔ اور جس میں ہمیں جینا اور مرنا ہے۔ اور (۲) ایک فرض ایشیا بالخصوص اسلامی ایشیا کی جانب سے ہے"

خطبۂ صدارت مسلم لیگ ۱۹۳۰ء

۵۔ اسلامی ملّیت:۔ اقبال کاشمیریت پنجابیت۔ ہندیت، مشرقیت، آدمیت یا انسانیت سے بھی

ایک اعلیٰ وارفع مظہر و مقدس، بہتر و برتر حلقۂ ملّیت کا رکن رکین ہے۔ اور اس کا نام ملّت اسلامیہ ہے۔ اقبال اس حلقۂ اخوت میں پیدا ہوا ہے۔ اُس میں پروان چڑھا ہے۔ اور اس کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ کہ وہ اس کا ایک وفادار عضو ہے۔ اور یہ اس کی وفاداری کا اقتضا ہے۔ کہ وہ اپنی تمام وفاداریوں اور ساری محبتوں کو ملّت اسلامیہ کی وفاداری کے تابع یقین کرتا ہے۔ حلقۂ اسلامیت تمام دیگر دوائر وعلائق کا حاکم وقت فیصل ہے۔ اس لئے کہ یہی اسلام کے معنی ہیں۔ دین وسطیٰ انسانی زندگی کے مختلف علائق فطری یا دوائر اجتماعی کی نفی کے لئے نہیں۔ بلکہ اُن کی تعدیل کے لئے موضوع ہے۔ اور قومیت ماول خود کسی دوسری طاقت کی محکوم نہیں ہو سکتی ہے۔ نیز اس لئے کہ یہی انسانیت کا تقاضا ہے۔ جو اسوقت اپنی بقا کے لئے ایک محافظ کا طالب ہے اور اقبال کا یقین ہے۔ کہ صرف ملّت اسلامیہ اس کا محافظ ہو سکتی ہے۔ اقبال اسلام کو ایک جامعہ، ایک سوشیل نظام، ایک سیاست یقین کرتا ہے۔ اور "جامعۂ انسانی" کی فلاح و نجاح صرف اس سے دیکھتا ہے۔ کہ وہ بلا جبر واکراہ "جامعۂ اسلامی" میں منتقل ومبدل ہو جائے۔ انسانیت کی نجات اس میں ہے۔ کہ وہ دین قیّم کے دارالسلام میں پناہ گیر ہو کر موجودہ خودکشی کے جرم اعظم سے کنارہ کش ہو جائے!

۳۔ کلچرل مؤثرات

کلچرل مؤثرات سے مراد وہ تعلیمی محرکات ہیں۔ جنھوں نے اقبال کے ذہنی عواطف واستعدادات یعنی اُس کے نفس کے مواد خام کی صورتوں میں تشکیل کی ہے۔ اور اُسے وہ پختگی، وہ بلوغت اور وہ رشادت عطا کی ہے جو اُس کا امتیاز ہے۔ بلاشبہ مذکورہ تمدنی مؤثرات اس کام میں شریک ہیں۔ اور یہ محض زور و امتیاز ہے۔ جس کے لئے تعلیمی اثرات کو علیحدہ بیان کیا جا رہا ہے۔

(۱) علوم شرقیہ وغربیہ کی اعلیٰ تعلیم وعمیق مطالعہ

کسبی اثرات کی بحث میں پہلی حقیقت جو قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اقبال محض ایک درجۂ اول کا جینیس (Genius) نہیں بلکہ درجۂ اول کا فاضل و عالم بھی ہے۔ اُس کی ذہنی فطانت وذہانت محض خطابت یا سوفسطہ پر منتج نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اُس نے علوم والسنۂ شرقیہ وغربیہ کا خود مغربی کلچر کے قلب یعنی جرمنی

و انگلستان اور مشرقی تہذیب کے گہوارہ ہند عرب و عجم کے مرکزوں میں مطالعہ کیا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ موجودہ دنیائے علم و ادب میں ایک ایسی پوزیشن کا مالک ہے۔ جو اب تک کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہے۔ اُس کی شاعری اوہام ظنیات اور تخیلات کی طلسمی دنیا نہیں ہے۔ بلکہ بزبان شعر علم و عرفان کے دریافت کردہ حقائق کی ترجمان ہے۔

(۲) **آریت اور ہندوازم**۔ اقبال آریت اور ہندوازم کا زبردست عارف اور "دریا ساگر" ہے۔ اس کی برہمنیت اور تہذیبیت پر اس کا ہندو فلسفہ اور آرین کلچر کا حکیمانہ مطالعہ مستزاد ہے۔ وہ انڈین کلچر اور فلسفہ کا عالم و ناقد ہے۔ اُس کی خوبیوں کا دلدادہ اور اس کے نقائص کا شناسا ہے۔ آریت اور ہندوازم کے اس گہرے مطالعہ کا اثر اس کے کلام و پیام سے ظاہر ہے۔

(۳) **ایرانیت اور پارسی ازم**۔ اقبال ایرانی کلچر کا اس لئے زبردست عالم و ناقد ہے کہ وہ کاشمیری ہے۔ اور کاشمیری قوم سب سے زیادہ ایرانی زبان، ادب و تہذیب سے اس مسلک میں متاثر ہوئی ہے۔ ثانیاً اس لئے کہ اس کا تھیسس (مقالۂ علمیہ) ایرانی فلسفہ و تصوف سے متعلق تھا۔ جس کی بنا پر اسے المانی یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ (رشد و فضیلت کا مرتبہ) عطا کیا تھا۔ رفتہ رفتہ ابتدائی عمر کا یہ ایرانی تعلق و مطالعہ، مطالعہ عمیق سے عمیق تر ہوتا گیا۔ اور اُس نے تحقیق کی تکمیل کے لئے قریباً تمام قدیم و جدید السنۂ پارسیہ اور ساری تہذیب عجمیہ کو اپنے دائرہ تفتیش میں گھیر لیا ہے۔ وہ محاسن عجمیہ کا معترف ہے۔ مگر اُس کا یقین ایک ترک مبصر کا یہ یقین ہے کہ ایران وطن اوہام و خرافات و افسانہ" ہے۔ اور عجمیت ردِّ عربیت و اسلامیت کے لئے ایک طرف اور روحِ عملیت و تکمیل خودی کے لئے دوسری طرف سم قاتل ہے۔

(۴) **یونانیت اور ہیلن ازم**۔ اقبال آرین حکمت اور ایرانی تہذیب کے علاوہ دنیا کی اس عجیب ترین قوم کی حکمت و تہذیب کا بھی مبصر اعظم ہے۔ جو خطۂ یونان سے زمانۂ قدیم میں ابھری۔ اور پھر اپنی تہذیب کی بعض ضلالتوں اور ظلمتوں کی وجہ سے ظلمات عدم میں معدوم ہو گئی۔ مگر گردِ ظلمت کی دنیائے حسن و حقیقت کو وہ کچھ دے گئی۔ جو آجتک انسانیت کے لئے قابل ناز ہے۔ اقبال یونانی کلچر کی حقیقت پرستی (لاآف نیچر) لطافت پسندی و حُسن جوئی (جمالیات) سے خاص طور سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ کسی یونانی حکیم کا مقلد نہیں ہے۔ جیسا کہ

جن کے پیشرو ہیگل کے اکثر علما دیونانیات تھے۔ وہ افلاطون کے سخت ترین ناقدین میں سے ہے۔ اور یونانیت پر
شدید معترض ہے۔ اور انتقادی ہے۔ جیسا کہ آریت اور ایرانیت پر۔

(۵) رومانیت اور لاطینی ازم۔ اقبال رومانی تمدن کے مخصوص میراث کا بھی زبردست محقق و معترف ہے۔ اگر یونانیوں نے دنیا کو علوم و حکمت اور فنون و ادب کی دنیا حسن و حقیقت بخشی ہے تو رومانیوں نے قانون اور نظم و دولت کے ادارات عظمیٰ کا ترکہ چھوڑا ہے۔ اور قانون بین الاقوام کی داغ بیل اپنی عالمگیر سلطنت کے مختلف النسل اقوام کے باہمی معاملات کے انصرام کے لئے (jus gentium) کی شکل میں ڈالی ہے۔ اور جس حکیم مطلق نے اقبال کو شعر و ادب اور علم و حکمت کی صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا ہے اُس نے اس کو مغربی دنیا کی ہندی و عجمی اور عربی و لاطینی زندگی و ذہنیت کے مطالعہ و موازنہ کے عملی کام کی توفیق اور ان کے سوشل نظامات، سیاسی ادارات اور قانونی مخلوقات کے تقابلی مطالعہ کی سہولت بھی عطا فرمائی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اقبال جوریس پروڈنس (علم القانون) اور پالیٹکس (سیاسیات) کا متبحر عالم ہے۔ رومانی کلچر کے اس ورثہ اور علم القانون و عمرانیات اس تحقیق و تعلیم نے اقبال کے ذہن کو ایک خاص تعین۔ تحدید، نظم اور ضبط عطا کی ہے اقبال کے نزدیک شریعت ملیہ، ایک ملت کی "نفس لوامہ" یا "قلب مشترک" کی مخلوق ہے۔ جو اس ملت کو ٹھیک اسی طرح دیگر ملل سے ممیز کرتی ہے۔ جس طرح عقلیت و اخلاقیت انسانی افراد کو حیوانی افراد سے تکوین ملت اخلاقی معنوں میں بغیر ایک مخصوص شرعی روایت کے ممکن نہیں ہے۔ اقبال کے نزدیک ملی شریعت یا قانون ایک وسیع المعنیٰ شے ہے۔ اور وہ ملی کلچر کے دیگر مظاہر (مثلاً ملی اخلاقیات۔ ملی دینیات۔ ملی فلسفہ۔ اور ہر تمدن کسی نہ کسی فلسفہ یا تصور عالم کی مجسم مثال ہے) ملی اجتماعیات و عمرانیات سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ اقبال کا یہ تصور کہ شریعت ملیہ نفس ملیہ کی ایک خاص معین مظہر ہے۔ جدید اجتماعی مذہب شریعت (sociological school of jurisprudence.) اور اجتماعی مذہب سیاسیات سے قریب ترین اور ہیگل اور آسٹن کی (monist theory.) نظریہ وحدانی کے قطعی خلاف ہے۔

۶۔ **المانیت اور مغربیت**۔ اقبال موجودہ مغربی کلچر کا عموماً اور المانی تہذیب و حکمت کا خصوصاً محقق اعظم ہے۔ مغربی دین و اخلاق، حکمت و فلسفہ، فنون و ادب، تمدن و معاشرت، معاشیات و سیاسیات کا اقبال سے بہتر عالم و ناقد آج شاید ہی کوئی ہو۔ اقبال کا علم بالواسطہ سماعی یا قیاسی نہیں ہے۔ بلکہ عینی مشاہدات و تجربات کا نچوڑ، ماضی، حال و مستقبل پر حکیمانہ و عالمانہ نظر کا عطیہ ہے۔ آج دنیا اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔ مگر ایک روز مغرب کا اس پیر مشرق کے زمزم سے سیراب ہونا لازم و مقدر ہے!

۷۔ **سامیت اور اسلام**۔ اقبال ۔ ۔ ۔ ایک برہمن بدوی ہے۔ تہذیب اسلامیہ کا اُس سے بہتر محقق اسوقت کوئی نہیں ہے۔ عربیت کو وہ روح سامیت کی مثالی شکل یقین کرتا ہے۔

"میں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے، جیسا کہ مختلف زمانوں میں اس کا اظہار ہوتا ۔ ۔ رہا ہے۔ میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت حاصل کر لی ہے۔ کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے"۔

اقبال اسلامیت کی رُوحِ مجسم کا نام ہے۔ وہ اسلام کے داعیہ کی بنا در الصدر انسانی تہذیب کے مظاہر یعنی (۱) آریت اور ہندوازم (۲) ایرانیت اور پارسی ازم (۳) یونانیت اور ہیلنی ازم (۴) رومانیت اور لاطین ازم اور (۵) المانیت اور ٹیوٹن ازم کی داعیات و روحیات سے دوری یا نزدیکی، مطابقت یا مخالفت سے پوری طرح آگاہ ہے۔ تقدیر عالم اُس پر روشن ہے۔ رفتار تہذیب اُس پر عیاں ہے۔ وہ ایک ایسے دَور میں ظاہر ہوا ہے جبکہ دنیا تیزی سے ایک سیاسی و عمرانی وفاق کے قریب آگئی ہے۔ اقبال اسلام کو اسی عمرانی و روحانی وفاق عالم کی صراط مستقیم یقین کرتا ہے۔ دنیا نے پہلی دفعہ ایک ایسی روح اعظم کو پیدا کیا ہے۔ جس نے ذہنی مطالعہ کے ذریعہ ہند و عجم، عرب و یونان، رُوما اور المان، شرق و غرب اور جدید و قدیم کی روح تہذیب سے آگاہی حاصل کی ہے۔ جو صاحب بصیرت و اجتہاد ہے۔ اور دنیا کے لئے ایک عظیم الشان پیغام کا پیغامبر ہے!

شاعرِ اسلام

ہندوستان وہ ملک ہے جہاں مُردوں کی پرستش ہوتی ہے۔ ہم اپنے آدمیوں کی قدر اس وقت کرتے ہیں۔ جب وہ آنکھ سے اوجھل ہو کر لحد کے گوشے میں جا سوتے ہیں۔ مگر میں اپنی ناتواں آواز بلند کرتا ہوں۔ کہ اقبال مشرق کا پیامبر اقبال، اسلام کا شاعر اقبال، دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہے۔

ٹینی سن۔ وہ ملکی عصبیت کا علمبردار، انگریز کے دل میں انگلیسی جذبے کی لہر پیدا کرتا ہے۔ اور وہ انگلینڈ کا شاعر ہے۔ . . .

براؤننگ۔ وہ آرٹ کا سچا ترجمان، شعر کی دلہن کو حُسن کی اُن اداؤں سے رنگین کرتا ہے۔ جن کی پرستش زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے۔ اور وہ سخن کی محفل میں آرٹ کا صحیح نمایندہ ہے۔ . . .

ورڈسورتھ۔ وہ نیچر کا شیدائی، فطرت کی زبان میں اپنے القائے تصوّر کے بھید کھولتا ہے۔ اور وہ ان فضاؤں کا سب سے زیادہ رنگین طائر ہے . . .

کیٹس۔ حُسن کی تعریف میں حسین نغمے گانے والا کیٹس، خیال کے پردے پر حُسن کی وہ جمال آگین تصویریں اتارتا ہے۔ جن کی آب و تاب سے خاکی سینے میں دھک دھک کرنے والے دل کی گہرائیاں منوّر ہو جاتی ہیں۔ وہ سچا حسن پرست ہے . . .

بائرن۔ وہ بائرن جس کے جام دل میں حوادث کی آتش سیّال پڑی موجیں لیتی ہے، وہ جہانِ شعر کا نپولینِ اعظم، وہ انقلابات کائنات کے تذکروں سے شعر کی دنیا میں ہلچل ڈال دینے والا، وہ سچا حریّت پسند ہے . . .

سکاٹ۔ وہ انگلستان کی شجاعتِ کہنہ کا مصوّر، شورش کی پرہیبت تصویریں دماغ کے صفحے

پر مرتسم کر دیتا ہے۔ وہ جنگ و جدل کی دنیاؤں کا سب سے بڑا نظر باز ہے۔ ۔ ۔

ملٹن۔ پارلیمان کے شیدائیوں پر طعن کرنے والا ملٹن، فردوس کی گم شدگی و بازگشتگی کا داستان گو، اس کی شوکت، اُس کا وقار مسلّم ہے۔

شیکسپیئر۔ وہ صاحب نظر، صاحب دل، مزاح میں فرد، سنجیدگی میں مثال، محفلوں کی رنگینیاں اپنی آنکھ کی دنیا میں چھپا کر لے آنے والا، بیابانوں کی وحشت اپنے دل کے عمق میں گم کر لینے والا جس کی آنکھ پر عرصۂ جنگ کے صدہا منظر عریاں ہیں۔ جس کے دل میں انسانی کرب کی دکھن کا نازک سے نازک احساس موجود ہے۔ شاہوں کی کمزوریوں سے باخبر غریبوں کی قوت سے خبردار، کائنات کا رازدان، مزاج انسان کا نبض شناس۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا کردار نگار ہے۔ ۔ ۔

گیٹے۔ وہ المانوی فلک کا رخشندہ ستارا، اپنے عہد کی حشر آفریں فضا میں فلسفے اور خیال کی شعاعوں سے دل کے کاشانوں کو روشن کرنے والا۔ وہ شیکسپیئر کا ہمعصر، وہ المانیوں میں زندگی کی لہر دوڑا دینے والا۔ وہ مغرب کا سامری، یورپ کی ظلمتوں میں وہ ایک تابندہ ستارہ ہے جس میں ہمارا عکس ملتا ہے۔

غالب۔ وہ ہندی عظمت کی راجدھانی یعنی جہان آباد کا نغز گو شاعر، محشرستان دل کے ہنگاموں کو نوکِ زبان پر رقصاں کر دینے والا۔ طلسم زار حیات کو جنتِ نظر اور زندگی کی راگ کو فردوس گوش بنا دینے والا، آہ! اس کی شیریں کہانیاں، سمجھتے بھی ہو۔ کس دور کی ہیں۔ جب ہماری ہزار سالہ عظمت کے لب پر آخری ہچکی تھی۔ وہ غالب، وہ آرزوؤں کے خون پر دل خون کر لینے والا۔

ٹیگور۔ وہ سکونِ ابدی کا رسیا۔ وحدانیت کے گیت گانے والا، جس کا ترنم دکھ بھری زندگی کے نندیالوں کو لوری دیتا ہے۔ وہ ویدانت کا پرستار ہے۔

شلر۔ وہ منتہائے خیال تک پرواز کر جانے والا، وہ جنون کو فرزانگی کہنے والا، اس کا شمار ہمیشہ وسعت دل رکھنے والوں میں ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ڈانٹے۔ حُسن کی پرستش پر مرمٹنے والا ڈانٹے ۔ ۔ وہ تصوّر کی جلو میں آسمانوں کی سیر کرنے والا ۔ وہ جس کے جذبۂ عشق نے ایک گمنام عورت کو زندۂ جاوید بنا ڈالا۔ اُس کا تصوّر بے شک قابلِ عظمت ہے۔

ہومر۔ جہاں شعر کا باوا آدم، فردوسِ خیال کا پہلا مکین، وہ محاربے کی تصویر کھینچکر دلوں میں زلزلے ڈال دیتا ہے۔

رومی ۔ ۔ ۔ تعریف سے ماورا صوفی، حافظ و خیام وہ بادۂ ناب کے پرستار، نظامی و فردوسی وہ بزم و رزم کے یکّہ تاز، سعدی وہ ایران کا شیخ ...... مادرِ ایران کو اپنے فرزندوں پر فخر ہے۔

مگر اسلام .... اسے دوستو .... اسلام۔ بیک: قوت قوم، وطن، آرٹ، فلسفہ، فطرت، حسن، شجاعت، انقلاب، حرّیت، تصوّف، سب کچھ ہے۔ اور ان سب سے بھی موزوں تر ......

اقبال اسی اسلام کا شاعر ہے ۔ ۔ اسلام ہر شاعری سے بلند ہے ....

اور اسی لئے ......

اقبال دنیا کے سب شاعروں سے بلند۔

پائندہ باد اقبال! زندہ باد اقبال!!

اے اسلام کے شاعر۔

ظفر قریشی دہلوی بی اے

حسن عقیدت

حضرت علامہ اقبال مدظلہٗ کی ایک غیر معروف رباعی

سال اور اسکے متعلقات کی تفریح جانے دیجئے۔ اور انجمن حمایت اسلام کے اس سالانہ جلسہ کا تصور کیجئے۔ جسمیں ڈاکٹر حافظ نذیر احمد۔ مولانا حالی، میرزا ارشد، مولوی عبدالمجید دہلوی آخری بار اس قومی دربار میں جمع ہوئے۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا مجمع حکیمانِ امت سے اپنے مرض کا علاج مانگ رہا تھا۔ چبوترہ پر عالم اسلام کا بہترین دل و دماغ جمع تھا۔ یہ وہ عہد تھا۔ کہ میاں سر محمد شفیع مرحوم۔ شیخ عبدالقادر، میاں فضل حسین جو بعد میں افق اسلام پر آفتاب بنکر چمکے۔ ہنوز اپنے طلوع کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جنکی سحر بیانی اور جادو نگاری کی اقصائے عالم میں دھوم ہے۔ اس وقت دو بول بولنے میں چھوئی موئی ہوئے جاتے تھے۔ وہ حسن نظامی آج جنکی شرکت ہر مجلس سیاسیات و ادب کی زینت خیال کیجاتی ہے۔ ابھی اگرنی بازار کالج کے گجروں کے چکر سے نہ نکلے تھے یہ سب حضرات اس جلسہ میں موجود تھے۔ عصر کے قریب انجمن کا ایک اجلاس میاں محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم کی صدارت میں شروع ہوا اور اس کے دوران میں پنجاب کے ایک شاعر نے اپنی نظم پڑھی۔ دستور یہ تھا۔ کہ جب کوئی شاعر کوئی پھڑکتا ہوا شعر پڑھتا تو اسکی داد انجمن کو چندہ کی شکل میں دیجاتی۔ چنانچہ اس شاعر کے ایک شعر پر حضرت حالی مغفور نے دس روپیہ کا ایک نوٹ مرحمت فرمایا۔ صحن نعرہ تحسین۔ تالیوں اور اسی قسم کے دیگر مظاہروں سے گونج اٹھا۔ اور شاعر کی پگڑی "آفتاب رسید" کی مصداق ہوگئی۔ اس فخر بیجا کے جوش میں شاعر نے پکار کر کہا کہ صاحبان اب اس سے بڑھ کر داد کی معراج کمال کیا ہوگی۔ کہ خود خدائے سخن نے میرے کلام کی داد دی ہے" شاعر بیچارے کے خیال گمان میں بھی نہ ہوگا مگر یاروں نے اسے دیگر شعراء پر فوقیت کا اظہار کرنا شروع کیا۔ اور مجلس میں اسکا اچھا خاصہ چرچا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب تو شمع مولانا حالی کے آگے آئی۔ مگر ضعف پیری کا آواز پر قبضہ ہو چکا تھا۔ اور اس کا دو قدم تک پہنچنا محال تھا۔ جو کان دن بھر سے اس آواز کی سماعت کے لئے بیقرار تھے۔ اس مایوسی سے کلبلا اٹھے۔ ہر شخص سکوت چاہتا تھا۔ اور اس کے لئے اسکی کوشش خود شور و غل کی موجب ہو جاتی تھی۔ آخر جلسہ میں کچھ برہمی سی پیدا ہوگئی۔ تو شیخ عبدالقادر صاحب نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔ کہ آپ حضرات ان کلمات قدسیہ کو نہ اگر جس تو سن سکتے ہیں۔ سن لیں۔ اور بعد میں شیخ محمد اقبال صاحب اسی نظم کو پڑھ کر سنا دینگے۔ حالی کی نظم اور اقبال سنانا پر سونے پر سہاگہ۔ لوگوں پر ان کلمات نے جادو کر دیا۔ اور بت بن کر

بیٹھ گئے۔ جب حالی صاحب نے نظم ختم کی تو شیخ صاحب گیلری سے اُتر کر سٹیج پر تشریف لائے۔ اور حالی کی نظم پڑھنے سے پیشتر یہ رباعی ارشاد فرمائی۔ سبحان اللہ چار مصرعوں میں قصیدہ بند کر دیا!! رباعی

مشہور زمانہ میں ہے نام حالی　　معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا　　نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی

(ڈرامی)

میر - غالب - اقبال

انگلستان کے ایک مشہور شاعر ڈرائڈن نے دوسرے زندہ جاوید شاعر ملٹن کی تعریف میں تین شعر لکھے ہیں۔ تخیین کا پیرایہ بالکل جدید ہے۔ اور حسن تخیل کا نہایت حسین نمونہ۔ اُن کا ترجمہ درج ذیل ہے:۔

ترجمہ:۔ "تین بعید زمانوں میں تین شاعر یونان۔ اٹلی اور انگلستان میں پیدا ہوئے۔ پہلا رفعت تخیل میں سبقت لے گیا۔ دوسرا شوکت و شان میں۔ اور آخری دونوں میں۔ قدرت اس پر اضافہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے تیسرے کو بنانے کے لئے۔ اس نے پہلے دونوں کو ایک ذات میں جمع کر دیا"

میں نے ڈرائڈن کی تقلید میں یہی طرز تخیین اختیار کیا ہے۔ اسکی نظر عرب و ایران کی شاعری پر نہ تھی۔ اس لئے تمام دنیا کے شاعروں میں سے تین شاعر منتخب کرنے میں۔ میرے لئے اتنی جسارت مشکل ہے۔ البتہ ہندوستان ہی کے تین اردو شاعروں کا انتخاب کیا ہے۔ مجھے محاسن شاعری کے حصر میں ڈرائڈن سے اختلاف ہے۔ میرے اشعار یہ ہیں:۔

قطعہ

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے　　جن کے فیض طبع نے اردو کو گنج زر دیا
ایک اثر میں بڑھ گیا۔ اک رفعت تخیل میں　　تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائنات شاعری میں بس یہی دونوں کمال　　تیسرے میں اس نے دونوں کو یکجا کر دیا

حامد حسن قادری

پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ

تشکیل جدید الہیات اسلامیہ

علامہ اقبال کے انگریزی خطبات مدراس

تشکیل جدید الہیات اسلامیہ (۱) Reconstruction of Reli- حضرت علامہ سر محمد اقبال مدظلہ العالی کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جنکو جناب ممدوح نے انجمن اسلامیہ مدراس کی دعوت پر اواخر ۱۹۲۹ء میں مرتب فرمایا تھا۔ اصل خطبات انگریزی زبان میں ہیں۔ اور ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوا کتابی شکل میں طبع ہو چکے ہیں پروفیسر سید نذیر نیازی صاحب نے ان کا ترجمہ حضرت علامہ کے ارشاد پر اردو میں کیا ہے۔ جو بعض موانع کی وجہ سے ابتک شائع نہیں ہو سکا۔ ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے۔ کہ ان کی طباعت و اشاعت کا کام اب عنقریب شروع ہو جائے گا:

ابھی چند سال ہوئے مشہور انگریز مستشرق اے۔ آر۔ نکلسن نے جریدہ "اسلامیہ" کی ایک اشاعت میں پیام مشرق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ "اقبال کے سمجھنے کے لئے اسی قدر غور و تفکر وسعت مطالعہ اور عمیق معلومات کی ضرورت ہے۔ جس کا اظہار عالم اسلامی کے اس ممتاز ترین فاضل کے ایک ایک لفظ سے ہوتا ہے"۔ جن لوگوں کو علامہ ممدوح کے کلام سے تھوڑا بہت شغف رہا ہے۔ وہ پروفیسر نکلسن کی اس رائے سے اتفاق کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا مطالعہ کرنا در اصل ایک نہایت ہی بلند اور پرواز حقیقت ذہنی تحریک کا آئینہ دیکھنا ہے۔ [illegible] کی ذات سے ہوتی ہے۔ اور جس میں ہماری

(۲) Thought in Islam.

مردہ اور بے روح قوم کی نشاۃ الثانیہ کے لامتناہی امکانات مضمر ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس ذہنی تحریک کے بنیادی افکار اب ایک مرتبہ شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ بظاہر ایک مختصر سا مجموعہ ہے۔ جس میں فلسفۂ و کلام کے چند اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک نہایت ہی بدیع اور مجتہدانہ تصنیف ہے۔ جس میں علامہ ممدوح نے عصر حاضر کی بے ربط اور منتشر زندگی میں حقائق حیات کا ایک نیا تصور پیش کیا ہے۔ اور جس کے انقلاب آفریں نتائج کا اہل نظر کو ابھی سے احساس ہے۔

الٰہیات اسلامیہ کی تاریخ میں تشکیل جدید کی نظیر شاید ہی مل سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علمائے اسلام نے مذہب کی عقلی تعبیر اور اس کے لئے حیات انسانی میں ایک مستقل اور پائیدار جگہ حاصل کرنے میں نہایت قابل قدر کوششیں سرانجام دی ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کے لئے وہی راستہ اختیار کیا۔ جس پہ اِن کے پیشرو گامزن تھے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیائے قدیم میں فلسفہ و حکمت کی باقاعدہ تشکیل سرزمین یونان میں ہوئی۔ یہ بھی معلوم ہے۔ کہ اہل یونان کی فلسفیانہ بلندی کے مقابلہ میں انکا مذہبی تخیل نہایت پست تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب سے مایوس ہوکر حکمائے یونان نے فلسفہ کے دامن میں پناہ لی اور اس وقت کی وثنی معتقدات کو بجز ان کی عقلی تعبیر کے صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح یونانی اور رومی تمدن کی جو عمارت طیار ہوئی اس میں مذہب کو کوئی مرکزی جگہ حاصل نہیں تھی۔ نہ ان نیم مذہبی اخلاقی نظامات پر جن کا تعلق گنتی کے چند افراد سے تھا۔ اور جو زیادہ تر فلسفہ و تصوف کے امتزاج کا نتیجہ تھے۔ کسی صحیح مذہبی شخصیت کا اثر تھا۔ لہذا عامۃ الناس بدستور اپنے مشرکانہ عقائد پر قائم رہے۔ آگے چل کر جب مذہب مسیحیت نے ایک تیز رو کی طرح بلاد مغرب کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا جولانگہ بنایا اور سامی تخیلات میں یونانی افکار کی

آمیزش ہوئی تو مسیحی علما نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ وہ اپنے دین کا اظہار عقائد کی شکل میں کریں گے۔ گویا تدوین عقائد کی تحریک یونانی اثرات کا نتیجہ تھی۔ اور سواحل بحر روم کے قدیم مراکز تمدن میں جہاں کبھی جستجوئے علم کا چرچا رہتا تھا۔ ایسے مسیحی عقائد پر زبردست بحثیں ہونے لگیں۔ یہ ماحول تھا جس میں علمائے اسلام دینی غور و فکر اور فلسفہ و حکمت کی دنیا سے آشنا ہوئے۔ اور بعض ایسے اسباب کی بنا پر جنکی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ان کی توجہ بھی تدوین عقائد کی طرف منعطف ہوئی[۱]۔ رفتہ رفتہ علم کلام کی بنا پڑی اور مذہب و حکمت کے دفتر میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ایسا کرنے میں اگرچہ ائمۂ اسلام نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور جودت طبع کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ عقل و عقیدہ کے باہمی تضاد اور واردات انسانی کے مختلف مظاہر کی صحیح حقیقت معلوم کرنے میں جس نے قوموں کے ذہن کو ان کی زندگی کے مختلف ادوار میں بجا طور پر پریشان رکھا ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کو بہت کم اپنا رہنما بنایا۔ ان کی توجہ زیادہ تر فلسفۂ یونان پر رہی۔ اس سے قدرتاً یا تو فلسفۂ و مذہب کی تطبیق کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اور دین کے اٹل اور دائمی حقائق اپنی تصدیق و تثبیت کے لئے ایک متحرک غیر قطعی اور تغیر پذیر نظام تصورات کے محتاج ہو گئے۔ یا فکر اور عقل کی دنیا کو مذہب کے لئے بے نتیجہ مان لینے سے واردات انسانی کے ان دو نہایت اہم اور فطری مظاہر میں ایک مستقل اور ابدی اختلاف پیدا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ مفکرین اسلام کی یہ روش تعلیمات قرآنی کے کسی طرح مطابق نہیں تھی۔ جس نے ہر شخص کو آیات الٰہیہ پر تفکر و تدبر کی دعوت دی ہے۔ الٰہیات اسلامیہ پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے علامہ ممدوح نے کسقدر صحیح فرمایا ہے:-

"... انہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فلسفۂ یونان ہی کی روشنی میں کیا۔ یہ امر کہ تعلیمات

---

[۱] یہ امر کہ مسلمانوں کے اندر مذاہب دینیات کی ترتیب و تدوین کا خیال کیونکر پیدا ہوا۔ نہایت درجہ متنازعہ فیہ ہے۔ مستشرقین نے اسکو مسیحی اثرات کا نتیجہ ٹھہرایا ہے اور علمائے اسلام کی رائے بالعموم یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری اہل ایران پر عائد ہوتی ہے۔ راقم الحروف کو دونوں نظریوں سے اختلاف ہے۔ جس کا اظہار رسالہ جامعہ اشاعت اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ہو چکا ہے۔

لیکن یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ علامہ ممدوح کانٹ کی طرح اس بات کے قائل نہیں کہ عقل محض کے لئے ذات الٰہی کا ادراک ناممکن ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف فکر اور وجدان کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں سمجھتے۔ کہ اس معاملہ میں برگسان کے ہمنوا ہیں کہ "وجدان فکر ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے" ہمیں صرف اس عقل کا قائل ہونا چاہئے۔ جو "ادب خوردۂ دل" ہو۔ اور یہ اس لئے کہ انسان ایک بے پایاں شخصیت کا مالک ہے۔ اور گو اس کے مظاہر کی انتہا نہیں اور اس کی تفسیریں بے شمار لیکن اگر کوئی شخص محض ایک "نگہ آشنا" پیدا کر لے۔ تو اس کی حقیقت کا فہم کچھ بھی مشکل نہیں۔ علامہ ممدوح کی نظر بھی ایک خاص حقیقت پر ہے۔ جس کو انہوں نے مختلف صورتوں میں ظاہر کیا ہے۔ انہوں نے جس چیز کی ترجمانی اپنی شاعری میں کی ہے۔ اسی کو تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں فلسفہ کی زبان میں ادا کی ہے۔ جاوید نامہ میں وہ خود فرماتے ہیں:-

من بطبع عصر خود گفتم دو حرف   کردہ ام بحرین را اندر دو حرف
حرف پیچا پیچ و حرف نیش دار   تا کنم عقل و دل مردان شکار
حرف تہ داری با ندازِ فرنگ   نالۂ مستانۂ از تارِ چنگ
اصل این از ذکر و اصل آں ز فکر   اے تو بادا وارث این فکر و ذکر
آب جویم از دو بحرِ اصل من است   فصلِ من فصل است و ہم وصلِ من است
تا مزاجِ عصرِ من دیگر فتاد
طبعِ من ہنگامۂ دیگر نہاد

لہذا اگر شعر و غزل کی دلکش وادیوں کو چھوڑ کر شاعر نے فلسفہ کے خشک میدان میں قدم رکھا ہے۔ تو محض اس لئے کہ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک وہ اس خاص قسم کے داخلی محسوسات کا جن پر مذہب کی بنا قائم ہے۔ اسی طرح اپنے اندر احساس کر لیں جسطرح ان کی حیات کے دوسرے اعمال ہیں وہ اس

بات کے اہل ہی نہیں ہو سکتے کہ ایک بیگانہ عالم کو اپنا جزوِ ہستی بنائیں - مزید برآں آج کل کے انسانوں کی نظر زیادہ تر محسوسات پر ہے...... لہذا وہ ان واردات کے اور بھی زیادہ ناقابل ہو گئے ہیں - بالخصوص اس لئے کہ ان کا محض ایک فریب یا ثابت ہونا بھی ممکن ہے...... آج کل ہمیں ایک ایسے منہاج علم کی ضرورت ہے جس میں عضویات پر زیادہ اصرار نہ کیا جائے بلکہ نفسیاتی لحاظ سے وہ ان طبائع کے زیادہ موافق ہو جو محسوسات کی عادی ہو چکی ہیں - چونکہ فی زمانہ اس قسم کا کوئی منہاج موجود نہیں، لہذا ہمارا یہ مطالبہ سراسر جائز ہے کہ مذہب کی بدولت ہمیں جو علم حاصل ہوتا ہے - اس کو عقلاً سمجھنے کی کوشش کریں"- لہذا تشکیل جدید کی اشاعت سے علامہ ممدوح نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے - پانچ سو برس کے جمود کے بعد عالم اسلامی نے دفعتہً ایک کروٹ لی ہے اور نوجوانان اسلام جدید علم و حکمت کے زیر اثر نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی جانب بڑھ رہے ہیں - اور "اس امر کی آزادانہ تحقیق از بسکہ ضروری ہے - کہ مغرب کا علم و حکمت کس نتیجے پر پہنچا ہے - اس کی نوعیت کیا ہے - اور کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس کے ماتحت الہیات اسلامیہ پر نظر ثانی کر سکیں یا اپنے فلسفہ کی تشکیل جدید کا بیڑا اٹھائیں"- ادھر مغرب کی دنیا بھی انقلابات سے خالی نہیں رہی جہاں انسانی فکر اور تجربات میں نہایت دور رس تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں - یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہماری زندگیاں بہت کچھ بدل گئی ہیں - آج ہمیں کس قدر فرائض درپیش ہیں - جن کا تعلق ہماری زندگی سے نہایت گہرا ہے - معلوم ہوتا ہے - ہم اپنی زندگی کے ماورا پہنچنا چاہتے ہیں - ہمیں اس چیز کی طلب ہے جو نہ تو ابھی متعین ہوئی ہے - نہ معلوم ہم مختلف قوتوں کے ایک گرداب میں الجھ گئے ہیں - اور جیسا کہ ان ادوار کا قاعدہ ہے جن میں جذبات کا ہیجان ہوتا ہے - ہماری زندگی مذہبی عناصر سے معمور ہے - اس کا اظہار رہ رہ کر ادب اور فنون لطیفہ میں ہو رہا ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے زمانہ تغیر و انقلاب کا ہے"- اہل جرمنی کی یہ تصویر جس کو ولہلم وِنڈل بانڈ نے اپنی مشہور کتاب "مقدمہ فلسفہ" ہے آج سے اٹھارہ سال پیشتر طیار کیا تھا یورپ کی موجودہ حالت سے کچھ بھی مختلف نہیں اور حضرت علامہ نے ان تمام مظاہر کا جائزہ لیتے ہوئے حیات انسانی کو جو مربوط و

متوازن تصور پیش کیا ہے وہ مشرق و مغرب کے لئے یکساں طور پر ایک احسان عظیم ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پہلا نظام الٰہیات ہے۔ جو خالصتاً قرآن پاک کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ علامہ ممدوح نے محسوسات و مدرکات انسانی کی تعبیر میں ہر جگہ قرآن مجید کے اس اشارے کا تتبع کیا ہے کہ "ہمارے ذہنی اور خارجی محسوسات در اصل ایک ہی حقیقت مطلق" ... ہیں جو اول و آخر بھی ہے اور ظاہر و باطن بھی"۔

ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ اس مختصر سے مضمون میں قارئین کی توجہ ان تمام مباحث کی جانب منعطف کرائیں جن کا تذکرہ "تشکیل جدید" میں موجود ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سردست اس کتاب کی ان سہ گانہ خصوصیات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ جن کا تعلق (۱) اسلام (۲) فلسفہ اور (۳) مذہب سے ہے

(۱) جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ خطبات زیر نظر کا موضوع الٰہیات اسلامیہ ہے لیکن اس کی تشکیل نو میں علامہ ممدوح نے اس امر کو فراموش نہیں کیا کہ بلحاظ ایک مظہر تمدن اسلام کا جامع تصور کیا ہوگا۔ اس طرح عقلی اعتبار سے انھوں نے تمدن اسلامی کا جو وسیع اور ہمہ گیر تخیل قائم کیا ہے۔ اس میں اس کے مختلف اجزا کے تاریخی نشو و نما کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ پھر استقصائے مسائل میں ان کا معیار بحث اس قدر اعلیٰ اور ارفع ہے کہ اس کی مثال نہ صرف الٰہیات اسلامیہ بلکہ اس کے کسی دوسرے ذخیرے سے بھی نہیں ملتی۔ ابتدائے کتاب کے چار خطبات کو چھوڑ کر جن کا موضوع علے الترتیب (۱) علم اور مذہبی واردات یعنی وہ علم جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور وہ علم جس کا ماخذ باطنی مشاہدات۔ وحی و الہام اور کشف ہے (۲) مذہبی واردات کا فلسفیانہ معیار (۳) ذات الٰہی کا تصور اور حقیقت عبادت (۴) انائے انسانی (ایغو) مسئلہ جبر و قدر اور حیات بعد الممات ہے آخری دو خطبوں میں علامہ ممدوح نے تمدن اسلامی کی روح اور اس کے زندگی بخش اور متحرک عنصر یعنی مسئلہ اجتہاد سے بحث کی ہے۔ ان کی رائے میں صوفیا کے صحیح المشرب سلسلوں نے مذہبی واردات کو اسلامی رنگ میں بہت کچھ ترقی دی ہے "مثال کے طور پر مسئلہ مکان و زمان ... فلسفہ اور تمدن ہر ایک کے لئے یکساں طور پر ضروری ہے ... ہے۔

"...... ان کی توجہ ہمیشہ اس مسئلے پر رہی۔ کچھ اس لئے کہ قرآن پاک کے نزدیک لیل و نہار کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی وقیع ترین آیات میں سے ہے اور کچھ اس لئے کہ ایک مشہور حدیث میں دہر کو ذات الٰہی کا مرادف ٹھہرایا گیا ہے اکابر صوفیا میں بعض کا خیال تھا کہ لفظ دہر میں بہت سے باطنی اسرار پوشیدہ ہیں۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے نزدیک دہر اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے...... اسلامی فلسفہ کی تاریخ میں سب سے پہلے اشاعرہ نے یہ کوشش کی کہ وہ عقلی اعتبار سے زمانے کی ماہیت پر نظر ڈالیں۔ ان کی رائے میں زمانہ باہمدگر منفرد آنات کا ایک تواتر ہے۔ گویا ہر دو آنات یا لمحات زمانہ کے درمیان ایک طرح کا خلائے زمانی موجود رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مضحکہ خیز تخیل کا باعث فقط یہ ہے۔ کہ اشاعرہ نے زمانے پر محض خارجی حیثیت سے نظر ڈالی۔ انہوں نے یونانی فلسفہ کی تاریخ سے مطلق فائدہ نہیں اٹھایا۔ جو خود اس غلطی کا شکار ہو گئے تھے...... عرب ایک عملی قوم تھے اور وہ یونانیوں کی طرح زمانے کو بے حقیقت نہیں ٹھہرا سکتے تھے...... بایں ہمہ ماہیت زمانہ کی تحقیق میں اشاعرہ نے آج کل کے علما کی طرح اس کے نفسیاتی تجربے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لہذا وہ اس کے داخلی مظہر کے ادراک سے قاصر رہے۔ آگے چل کر مسلمان علما نے ان دقتوں کو بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ جو زمانے کے اس تصور سے پیدا ہوتی ہیں۔ ملا جلال الدین دوانی نے الزوراء میں لکھا ہے کہ اگر ہم زمانے کو ایک مخصوص مقدار فرض کر لیں جس پر ایک متحرک جلوس کی طرح جملہ حوادث رونما ہوتے ہیں۔ اور اس مقدار کو بجائے خود ایک وحدت ٹھہرائیں تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ زمانہ فعالیت الٰہی کی ایک کیفیت ہے۔ جو اس کی تمام بعد میں آنے والی کیفیات پر حاوی ہے۔ لیکن ایک ساتھ ہی ملا نے یہ تنبیہ کر دی ہے۔ کہ اگر غور سے کام لیا جائے تو زمانے کا تواتر محض اضافی ہے.... مشہور صوفی شاعر عراقی نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے نزدیک جس طرح مدارج حیات مختلف ہیں اسی طرح زمانے کی شکلیں بھی لاتعداد ہیں.... بڑے بڑے اجسام کا زمانہ جو گردش افلاک سے پیدا ہوتا ہے۔ ماضی۔ حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے... غیر مادی اشیا کا زمانہ بھی سلسلہ وار ہے۔ لیکن بڑے بڑے اجسام کا ایک سال ان کے ایک دن کے برابر ہے.... اس طرح بتدریج

ہم۔ مان باری تعالےٰ تک پہنچتے ہیں۔ جو مرور سے قطعاً آزاد ہے۔۔۔ وہ ابدیت سے بھی بالاتر ہے۔ نہ اسکی ابتدا ہے نہ انتہا۔۔ علمائے اسلام میں امام فخرالدین رازی نے سب سے زیادہ اس مسئلے کے متعلق کاوشں اور جستجو سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کا اعتراف ہے۔ کہ وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے"

تمدن اسلامی پر بھی ہمیشہ اس خیال کا غلبہ رہا کہ زمانہ ایک حقیقت ہے اور زندگی نام ہے زمانے کے اندر ایک مسلسل حرکت کا ..

"زندگی کا یہی تصور ابن خلدون کے نظریۂ تاریخ کا سب سے اہم پہلو ہے۔ فلنٹ نے غلط نہیں کہا کہ افلاطون۔ ارسطو اور آگسٹائین کا یہ منصب نہیں کہ وہ اس کی ہمسری کا دعوےٰ کریں۔ باقیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ابن خلدون کا یہ نظریہ ہمارے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے ماتحت تاریخ کا تصور یہ ہوگا۔ کہ وہ ایک مسلسل حرکت ہے زمانے کے اندر گویا وہ فی الواقعی ایک تخلیقی حرکت ہے۔ ایسی حرکت نہیں جس کا راستہ پہلے ہی سے متعین ہو۔ ابن خلدون کو مابعد الطبیعات سے متعلق دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن زمانے کے متعلق اس نے جو نظریہ قائم کیا ہے۔ اسکو مدنظر رکھتے ہوئے ہم بجا طور پر اس کو برگسان کا پیشرو ٹھہرا سکتے ہیں۔ قرآن پاک کا یہ کہنا کہ اختلاف لیل ونہار حقیقت مطلقہ کی جس سے ہر وقت ایک نئی شان کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ ایک آیت ہے۔ اسلامی مابعد الطبیعات کا یہ رجحان کہ زمانے کو ایک خارجی وجود تسلیم کیا جائے۔ ابن مسکویہ کا ارتقائے نظریۂ حیات اور آخرالامر بیرونی کا اس نتیجے پر پہنچنا کہ فطرت ایک عمل ہے۔ تکوین کا یہ سب خیالات تھے۔ جو ابن خلدون کو ورثے میں ملے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جس تمدن کا وہ خود ایک زبردست مظہر تھا۔ اس نے اسکی حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا۔ یہ گویا قرآن مجید کی قطعی فتح تھی۔ یونانیت پر اس لئے کہ اہل یونان یا تو زمانے کی حقیقت کے قائل ہی نہیں تھے۔ جیسا کہ زینو اور افلاطون کا عقیدہ تھا یا ان کے نزدیک زمانہ ایک دائرے کی طرح گردش کرتا تھا۔ جیسا کہ ہراقلیطس اور رواقیین کا خیال ہے۔۔۔۔۔ "

افسوس ہے کہ یہ مختصر سا مضمون اس امر کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ ہم یہاں ان تمام بحثوں کا اعادہ کریں جو علامہ ممدوح نے زمان و مکان کے متعلق فرمائی ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ :۔

"خدا تعالیٰ کے لئے تخلیق کوئی مخصوص حادثہ نہیں جس کا ایک ماقبل اور ایک مابعد ہو۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کائنات ایک قائم بالذات حقیقت ہے۔ جس کا وجود اللہ تعالیٰ کی ذات سے الگ ہے زمان و مکان اور مادہ وہ ذرائع ہیں جن کے ماتحت فکر انسانی قادر مطلق کی آزادانہ تخلیقی قوت کا تصور کرتی ہے۔ وہ کوئی مستقل حقیقتیں نہیں بلکہ حیات ایزدی کے ادراک کے عقلی طریق ایکدفعہ حضرت بایزید بسطامی حلقہ ارادت میں تخلیق کا مسئلہ چھڑ گیا۔ انکا ایک مرید ... کہنے لگا کہ ایک زمانہ تھا۔ جب سوائے خدا کے کچھ نہ تھا۔ جو کچھ تھا محض اسی کی ذات تھی۔ یہ سنکر حضرت بایزید نے فرمایا کہ اب کیا ہے اب بھی وہی ہے۔ دراصل مادی عالم کوئی ایسا ہیولےٰ نہیں۔ جو شروع سے خدا کی ذات کے ساتھ ساتھ موجود ہو۔ اس کی ماہیت ایک عمل کی سی ہے۔ جس کو فکر بانٹکر منفرد اشیا کی ایک کثرت میں تقسیم کر دیتی ہے"

(۲) فلسفیانہ لحاظ سے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ علامہ ممدوح کے افکار پر "سولاسطی فلسفہ" کا مطلق اثر نہیں۔ الہیات کی راہ میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اس کا فریضہ عدم و وجود۔ ذات ماورائے ذات اور مادیت و روحانیت کو یکہی حقیقت میں شمار کرنا ہے۔ علامہ ممدوح نے اس نہایت ہی نازک مسئلے کے متعلق جو رد یہ اختیار فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم ان اشتراکات یا "ہم آہنگیوں" کی تلاش کریں جو ممکن ہے مذہب اور سائنس کے درمیان پہلے ہی سے موجود ہوں۔ چنانچہ اس امر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ قدیم طبیعات اب خود اپنی اساس کی تنقید میں مصروف ہے۔ اور مادیت کا وہ تصور جس کو کبھی اس کے لئے ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔ نہایت تیزی کے ساتھ کافور ہو رہا ہے۔ انہوں نے مادے کی ماہیت پر جو دقیق بحث کی ہے۔ وہ خالصاً فلسفیانہ ہے۔ ہم اس کے جزوی اقتباسات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں گے :۔

"ارتقائی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارے محسوسات و مدرکات کے تین بڑے مراتب ہیں جنہیں سے ہر ایک کو ہم ایک عالم قرار دے سکتے ہیں۔ یعنی مادیات وحیات اور شعور کی دنیا جو علی الترتیب طبیعات وحیاتیات اور نفسیات کا موضوع بحث ہیں۔ طبیعات ایک اختیاری اور تجربی علم ہے۔ جس کا تعلق حقائق خارجہ یعنی علم بالحواس سے ہے۔ مظاہر حواس کے علاوہ علمائے طبیعات کے پاس نظریوں کی تصدیق وتائید کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ وہ اس بات کے مجاز ہیں کہ غیر مدرک اشیا مثلاً جواہر کا وجود تسلیم کرلیں۔ لیکن انکا ایسا کرنا محض اس لئے ہے کہ بغیر اس کے وہ اپنے تجربات حسی کی تشریح و تعبیر نہیں کر سکتے۔ جب ہم طبعیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اپنے ذہن کو حرکت میں لانا پڑتا ہے۔ یہ حرکت کیا ہے؟ اعمال ذہنی جو ہمارے قلب کی جمالی کیفیات اور واردات روحانی کی طرح اسی کل کے ایک جزو ہیں جس کو ہم اپنے مدرکات و محسوسات سے تعبیر کرتے ہیں۔ بایں ہمہ ان کو طبیعات کی حدود سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ طبعیات کا مطالعہ صرف مادی اشیا تک محدود ہے۔ اب فرض کیجیے ہم کسی شخص سے سوال کریں کہ اس مادی عالم میں تم کو کن چیزوں کا ادراک ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ انہی اشیا کا نام لے گا جو اس کے گرد و پیش میں موجود ہیں۔ لیکن اگر اس سے مکرر یہ سوال کیا جائے کہ تم اس چیز کا نام بتاؤ جسکا فی الواقعہ تم ان اشیا ہی سے ادراک حاصل کرتے ہو۔ تو اسکو کہنا پڑے گا کہ ان کے خواص کا ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب دینے میں ہم اپنے حواس کی شہادت ہی کی تعبیر کرتے ہیں اور اس تعبیر کا انحصار اس پر ہے کہ اشیا اور ان کے خواص کے درمیان ایک امتیاز قائم کیا جائے۔ بعض لوگوں نے مادے کے متعلق یہی نظریہ اختیار کیا ہے۔ یہ انگلستان کا مشہور فلسفی برکلے تھا جس نے سب سے پہلے اس نظریئے کی تردید کی کہ مادہ ہمارے حواس کی نامعلوم علت ہے۔ خود ہمارے زمانے میں پروفیسر وائٹ ہیڈ نے ثابت کر دیا ہے کہ مادیت کا قدیم نظریہ سراسر ناقابل اعتبار ہے۔ اس نظریے کی رو سے یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ اشیا کے خواص مدرک کی ذہنی کیفیات ہیں۔ فطرت میں شامل نہیں۔ ہمارے ادراکات کی ہیں ۹ محض خریب نظر

جن کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ فی الواقعہ فطرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ نظریہ فطرت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک طرف ذہنی کیفیات ہیں اور دوسری جانب ناقابل تصدیق غیر مدرک وجود جو ان کیفیات کی علت ہیں۔ اگر طبعیات کو حقائق کا صحیح اور منظم علم حاصل ہے جن کا ادراک ہمیں حواس کے ذریعے ہوتا ہے۔ تو ہمیں مادے کے قدیم نظریئے سے فوراً دستبردار ہو جانا چاہئیے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ کے نزدیک اس نظریئے کے معنی یہ ہیں کہ فطرت کا ایک حصہ خواب ہے اور دوسرا محض قیاس لیکن مادے کے تصور پر سب سے زیادہ کاری ضرب آئین اسٹائین کے ہاتھوں لگی ہے مسٹر رسل کہتے ہیں کہ نظریۂ اضافیت نے مکان و زمان کو باہم مدغم کر کے جوہر کے قدیم تصور پر شدید حملہ کیا ہے۔ کسی مادی شے کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اپنی بدلتی ہوئی حالتوں کے باوجود زمانے میں استقرار رکھتی ہے صحیح نہیں۔ حقیقت میں یہ باہم دگر مربوط حوادث کا ایک نظام ہے۔ جمود کا قدیم تصور اب ترک کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام فرائض بھی جن کی بنا پر کسی مادئین کا یہ خیال تھا کہ مادہ سریع السیر افکار کی نسبت کہیں زیادہ حقیقی اور مستقل شے ہے ...“

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مادے کا رائج الوقت نظریہ ناقابل اعتبار رہے۔ تو پھر فطرت یعنی نیچر کی ماہیت کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کوئی ساکن وجود نہیں جو ایک غیر متحرک خلا میں قائم ہے بلکہ یہ حوادث کی ایک ترکیب ہے جس میں ایک مسلسل اور تخلیقی حرکت کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ جب ہم اس تخلیقی حرکت کا مشاہدہ فکر کی عینک سے کرتے ہیں۔ تو اس کا تسلسل فنا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی بجائے چند منفرد اور غیر متحرک اشیا کا ادراک ہوتا ہے۔ جن کے باہمی روابط سے مکان و زمان کے تصورات مترتب ہوتے ہیں۔ طبیعات کا یہ نظریہ کہ فطرت محض مادہ ہے۔ نیوٹن کے اس نظریئے سے وابستہ ہے کہ مکان ایک خلائے مطلق ہے۔ جس میں تمام اشیاء واقع ہیں۔ ریاضیات کی تنقید سے اب یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ خالص مادیت کا مفروضہ یعنی یہ خیال کہ مادہ ایک مستقل بالذات شے ہے جو مکان مطلق میں واقع ہے۔ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں “

سطور بالا سے زمان و مکان اور دوسرے مسائل کے متعلق جن نازک بحثوں کا آغاز ہوتا ہے ان کی تفصیل کی یہاں مطلق گنجائش نہیں۔ ہمارا مقصد "تشکیل جدید" کی فلسفیانہ اہمیت کو ظاہر کرنا ہے۔ جس کے لئے یہ اجمالی اشارات کافی ہوں گے۔ البتہ ہم یہ ضرور عرض کرتے ہیں۔ کہ علامہ ممدوح نے جن حقائق کی طرف توجہ دلائی ہے ان کو بالعموم عقل و فکر کی حدود سے ماورا سمجھا جاتا ہے۔ انسان ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کا اظہار وارداتی شکل میں تو ممکن ہے۔ لیکن دیدۂ حکمت سے ان کا مشاہدہ شاید ہی ہو سکے۔ یہ خلش اگرچہ ایک حد تک فطری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اسی سے کونسا فلسفہ آزاد ہے۔ ثنویت سے بچنے کے لئے جو بھی نقطۂ نظر اختیار کیجئے گا۔ اس میں یہ اور اس قسم کے ہزاروں تذبذب باقی رہیں گے۔

(۲) اب ہمیں مذہب کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ علامہ ممدوح نے اس کی تحقیق میں نفسیاتی منہاج پر زور دیا ہے۔ حامیان معنویات کو غالباً شروع ہی سے اس پر اعتراض ہوگا لیکن ہمیں حضرت علامہ کے خیالات سن لینا چاہئے۔ انہوں نے ابتدا ہی میں اس امر کی صراحت کر دی ہے۔ کہ "جب فلسفہ مذہب پر تنقید کی نگاہیں ڈالتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا۔ کہ مذہب کو اس کے مقدمات میں کوئی ادنے جگہ حاصل ہے مذہب فلسفہ کا کوئی شعبہ نہیں اس لئے کہ یہ محض فکر ہے۔ نہ عمل نہ احساس بلکہ انسان کی ذات کلی کا مظہر" پھر "یہ خیال بھی سراسر غلط ہے کہ فکر اور وجدان بالطبع ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دونوں کا تعلق ایک ہی سرچشمے سے ہے۔ اور بغیر ایک دوسرے کے ان کا وجود نامکمل رہتا ہے۔ ایک منزل بہ منزل حقیقت مطلقہ کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ دوسرا اس کے وجود کلی پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ وجدان ایک ہی وقت میں تمام حقیقت سے لطف اندوز ہونے کا طلبگار ہے۔ فکر اس راستے کو آہستہ آہستہ اور رک رک کر طے کرتی ہے۔ تاکہ وہ اس کے مختلف مراحل کو محض ان کے مشاہدے کے لئے مخصوص و منفرد کرتی جائے۔ وجدان کے پیش نظر حقیقت مطلقہ کا ابدی اور فکر کے سامنے اس کا زمانی پہلو ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے تقویت و تازگی کا موجب بنتے ہیں۔ اور دونوں کو حیات میں جو منصب حاصل ہے۔ اس کے اعتبار سے ایک ہی

حقیقت کی بقا کے آرزومند ہیں"۔ اگر سائنس اور فلسفہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی توجہ محسوسات پر ہے تو مذہب کو اس سے کوئی تعرض نہیں۔ اس لئے کہ مذہب نے تو سائنس سے بھی بہت پہلے محسوسات پر زور دیا ہے۔ عجب ہم اس منصب کا خیال کرتے ہیں۔ جو مذہب کو ہماری زندگی میں حاصل ہے۔ تو ہم خود بخود اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ بہ نسبت مسلمات علم کے ہمارے لئے اس امر کی کہیں زیادہ ضرورت ہے کہ ہم مذہب کے اصول و عقائد کے لئے کسی عقلی اساس کی جستجو کریں۔ علم مابعد الطبیعیات کو نظر انداز کر سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ابتک اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ لیکن مذہب کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ محسوسات انسانی کے تضاد کو رفع نہ کرے۔ یا جس ماحول میں انسان پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی تصدیق و تثبیت سے انکار کر دے۔ مذہب کا ہر عہد عقلیت کا عہد تھا"۔ مذہب کو بھی محسوسات و مدرکات کی اسی طرح ضرورت ہے۔ جس طرح سائنس کو ہے کہیں اس کا مقصد ان مقدمات کی تعبیر کرنا نہیں ہے۔ جو علوم فطرت کا موضوع ہیں۔ مذہب نہ کیمیا ہے نہ طبعیات جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ حقائق فطرت کی ترجمانی علت و معلول کی زبان میں کرے"۔ اگر ان دونوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے تو اس لئے نہیں کہ "ایک کی بنا محسوسات پر ہے۔ اور دوسرا محسوسات سے آزاد۔ دونوں کی ابتدا محسوسات سے ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ایک ہی قسم کی واردات کی الگ الگ ترجمانی کرتے ہیں۔ تو انہیں تضاد و تصادم رونما ہو جاتا ہے۔ مذہب کے پیش نظر واردات انسانی کی ایک مخصوص دنیا ہے۔ اور اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ اس کی صحیح اہمیت کا پورا پورا علم حاصل کرے"۔

لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری مذہبی واردات بھی محسوسات و مدرکات کی طرح کسی علم کا سرچشمہ بن سکتی ہیں؟ علامہ ممدوح نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ ان کے نزدیک "مذہب کے اندر ادراک کا ایک عنصر ہمیشہ شامل رہتا ہے"۔ اگر اس علم کی نوعیت علم بالحواس سے مختلف ہے تو اس کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ضروری نہیں کہ جو علم غیر عقلی ذرائع سے حاصل ہو وہ بہ نسبت اس علم کے جس میں عضویاتی حرکات کو

داخل ہوتا ہے ناقص ہو۔ اس کے لئے علامہ ممدوح نے واردات مذہبی کے نفسیاتی تجزیئے کے بعد جو شواہد پیش کئے ہیں۔ ان کو افسوس ہے۔ کہ بخوفِ طوالت ہم یہاں نقل نہیں کر سکتے۔ لیکن اہل نفسیات کی یہ بدگمانی کہ چونکہ مذہبی واردات کی بنا ادراک حسی سے نہیں ہوتی۔ لہذا انکو نظرانداز کر دینا چاہئے۔ صحیح نہیں۔ ایسے ہی محض ان کیفیات کی بنا پر جو باطنی واردات کو بظاہر متعین کرتی نظر آتی ہیں انکی روحانی قدر و قیمت سے انکار کر دینا بھی غلطی ہے۔ "اگر جدید نفسیات کا یہ مسلہ صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ جسم اور ذہن باہم متعلق ہیں تب بھی باطنی واردات کو اظہار حقیقت کا ذریعہ نہ سمجھنا منطقی اعتبار سے غلط ہے۔ اصول نفسیات کے ماتحت دیکھا جائے۔ تو سبھی کیفیات عضوی حالتوں کی پابند ہیں۔ خواہ ان کے شمول کا تعلق مذہب سے ہو یا مذہب سے الگ کسی دوسری چیز سے۔ جن لوگوں کا مزاج عالمانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ان کا ذہن بھی تو اعضا کا اسی طرح محتاج رہتا ہے۔ جیسے اہل مذہب کا۔ مثال کے طور پر صرف ان لوگوں کے تخلیقی کارناموں کو لیجئے۔ جنکا شمار ہم نوابغ میں کرتے ہیں۔ اور جن پر غور کرتے ہوئے ہم اس بات کا مطلق خیال نہیں کرتے کہ ایک نفسیات ان کی عضوی کیفیات کے متعلق کیا کہیں گے۔ ممکن ہے ایک خاص قسم کی قبولیت کے لئے ایک خاص قسم کا مزاج ناگزیر ہو۔ لیکن اس کی حقیقت و ماہیت کو محض ان کیفیات تک محدود سمجھنا غلطی ہے جو بظاہر اسے متعین کرتی نظر آتی ہیں۔ حقیقت میں ہماری ذہنی کیفیات کی عضوی تحلیل کا اس معیار سے کوئی تعلق نہیں جس کے ماتحت ہم کسی کیفیت کو ادنےٰ یا اعلےٰ قرار دیتے ہیں"۔

اس امر کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مذہب داخلی کیفیات کا کوئی چیستاں نہیں جیسا کہ بالعموم معترضین خیال کرتے ہیں۔ "مذہبی واردات کی مثال زیادہ تر غیر واضح احساس کی سی ہے۔ ان میں عقل و استدلال کا شائبہ تک نہیں ہوتا لیکن جسطرح انسان کے دوسرے احساسات میں ادراک کا ایک عنصر موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح باطنی واردات بھی ادراک سے معرا نہیں۔ ہمارے نزدیک یہی عنصر ادراک کا نتیجہ ہے جسکی بدولت باطنی واردات فکر کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ دراصل احساسات کا اقتضا ہی یہ ہے کہ انکا اظہار

فکر کی شکل میں ہو۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ فکر اور احساس دونوں کا تعلق ہمارے داخلی مشاہدات سے ہے۔ اول الذکر انکا زمانی پہلو ہے۔ اور دوسرا غیر زمانی۔۔۔ احساس گویا کسی بیرونی شے کی کشش کا نام ہے۔ جسطرح فکر کسی خارجی شے کی خبر کا۔ جب ہمارے ذہن پر احساس کی کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تو اس کے ایک جزو لازم کے طور پر اس شے کا خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے جس سے اسکو سکون ہوگا۔ یہ کہ احساس کا کوئی رخ نہ ہو۔ ایسا ہی ہے جیسے یہ کہ فعالیت کی کوئی سمت نہ ہو اور یاد رکھنا چاہئے کہ سمت کا، تا اسے ہمیشہ کسی شے کی جانب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ گو مذہب کی ابتدا احساس سے ہوتی ہے۔ لیکن وہ محض احساس پر جیسا کہ خود احساس ہی کا تقاضا ہے۔ قناعت نہیں کر سکتا۔ برعکس اس کے اس سے ہمیشہ مابعد الطبیعی جستجو کا اظہار ہوتا ہے"۔

لیکن جیسا کہ عرض کر دیا گیا تھا۔ فلسفہ اور مذہب باعتبار اپنی نوعیت کے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں"۔ فلسفہ کا کام یہ ہے کہ وہ عقل کی عینک سے اشیا کا مشاہدہ کرے۔ اس کا مقصود صرف اسقدر ہے کہ اسے کوئی ایسا تصور مل جائے جس کے ماتحت ہمارے جملہ محسوسات و مدرکات کسی ایک نظام میں مرتسم ہو جائیں۔ گویا فلسفہ دور ہی سے حقیقت مطلقہ کا مشاہدہ کرتا ہے۔ برعکس اس کے مذہب کی تمنا یہ ہے کہ وہ اس سے ربط و ائتلاف پیدا کرے۔ ایک محض نظریہ ہے۔ دوسرا حقیقی واردات۔ قرب اور اتصال۔ اس کے لئے فکر کو اپنے آپ سے بلند ہونے کی ضرورت ہے۔ اور اس کا یہ مدعا صرف اس اسلوب ذہنی ہی کی شکل میں پورا ہو سکتا ہے۔ جس کو مذہب نے دعا سے تعبیر کیا ہے اور جو پیغمبر اسلام صلعم کے لب مبارک پر تادم آخر موجود تھی"[1]

ان نہایت ہی اہم اور دقیق مباحث کے علاوہ جن کا مجمل سا خاکہ ہم نے سطور بالا میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے "تشکیل جدید" میں فلسفہ اور سائنس کے سیکڑوں مسائل زیر نظر آ گئے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اسی غیر معمولی عمق۔ کاوش تحقیق اور رفعت تخیل کے ساتھ جس کے لئے علامہ ممدوح کی ذات اب کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ جسقدر کتاب کے مباحث دقیق ہیں اسی قدر انداز بیان سلیس اور دلآویز ہے۔

[1] یہ اور ماسبق اقتباسات تشکیل جدید کے مختلف اجزا سے لئے گئے ہیں ؛ (ضیا قریشی)

ایک جرمن ناقد کی رائے ہے کہ "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" عصر نو کا سب سے زیادہ تعجب خیز مظہر ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فاضل ناقد کی اس رائے میں ذرا سا بھی مبالغہ نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی حلقوں میں تشکیل جدید کے مباحث کو نہایت ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔ انکی علمی صلاحیتیں اہل مشرق سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ فرض مسلمانوں کا ہے کہ وہ اس کے مطالب پر غور کریں اور حضرت علامہ کے ان ارشادات سے مستفیض ہونے کی کوشش کریں۔ جو ان کے تمدنی ارتقا میں بجا طور پر انکی رہبری کا حق ادا کر سکتے ہیں۔

این چنیں دیدۂ رہ بیں بہ شب تار کجاست؟

(نیازی)

اقبال اور فلسفۂ مغرب

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی - بی اے)

نوٹ - یہ مضمون میرے عزیز اور قابل دوست مسٹر ممتاز حسن صاحب احسن ایم اے اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب نے "یوم اقبال" کی تقریب پر ۱۰ مارچ کو وائی ایم سی اے ہال میں شیدائیان اقبال کے ایک ممتاز مجمع کے سامنے پڑھ کر سنایا تھا۔

میری خواہش تھی کہ میں اس کا ترجمہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ - اردو داں اصحاب کے سامنے پیش کروں - اور اسی لئے یہ مضمون میں نے صاحب موصوف سے مستعار لیا تھا۔ لیکن افسوس کہ بعض ناگزیر مصروفیتوں کی وجہ سے میں اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا - بہرحال عجلت میں جو کچھ ہو سکا ہے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے - میں نے صاحب مضمون کے خیالات میں کسی قسم کا تصرف یا تبدل نہیں کیا ہے ہاں بعض بعض مقامات پر چند تشریحی جملے اپنی طرف سے بڑھا دئے ہیں۔ (مترجم)

فلسفۂ مغرب کا صحیح معنوں میں آغاز سولھویں صدی سے ہوا ہے - جبکہ یورپ کو پاپائیت کی ذہنی غلامی سے نجات ملی اور اس کی وجہ سے اکتشافات حکمیہ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھل گیا - اور یورپ نے مادی اور سیاسی رنگ میں جو تفوق حاصل کیا - اس کی وجہ سے فلسفہ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

بعض ارباب فکر کا ابتک یہ خیال ہے کہ متکلمین اور علی الخصوص ٹامس اکوئناس کا فلسفہ - انسانی غور و فکر کا نتیجے پرواز ہے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کا فلسفہ یونانی اور اسلامی متکلمین کی صدائے بازگشت سے زیادہ نہیں ہے - اور اگر کسی مسئلہ میں انہوں نے اجتہادِ فکر کا نمونہ پیش کیا ہے - تو اس نے نہایت مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی ہے - مثلاً ایک متکلم نے یہ بحث اٹھائی ہے - کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں؟ اللہ ہی

پتہ چلتا ہے کہ ان کو صحیح جواب کیا دیا گیا۔ تاہم اس قدر یقینی ہے کہ جب ڈیکارٹ کے فلسفہ کا آفتاب طلوع ہوا۔ تو ان سب بزرگوں کے چراغ ماند ہو کر رہ گئے۔

ڈیکارٹ کے بعد یورپ میں پے در پے بہت سے نامور فلاسفر منصۂ شہود پر آئے۔ جن میں کینٹ کا مرتبہ سب سے اونچا ہے۔ اس کے بعد نیٹشا کا دور فلسفہ شروع ہوا۔ جس نے فلسفہ پر الہام کا رنگ چڑھا دیا۔ یہ شخص فلاسفر یا شاعر ہی کائنات کے حسن و قبح کا نقاد ہی نہ تھا بلکہ اس نے اپنی قابلیت کی بدولت حسن و قبح کا نیا معیار پیش کیا ہے۔

فلسفہ ہمیشہ سے سائنس کا مرہونِ احسان رہا ہے۔ فلاسفۂ یونان کے بیشتر خیالات۔ کائنات کے اس علم پر مبنی ہیں۔ جو استقرا اور مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور چونکہ فی زمانہ سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ اسی لئے ان لوگوں کے فلسفہ کا بہت سا حصہ اب بیکار ہو گیا ہے۔

فلسفہ کی تاریخ سے یہ بات عیاں ہے کہ فلسفہ اور سائنس میں موافقت اور مطابقت کی رفتار روز افزوں رہی ہے۔ اور نیوٹن کی تحقیقات علمیہ نے تو فلسفہ اور سائنس کو ایک دوسرے سے بہت ہی زیادہ قریب کر دیا۔ اور اس تعلق کو نظریۂ ارتقا نے اور بھی استوار کر دیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کو جن کا نام نامی۔ اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا ہے۔ یورپ کے ارباب فکر کی موشگافیوں کے مطالعہ ہی کا موقع نہیں ملا۔ بلکہ انہوں نے بفراغت تمام ان کے باہمی اختلافات کا تماشہ بھی دیکھا ہے۔ اور تجربہ کی بنا پر ان تمام فلسفیانہ نظریوں کی اصلی قدر و قیمت معلوم کی ہے۔ اور میں بالیقین کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کیلئے ان افکار متضادہ کو تجربہ و مشاہدہ کی کسوٹی پر پرکھ لینا بہت اہمیت کا باعث ہے۔ کیونکہ وہ نیٹشا کی طرح مابعد الطبیعات سے اس قدر وابستگی نہیں رکھتے۔ جس قدر اخلاقیات سے۔ بلاشبہ انکا فلسفہ مابعد الطبیعات کے مسائل سے جدا نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے زیادہ تر زور عمل پر دیا ہے۔ یعنی اگرچہ محض علم بھی اچھی چیز ہے مگر عمل کا مرتبہ ان کی نظر میں محض علم سے بہت زیادہ ہے۔

سب سے پہلے ہم ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ کا اجمالی خاکہ جو انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کی فرمائش پر لکھا تھا۔ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

"ہر موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ حیات تمام و کمال انفرادی ہے۔ حیاتِ کلی کا خارج میں کہیں وجود نہیں ہے خدا خود بھی ایک فرد ہی ہے۔ وہ فرد یکتا ہے۔ کائنات۔ افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس مجموعہ میں جو نظم و نسق اور توافق و تطابق پایا جاتا ہے، وہ بذاتہٖ کامل نہیں ہے۔ بہرکیف جو کچھ بھی ہے وہ افراد کی جبلی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارا قدم بالتدریج بدنظمی سے نظم و نسق کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اس مجموعہ کے افراد کی تعداد بھی معین نہیں ہے۔ بلکہ روزمرہ اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور نو زائیدہ افراد اس عظیم الشان مقصد کی تکمیل میں ہمارے معاون ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی کائنات۔ فعلِ مختتم نہیں ہے۔ بلکہ ہنوز مراتبِ تکمیل طے کر رہی ہے۔ چونکہ کائنات ابھی مرتبہ کمال کو نہیں پہونچی ہے۔ اور تکمیل کے مراتب میں سے گزر رہی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق ابھی کوئی بات حتمی اور اذعانی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ جو کچھ کہا جا سکتا ہے یا ابھی تک کہا گیا ہے اس میں کامل صداقت نہیں پائی جا سکتی۔ فعل تخلیق ہنوز جاری ہے۔ اور جس حد تک انسان اس کائنات کے کسی غیر مربوط حصہ میں ربط و ترتیب پیدا کر سکتا ہے۔ اس حد تک اس کو بھی فعل تخلیق میں معاون قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود قرآن مجید میں خدا تعالے کے علاوہ دوسرے خالقوں کے امکان کی طرف اشارہ موجود ہے" فتبارک اللہ احسن الخالقین"

ظاہر ہے کہ انسان اور کائنات کا یہ نظریہ۔ ہیگل کے انگریزی متبعین اور ارباب وحدت الوجود کے خیالات کے سراسر خلاف ہے۔ جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ حیات کلی میں جذب ہو جائے۔ جس طرح قطرہ سمندر میں مل جاتا ہے۔ اور اپنی انفرادی ہستی کھو بیٹھتا ہے؛

انسان کا اخلاقی اور مذہبی نصب العین یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے۔ یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ اس کے برعکس یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش از بیش انفرادیت اور یکتائی پیدا کرے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے۔ "تخلقو باخلاق اللہ" یعنی اپنے

اندر خدا کی صفات پیدا کرو۔ پس انسان جسقدر اور جس حد تک اُس فردِ یکتا (خدا) سے مشابہ ہوگا۔ اُسی قدر خود بھی یکتا ہو جائے گی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیات کیا ہے؟ حیات فرد کا دوسرا نام ہے۔ اور فرد کی اعلیٰ ترین صورت، جو اس وقت تک متحقق ہو سکی ہے۔ خودی یا ایغو ہے۔ جس کی بنا پر فرد ایک مستقل بالذات مرکز بنجاتا ہے جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے انسان ایک مستقل بالذات مرکز ہے۔ لیکن وہ ابھی تک "فردِ کامل" نہیں ہے۔ فرد جسقدر خدا سے دور ہوگا۔ اسی قدر اس کی انفرادیت ناقص اور کمتر درجہ کی ہوگی۔ اور جسقدر وہ خدا سے قریب ہوگا اسی قدر کامل انسان ہوگا۔ قربِ الٰہی کا یہ مطلب نہیں کہ انسان انجام کار خدا کی ذات میں واصل یا فنا ہو جائے بلکہ اس کے برعکس یہ کہ کامل انسان وہ ہے جو خدا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے

در دشتِ جنونِ من جبرئیل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

دراصل حیات ایک ترقی کرنے والی اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے والی حرکت کا نام ہے۔ جو مشکلات اور رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ وہ ان پر غلبہ پا کر انہیں اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اور آگے بڑھتی ہے۔ حیات کا جوہر یہ ہے کہ مسلسل اور پیہم نئی نئی آرزوئیں اور نئے نئے نصب العین پیدا کرتی رہتی ہے اور اپنی ترقی اور حفاظت کے لئے اُس نے بعض آلات اور وسائل پیدا کر لئے ہیں مثلاً حواس خمسہ اور قوت ادراک وغیرہ جنکی مدد سے وہ مشکلات پر غالب آ کر انہیں اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ مادہ یا فطرت حیات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ فطرت کوئی مذموم شے نہیں ہے بلکہ حیات کے حق میں محمود ہے۔ کیونکہ اسی کی بدولت۔ حیات کو یہ موقع ملتا ہے۔ کہ وہ اپنی پوشیدہ قوتوں اور استعدادوں کو بروئے کار لائے۔ اور مشکلات پر غالب آئے۔

جب خودی۔ تمام مشکلات پر غالب آجاتی ہے تو مرتبۂ جبر سے مرتبۂ اختیار پر فائز ہو جاتی ہے۔ خودی ایک حد تک مجبور ہے اور ایک حد تک مختار۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ "اَلاِیْمَانُ بَیْنَ الْجَبْرِ وَالاِخْتِیَارِ" اور جب

خودی۔ ذات مطلق کا تقرب حاصل کرتی ہے۔ تو اختیار کے اعلےٰ مرتبہ کو حاصل کر لیتی ہے مختصر یہ کہ حیات مرتبہ اختیار تک پہونچنے کی مسلسل کوشش کا نام ہے ؛

جامہ انسانیت میں آکر مرکز حیات کا نام ایغو یا شخص ہو جاتا ہے - اور شخصیت عبارت ہے جد و جہد کی مسلسل حالت سے شخصیت کا تسلسل ایسی حالت کے قیام پر منحصر ہے - اگر یہ حالت قائم نہ رہے تو لامحالہ تعطل یا ضعف کی حالت طاری ہو جائے گی - چونکہ شخصیت انسان کا سب سے بڑا کمال ہے - اس لئے اس کا فرض ہے کہ وہ اس جوہر بے بہا کو مسلسل سرگرم عمل رکھے - اور معطل نہ ہونے دے - کیونکہ جد و جہد ہی زندگی ہے - اور جو شے شخصیت کو پیہم جد و جہد کی طرف راغب کرتی ہے - وہ دراصل ہمیں بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے گویا شخصیت کا تصور اشیائے کائنات کے حسن و قبح کا معیار ہے - اسکی بنا پر خیر و شر کا مسئلہ بخوبی حل ہو سکتا ہے جو شے شخصیت کو توانائی عطا کرتی ہے - اچھی ہے اور جو اسے کمزور کرے - وہ بُری ہے - آرٹ[1] مذہب اور اخلاق سب کو اسی معیار پر پرکھنا چاہئے ؛

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے رسالہ "نیو ایرا" میں لکھا ہے کہ "حیات تمام انسانی اعمال کا منتہائے مقصود ہے - انسانی اعمال کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کی زندگی شاندار - موثر اور افزوں ہو جائے - اس لئے ضروری ہے - کہ جملہ انسانی آرٹ کو اس مقصد عظمیٰ کے ماتحت رکھا جائے - اور جو شئے زندگی کو جسقدر فراوانی عطا کرے اُسی قدر اعلےٰ اور اشرف خیال کی جائے بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر خفتہ قوت ارادی کو بیدار کر دے تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کیساتھ مقابلہ کر سکیں - وہ تمام علوم و فنون جو خواب آور ہیں - جو ہمیں اُن حقائق گرد و پیش سے غافل کر دیں جن کے حصول پر زندگی کا انحصار ہے - وہ دراصل بربادی اور موت کا پیغام ہیں - آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر بیداری کی روح پھونکے - نہ کہ وہ جو ہم پر حالت سکر طاری کر دے - جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آرٹ کا منتہائے مقصود خود آرٹ ہے وہ نادانستہ طور پر ہمیں گمراہ کرنے اور ہماری زندگی اور توانائی کو فنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں - ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار رہیں" انتہی بلفظہٖ قدحے خرد فروز سے کہ فرنگ داد مارا ؛ ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر ندارد

(مترجم)

میں نے افلاطون کے فلسفہ پر جو کچھ تنقید کی ہے۔ اس سے میرا مطلب اُن فلسفیانہ مذاہب کی تردید ہے۔ جو بجائے زندگی کے موت (فنا) کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ وہ مذاہب ہیں جو انسان کو بزدلی سکھاتے ہیں۔ جن کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یعنی "مادہ" کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہئے۔ حالانکہ جوہر انسانیت یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور ان پر غالب آئے۔ بلکہ انہیں اپنا خادم بنالے۔

جس طرح خودی کو مرتبۂ اختیار پر فائز کرنے کے لئے ہمیں "مادہ" پر غالب آنا ضروری ہے۔ اسی طرح اسے غیر فانی بنانے کے لئے "زمان" پر غالب آنا لازمی ہے۔ برگساں کہتا ہے کہ "زمان" خلا متناہی نہیں ہے۔ (باعتبار مفہوم مکانی) جس میں ہو کر ہمیں گزرنا ہے۔ خواہ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ زمانہ کا یہ مفہوم صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ زمان محض میں طوالت کا مفہوم داخل نہیں ہے۔

بقائے شخص ایک آرزومنی ہے۔ اسے وہی شخص حاصل کرسکتا ہے۔ جو اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرے اور اس کا حصول ہماری موجودہ زندگی میں فکر اور عمل کے اُن طریقوں پر منحصر ہے۔ جو ہماری خودی کی حالت جدوجہد کو برقرار رکھ سکیں۔ بدھ مذہب اور ایرانی تصوف اور فلسفہ اخلاق کی ہمچو اتریں قبیل دوسری صورتیں۔ اس مقصد کے لئے مفید نہیں ہیں۔ تاہم ان میں فائدہ کا ایک پہلو ضرور موجود ہے وہ یہ کہ مسلسل جدوجہد کے بعد کچھ عرصہ کے لئے ہمیں آرام کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ گویا فکر اور عمل کی یہ صورتیں۔ زندگی کے دنوں کے اعتبار سے راتیں قرار دیجا سکتی ہیں۔

بہرکیف اگر ہماری فاعلیت کا منشا یہ ہو کہ خودی کی حالت جدوجہد برقرار رہے تو گمان غالب یہ ہے کہ موت کا صدمہ ہماری خودی پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کہ موت موجودہ زندگی اور آئندہ جدوجہد کے درمیان آرام اور سکون کا ایک وقفہ ہو۔ جسے قرآن مجید "عالم برزخ" سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہ حالت یوم حشر تک قائم رہے گی۔

واضح ہو کہ موت کا صدمہ صرف وہی "خودیاں" برداشت کر سکیں گی۔ جنہوں نے اس زندگی میں پختگی حاصل کر لی ہو گی۔ اگرچہ حیات اپنے ارتقائی منازل میں مادہ اور تکرار سے نفور ہے تاہم برگسان کے فلسفہ کی رو سے جیسا کہ وِلڈن کار رکھتا ہے۔ حشر اجساد بھی عین قرین قیاس ہے۔ زمانہ کو لمحات میں تقسیم کر دینے کی وجہ سے ہم اُسے مکان سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ اور اس لئے اس کو عبور کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ زمانہ کی اصل حقیقت اس وقت آشکار ہو سکتی ہے جبکہ ہم اپنی ذات میں غوطہ زن ہوں۔ کیونکہ حقیقی زمانہ خود ہماری حیات ہی ہے۔ جو حالت جد و جہد کو برقرار رکھنے سے اپنے آپ کو قائم و دائم رکھ سکتی ہے۔ ہم زمانہ کے محکوم اُسی وقت تک ہیں۔ جب تک کہ زمانہ کو مکان سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ مقید بالمکان زمانہ تو ایک زنجیر ہے۔ جسے حیات نے اس لئے اپنے گرد لپیٹ رکھا ہے۔ تاکہ وہ موجودہ ماحول کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ درحقیقت ہم غیر زمانی ہیں۔ اور موجودہ زندگی میں بھی ہمیں اپنے غیر زمانی ہونے کا احساس ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ احساس محض آنی ہو گا۔

خودی میں جس چیز سے پختگی پیدا ہوتی ہے وہ عشق ہے۔ لفظ عشق میں نے وسیع ترین مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ہیں جزو ذات بنانا یا اپنے اندر جذب کرنا عشق کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ کوئی نصب العین سامنے رکھا جائے۔ اور اُسے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور معشوق دونوں میں انفرادیت کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر فرد یکتا کے حصول کی کوشش طالب اور مطلوب دونوں کے اندر شان انفرادیت پیدا کر دیتی ہے۔ جس طرح عشق سے خودی میں پختگی اور توانائی آتی ہے۔ اُسی طرح سوال سے اُس میں ضعف اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ جو بات ہمیں بغیر ذاتی کوشش کے حاصل ہو جائے وہ سوال کے ذیل میں آ جاتی ہے۔ ایک دولت مند کا بیٹا جو اپنے باپ کے مرنے کے بعد اسکی جائداد کا وارث ہوتا ہے۔ دراصل سائل یعنی گدا ہے۔ اسی طرح جو شخص دوسروں کے خیالات کو مدار فکر بناتا ہے۔ وہ بھی سائل ہے۔ پس خودی کو پختہ کرنے کے لئے ہمیں عشق اختیار کرنا چاہئے یعنی اپنے اندر قوت

انجام سے بے نیازی چاہئے اور ہر قسم کے سوال سے محترز رہنا چاہئے۔ ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

عشق کس طرح اختیار کرنا چاہئے۔ اس سوال کا جواب کم از کم مسلمان کے لئے آنحضرت صلعم کی زندگی میں موجود ہے۔ آپ نے اپنے طرز عمل سے مسلمانوں کو دکھایا کہ عشق ایسا ہوتا ہے۔ اور اس طرح اس پر کاربند ہوتے ہیں۔ پس مسلمان کو لازم ہے کہ آنحضرت صلعم کا اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھے۔ یعنی آپ سے محبت کرے ؎

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

تربیتِ خودی کے مراحل تین ہیں:۔

(۱) دستورِ الٰہیہ کی اطاعت۔ (۲) ضبطِ نفس۔ جو شعورِ ذاتی یا انانیت کی اعلےٰ ترین شکل ہے۔

(۳) نیابتِ الٰہی[1]۔

نیابتِ الٰہی دنیا میں انسانی ارتقاء کی تیسری اور آخری منزل ہے۔ نائب اس زمین پر خدا کا نائب ہوتا ہے۔ وہ کامل خودی کا مالک اور انانیت کا منتہائے مقصود ہوتا ہے۔ دماغ اور جسم دونوں کے لحاظ سے حیات کا بہترین اور بلند ترین مظہر ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں حیات مرتبۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے۔ ہماری ذہنی زندگی کے اختلافات اس کی ذات میں پہونچکر ہم آہنگی کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ یعنی کائنات کے پیچیدہ مسائل اس کی نظر میں سہل ہو جاتے ہیں۔ وہ اعلےٰ ترین قوت اور برترین علم دونوں کا حامل ہوتا ہے اس کی زندگی میں فکر اور عمل۔ جبلت اور ادراک سب ایک ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ شجرِ انسانیت کا آخری ثمر ہوتا ہے۔ اور چونکہ وہ سب کے آخر میں ظاہر ہوگا۔ اس لئے وہ تمام صعوبتیں جو انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں لاحق ہوتی ہیں۔ محلِ اعتراض نہیں ہیں۔ وہ بنی نوع آدم کا حقیقی حاکم ہوتا ہے

---

[1] نیابت یا خلافتِ الٰہیہ کی استعداد ہر شخص میں موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا اللہ تعالےٰ نے "وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔"

اور اس کی بادشاہت در اصل اس دنیا میں خدا کی بادشاہت ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو حیات کی دولت اور اپنا تقرب عنایت کرتا ہے۔ ہم منازل ارتقائی جسقدر زیادہ طے کرینگے۔ اسی قدر اس سے قریب ہوتے جائیں گے۔ اس کے تقرب کے معنی یہ ہیں کہ ہم حیات کے مراتب عالیہ پر فائز ہو رہے ہیں۔

واضح ہو کہ اس کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ بنی نوع آدم جسمانی اور دماغی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہو جائیں۔ اگرچہ فی الحال ایسے فرد کا وجود ہمارے تخیل کے علاوہ اور کسی جگہ نہیں پایا جاتا۔ لیکن انسانیت کا تدریجی نشوونما اس بات کی دلیل ہے کہ زمانہ آئندہ میں۔ افراد یکتا کی ایسی نسل پیدا ہو جائے گی۔ جو حقیقی معنوں میں خلافت و نیابت الٰہیہ کی اہل ہو گی۔

الغرض زمین پر خدا کی حکومت کے معنی یہ ہیں۔ کہ یہاں یکتا اور اعلےٰ افراد کی جماعت جمہوریت میں قائم ہوگی اور ان کا صدر اعلےٰ وہ شخص ہو گا جو ان سب پر فائق ہوگا۔ جس کا مثل۔ اس روئے زمین پر ڈھونڈے نہ مل سکے گا۔

نیٹشے نے بھی اپنے تخیل میں افراد یکتا کی اس ترقی یافتہ جماعت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن اسکے الحاد اور نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا" (ماخوذ از دیباچہ اسرار خودی)

اب ہم اقبال کے فلسفہ کا مغربی حکما کے افکار سے موازنہ کرتے ہیں:-

اقبال کے فلسفہ کی رو سے یہ بات مسلم ہے کہ انسان کی ترقی تین مختلف جہات پر ہو گی:- (۱) شخصی اختیار (۲) شخصی بقائے روح اور نیابت الٰہیہ یورپ میں کینٹ وہ شخص گزرا ہے۔ جس نے یہ بات بخوبی واضح کر دی کہ مجرد عقل کی مدد سے ہم کائنات کے اہم مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ اور اس طرح اس نے فلسفیانہ زاویہ نگاہ سے "ایمان" کی ضرورت کو ثابت کر دیا۔ "تنقید عقل عملی" میں اسے انہی مسائل میں زندگی کی حقیقت نظر آگئی چنانچہ وہ ان تصورات سہ گانہ کو تجربہ انسانی کے اصول اولیں قرار دیتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ جب تک انسان کو فاعل مختار نہ مانا جائے۔ اس وقت تک اسی کو قرار نہیں دے سکتے

اور نہ وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار گردانا جا سکتا ہے ۔

کینٹ نے اس حقیقت کا انکشاف کر کے انسانیت کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے ۔

کینٹ کی طرح اقبال کو "ایمان" کے اثبات کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی ۔ کیونکہ ان کا فلسفہ "خودی" سے شروع ہوتا ہے ۔ اور اس کی مسلسل جد و جہد کی تاویل اس کے سوائے اور کسی نہج پر نہیں ہو سکتی ۔ کہ انسان کو اپنی خودی کی مسلسل جد و جہد کے آخری نتیجہ پر ایمان حاصل ہے ۔ جبھی تو وہ سراپا جد و جہد بنا ہوا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جب تک ہمیں یقین نہ ہو کہ جد و جہد کی بدولت ہمیں گوہر مقصود حاصل ہو جائیگا اسوقت تک ہم پیہم کوشش کر ہی نہیں سکتے ۔

اسی طرح اقبال کو "اخلاقی قانون" کے اثبات کی ضرورت درپیش نہیں ہوئی ۔ اس حیثیت سے کہ حکم ماقبل التجارب میں نافذ ہو ۔ اقبال کا نظریہ یہ ہے ۔ کہ "اخلاقی قانون" حیات خودی کی باطنی ضروریات کی بنا پر ظہور میں آتا ہے ۔ جو شے شخصیت کو توانائی عطا کرے اچھی ہے ۔ اور جو شے اُسے کمزور کرے وہ بُری ہے ۔ گویا قانون مذکورہ کے وجود میں آنے کے لئے خود انسان کی شخصیت کافی ضمانت ہے ۔ اس کے اثبات کے لئے کسی دلیل و برہان کی حاجت نہیں ہے ۔

اقبال اور کینٹ کے زاویائے نگاہ میں ایک فرق یہ بھی ہے ۔ کہ اقبال کے فلسفہ کی رو سے آزادی یا اختیار اور بقا یا حیات دوام ۔ سعی پیہم اور جہد مسلسل کا ثمرہ ہے ۔ اور اس سے وہی لوگ متمتع ہو سکتے ہیں جو مسلسل جد و جہد کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ اگر کوئی شخص آزادی اور حیات ابدی کا طالب ہو تو اسے ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے ۔ یہ چیزیں گھر بیٹھے ہاتھ نہیں آئیں گی ۔ اس کے بالمقابل کینٹ نے آزادی اور حیات ابدی کو اس لئے اپنے فلسفہ میں داخل کیا کہ اسے یہ کہنے کا موقع مل سکے ۔ کہ کائنات میں عدل کار فرما ہے ۔ اور افعال اور اُن کے ثمرات میں مطابقت کلی موجود ہے ۔

اقبال کا فلسفہ انسان کے دل میں خوش آیند اُمیدیں پیدا کرنے کا موجب ہے ۔

میرا خیال ہے کہ خواہش اور فاعلیت۔ یہ دو چیزیں خودی کے اولیں خصائص ہیں۔ اور ان کی وجہ سے انسان میں امیدوں کا پیدا ہونا۔ ایک لازمی اور فطری امر ہے؛

شوپن ہار کی قنوطیت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ سب اوقات۔ کائنات کی ناخوش آیند صورت کے خیال میں منہمک رہتا ہے۔ اور زندگی کی ان طوفان خیزیوں پر نظر نہیں ڈالتا۔ جو خود اس کے اندر برپا ہیں۔ علاوہ بریں۔ اگر وہ زندگی کو زبوں اور مذموم خیال کرتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ بدقسمتی سے اسے زندگی میں نہایت تلخ تجارب حاصل ہوئے تھے۔ اور اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ "خواہش" ایک امر مذموم ہے۔ اور موجب کلفت ہے؛

اقبال اور شوپن ہار میں اس لحاظ سے بعد المشرقین ہے۔ جو شے اقبال کی نظر میں اچھی ہے وہی شے شوپن ہار کے نزدیک بری ہے۔ اقبال کی رائے میں مصائب اور آلام۔ خودی کی تربیت اور اصلاح کا موجب ہیں۔ شوپن ہار کی نظر میں یہی شے خودکشی کے جواز کی دلیل بن گئی ہے؛

فی الجملہ کینٹ اور شوپن ہار کے خیالات کا براہ راست اقبال کے فلسفہ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ کیونکہ کینٹ اگرچہ فلسفہ کی دنیا میں عظیم الشان مرتبہ رکھتا ہے۔ تاہم وہ محض ایک مابعد الطبیعاتی مفکر تھا۔ اور اقبال کو فلسفہ کے اس شعبہ سے اسقدر علاقہ نہیں جسقدر اخلاقیات سے ہے۔ رہا شوپن ہار کا فلسفہ۔ سو اس کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اقبال جیسا مذہبی خیالات رکھنے والا انسان اس کے فلسفہ کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا؛

جس شخص کے فلسفہ کا اقبال کے خیالات پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے۔ وہ نیٹشے (Nietzche) ہے جس کی وفات سنہ ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ اس کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ خواہش اقتدار اس کائنات میں ایک بنیادی حقیقت ہے۔ یہ خواہش زندگی کی فراوانی اور افزونی کی مظہر ہے۔ اور بالذات۔ تمام حسنات کی سرتاج ہے ٹھیک جسطرح شوپن ہار کے فلسفہ میں "خواہش زیست" تمام سیئات کی بنیاد ہے۔ یعنی جو چیز شوپن ہار کی نظر

بدترین ہے وہ نیٹشے کی نظر میں بہترین ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ شوپن ہار جسے شیطان سمجھتا ہے۔ نیٹشے اُسے خدا سمجھتا ہے ؛

بہرکیف اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ بقول نیٹشے اس کائنات کی رگ و پے میں کارفرما ہے اور اس کے فلسفہ کا یہ سنگ بنیاد اقبال کے فلسفہ کے سنگ بنیاد یعنی خودی کی مسلسل جدوجہد کی حالت سے عملی طور پر مطابقت رکھتا ہے ؛

اقبال اور نیٹشے دونوں کی نظر میں جدوجہد اور خواہش خطرات اور مشکلات آویزش اور تنازعات اور مصائب و آلام کے مصلحانہ اثرات۔ تعمیر انسانی کے بنیادی لوازم ہیں۔ نیٹشے نے بنی نوع آدم کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ آقا اور غلام اور ان دونوں کے لئے جداگانہ اخلاق تجویز کئے ہیں۔ غلاموں کے لئے مسیحی اخلاق یعنی بُزدباری۔ اور مسکینی اور آقاؤں کے لئے وہ اخلاق جو "خواہش اقتدار" پر مبنی ہیں۔ اور جو شدت اور جدوجہد کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جدوجہد کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ "فوق البشر" ظاہر ہو۔ جو مستقبل بعید میں ظاہر ہوگا اور زندگی کا کامل مظہر ہوگا۔ چنانچہ نیٹشے لکھتا ہے کہ "یہ زمانہ آئندہ کا یہ مرد میدان جو ہمارا نجات دہندہ ہوگا۔ ہمیں موجودہ نصب العین اور اس کے نتائج سے آزادی دلائیگا اور ان قوتوں کو فنا کرنیوالا ہوگا جو زندگی کے خلاف مصروف عمل ہیں۔ جو اپنے ساتھ انقلاب عظیم لائیگا جس کی بدولت دنیا میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہونگی۔ جو ہماری قوت ارادی کو آزادی عطا کرے گا جو کائنات کو اس کے صحیح مقام پر قائم کرے گا۔ اور بنی نوع آدم کے اندر بہترین تمنائیں پیدا کرے گا۔ جو مسیحیت کا مخالف اور تباہ کرنے والا ہوگا۔ جو کائنات کی حقیقت کو ثابت کرے گا۔ الغرض یہ فوق البشر جو غیر معمولی طاقتوں کا مالک ہوگا۔ ضرور ہے ایک دن دنیا میں ظاہر ہو"

اقبال اور نیٹشے کے خیالات میں بڑی حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔ دونوں کا مسلک یہ ہے کہ یہ مادی دنیا خودی کی جدوجہد کا ایک وسیع میدان ہے۔ جس میں وہ مرتبۂ اختیار پر فائز ہونے کی کوشش کرتی ہے

دونوں کا مذہب یہ ہے کہ آرٹ کے اندر جمال اور اقتدار دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنی چاہئے۔ دونوں مسیحی فلسفۂ اخلاق کے مخالف ہیں۔ کیونکہ یہ فلسفہ خودی کو کمزور کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ نیٹشے نے فلسفہ مذکورہ پر نہایت سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے۔ اقبال نے براہ راست اس کی تردید پر کمر نہیں باندھی۔ صرف اشارہ کر دیا ہے کہ یہ فلسفہ ناقص ہے اور مسیحیت بنی نوع آدم کے لئے مفید نہیں۔ کیونکہ ترک دنیا سکھاتی ہے۔ اور اس وجہ سے خودی کی مخفی طاقتیں بروئے کار نہیں آ سکتیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ ؎

بدریا غلط و با موجش در آویز   حیات جاوداں اندر ستیز است

دنیا میں رہ کر اور مشکلات کا مقابلہ کرنے سے ہی خودی میں پختگی پیدا ہو سکتی ہے۔ باایں ہمہ فوق البشر کے تصور کے لحاظ سے اقبال اور نیٹشے دونوں میں بڑا فرق نظر آتا ہے:

نیٹشے کا فوق البشر ایک ایسی ہستی ہے۔ جو رحمدلی، ورمحبت اور ہمچو ازیں قبیل دیگر صفات قلبی سے جو سوسائٹی کے قیام کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ یکسر عاری ہے۔ اقبال کا فوق البشر یا انسان کامل ایک ملنسار ہستی ہے۔ جو سوسائٹی میں۔ دوسرے آدمیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اپنی ذاتی قوتوں کی بدولت۔ دوسروں کو اپنی سطح پر لا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:- ؎

تنے پیدا کن از مشت غبارے   تنے محکم تر از سنگین حصارے

درون او دل درد آشنائے   چو جوئے در کنار کوہسارے

اقبال کے انسان کامل کا مزاج سختی اور نرمی دونوں کا حامل ہے۔ اور وہ حسب اقتضائے وقت۔ ان دونوں صفات سے کام لیتا ہے۔ اس طرح کہ اس کو بھی فائدہ ہو اور سوسائٹی کو بھی۔ لیکن نیٹشے کا فوق البشر اگر کامیاب انسان ہے تو وہ یقیناً ظالم اور سنگدل ہوگا۔ اور اگر ناکام رہا تو خلوت گزیں اور غالباً دنیا سے متنفر ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ نیٹشے کا فوق البشر اپنی ذات میں محدود ہے۔ اس کے سامنے کوئی نصب العین یا مطمح نظر

نہیں۔ جس کے حصول کی وہ کوشش کر سکے۔ برخلاف اس کے اقبال کے انسانِ کامل کے سامنے خدا کی ذات موجود ہے اور خدا چونکہ غیر محدود ہے۔ اس لئے اس کی ترقی کا میدان بھی غیر محدود ہے۔ لیکن نیٹشے کے فوق البشر کے لئے ترقی کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ میرے خیال میں فلسفۂ حیات کے لئے یہ بات اشد ضروری ہے۔ کہ وہ انسانی ترقی کا ضامن ہو۔

پس اس لحاظ سے اقبال کا نظریہ۔ نیٹشے کے نظریہ پر یقیناً فوقیت رکھتا ہے۔ آخر الذکر چونکہ خدا کی ہستی کا منکر ہے۔ اس لئے اس کے فلسفہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس کا فوق البشر مزید ترقی نہیں کر سکتا:

علاوہ بریں نیٹشے کے فوق البشر میں ایک نقص یہ ہے کہ اس نے بنی نوع آدم کو دو طبقوں میں منقسم کر دیا ہے۔ آقا اور غلام۔ اس کا خیال ہے کہ غلام ہمیشہ غلام ہی رہیں گے۔ وہ کبھی آقا کے مرتبہ کو نہیں پہونچ سکتے۔ چنانچہ فوق البشر کے مستقبل قریب میں ظاہر ہونے کے لئے اس نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ طبقۂ امرا میں اعلےٰ افراد پیدا کئے جائیں۔ لیکن اقبال کے فلسفہ کی رو سے ہر شخص۔ غیر محدود ترقیات کا مرکز ہے۔ ترقی کی راہیں ہر شخص کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوئی ہیں۔ پس اقبال کے انسان کامل کے ظہور کیلئے مدت مدید درکار نہیں ہے۔ وہ مستقبل قریب میں اور اسی عالم میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ اقبال نے "اسلامی جمہوریت" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا۔ اس میں وہ ایک مقام پر یوں لکھتے ہیں۔ "یورپ کی جمہوریت جس کے سر پر اشتراکی شورش کا بھوت سوار ہے۔ دراصل یورپین سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کی بدولت پیدا ہوئی۔ نیٹشے چونکہ جمہور کی حکومت کو پسند نہیں کرتا۔ اور عوام الناس سے کوئی توقع نہیں کرتا اس لئے وہ مجبوراً اعلےٰ تہذیب و تمدن کو طبقۂ امرا کی نشوونما پر منحصر کرتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ کیا عامۃ الناس ترقی کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتے؟ اسلامی جمہوریت۔ یورپین جمہوریت کی طرح اقتصادی مواقع کی وسعت سے پیدا نہیں ہوئی۔ وہ تو ایک روحانی اصول ہے۔ جو اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر شخص میں ترقی کی استعداد موجود ہے۔ بشرطیکہ اس کو ترقی کرنے کے مواقع بہم

پہونچائے جائیں۔ اور اسلام ایسا مذہب ہے جو انسان کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے عامۃ الناس اور ادنٰے طبقہ کے لوگوں میں سے بہترین کیریکٹر اور لیاقت کے افراد پیدا کئے ہیں۔ پس بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی اسلام کی جمہوریت میں نیٹشے کے فلسفہ کی تکذیب کا کافی سامان موجود ہے۔

میں یقین کرتا ہوں کہ اقبال کے اس قول کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ کیونکہ اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت مل سکتی ہیں کہ ادنٰے ترین طبقہ کے افراد غلامی سے بادشاہت کے مرتبہ پر پہونچ گئے ہیں اور اور انکا شمار دنیا کے سب سے بڑے آدمیوں میں ہو سکتا ہے۔ نیٹشے کو جو کچھ غلطی اس باب میں لاحق ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے تمدن اور امارت کا تصور۔ یونانی ادبیات کے مطالعہ پر مبنی کیا ہے۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ اس معاملہ میں یونانی طرز حکومت بے حد ناقص تھا۔ اگر اسے اسکا احساس ہو جاتا تو وہ غلامی کو تمدن کا جزو لاینفک قرار نہ دیتا۔ اس کا فوق البشر۔ دوسروں کی محنت کے بل بوتے پر تفوق حاصل کرتا ہے اور اس لحاظ سے بقول اقبال اس کی حیثیت ایک سائل سے زیادہ نہیں ہے۔

نیٹشے کے بعد۔ جس مغربی فلاسفر سے اقبال کا فلسفہ قدرے مشابہت رکھتا ہے۔ وہ ہنری برگسان ہے اس جگہ اس کا فلسفہ شرح وبسط کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ اس کی نظر میں تغیر اور انقلاب۔ کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔ زندگی۔ تغیرات کی ایک لڑی ہے۔ لیکن ہماری قوت مدرکہ ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ وہ غیر مربوط حالتوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ علاوہ بریں خارجی حواس بھی ہمیں دھوکہ دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد ہمیں حقیقت کا علم عطا کرنا نہیں۔ بلکہ روزمرہ زندگی میں ہماری رہنمائی کرنا ہے ہماری قوت مدرکہ زندگی کے ان مظاہر سے سروکار رکھتی ہے۔ زمان مسلسل اور مکان کہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت کا انکشاف ہمارے شعور کی وحدت میں ہوتا ہے۔ جسے ہم بذریعہ "وجدان" معلوم کر سکتے ہیں۔ اور وجدان زمان مسلسل میں نہیں۔ بلکہ زمان محض میں پایا جاتا ہے۔ حقیقت جس کا علم اس طرح حاصل ہوتا ہے۔ ایک تخلیقی تحریک ہے۔ جسے بالفاظ دیگر تخلیقی انقلاب کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک زبردست پیشرو حرکت ہے

اور ہر شے کو اپنے ساتھ ارتقائی رنگ عطا کر دیتی ہے۔ لیکن اس کا راستہ بالکل غیر معین ہے اور زمانہ آئندہ کا کوئی مقصد اس سے وابستہ نہیں ہے:

اقبال بھی برگساں کی طرح تغیر کی واقعیت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک بھی دنیا ہر لحظہ منقلب ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ ع

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

زمان و مکان کے متعلق بھی اقبال کا وہی عقیدہ ہے جو برگساں کا ہے۔ اقبال اس کی حقیقت کے معترف ہیں اور اسے زمانِ مسلسل سے جدا تصور کرتے ہیں۔ تاہم خطبات مدراس سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ انہوں نے یہ خیالات برگساں کے فلسفہ سے اخذ نہیں کئے ہیں:

اس جزوی مشابہت سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو دونوں مفکرین کے خیالات میں بہت کچھ اختلاف نظر آتا ہے۔ برگساں کا فلسفہ روح اور مادہ میں تصادم تسلیم کرنے کی وجہ سے کائنات میں دوئی کا علمبردار ہے لیکن اقبال کے فلسفہ میں یہ دوئی محیط کل خودی یعنی خدائی ذات میں آکر وحدت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

برگساں نے عقل و ادراک کی خوب خوب دھجیاں اڑائی ہیں اور اسے بالکل ناکارہ قرار دیا ہے لیکن اقبال عقل کو بالکل بیکار نہیں سمجھتا۔ ان کی رائے میں ادراک، وجدان، اور "عشق" تینوں مل کر وہ مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جسے "گلشن راز" میں تفکر سے تعبیر کیا گیا ہے:

واضح ہو کہ عشق ایک ایسے یکسانیت پیدا کرنے والے طریق عمل کا نام ہے۔ جو برگساں کے "وجدان" سے زیادہ قوی اور جاندار ہے۔ عشق سے مراد یہ ہے کہ عاشق حقیقت سے صرف آشنا ہی نہ ہو۔ بلکہ اس سے بغل گیر ہو جائے۔ عاشق کی دراصل خواہش یہی ہوتی ہے کہ معشوق اس کے دل میں سما جائے۔ اقبال نے عقل اور عشق دونوں میں کامل ہم آہنگی پیدا کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان میں خادم اور مخدوم کا رشتہ ہونا چاہئے:

من بندۂ آزادم عشق است امام من   عشق است امام من عقل است غلام من

علاوہ بریں برگسان نے انفرادی اور کلی دونوں قسم کی زندگیوں سے غایت یا مقصد کا تصور فنا کر دیا ہے - اس کے نزدیک زندگی مقاصد سے معرا ہے - حافظہ اس کی رائے میں دماغ کی فاعلیت کی بہترین مثال ہے - اس نے ارادہ اور نیت کو جو مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں - کوئی اہمیت نہیں دی ہے:

برگسان نے شخصیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اقبال کے فلسفہ کے پیش نظر ناقص معلوم ہوتا ہے -

برگسان نے "جذبۂ تخلیق" کو ایک غیر مطبوع اصول کی شکل میں پیش کیا ہے - جو شوپن ہار کے "غیر ذی شعور ارادہ" سے مماثلت رکھتا ہے - اس قسم کا اصول - انفرادی زندگی پر اس طرح چھا جاتا ہے - کہ شخصیت کے ابھرنے کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی - علاوہ بریں اصلی تحریک حیات کی قوت جو اپنے ساتھ ہر شئے کو بہائے لئے جاتی ہے - ہمارے سامنے ایک ایسی کائنات کا منظر پیش کرتی ہے - جہاں ہر طرف "جبر" کا ڈنکا بج رہا ہو - حالانکہ برگسان نے کئی جگہ انسان کے مختار ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے - اگرچہ وہ انسانی اختیار کو شخصی آزادی کے رنگ میں پیش کرتا ہے - لیکن جب تک شخصیت کی حدود بہت مناسب اور صحیح طریق پر - کی جائے - اس وقت تک "اختیار" شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتا:

برگسان کے فلسفہ میں اسبات کی کبھی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ شخصیت کو ایک غیر ذی شعور اصول یعنی "ارتقائے تخلیقی" نے کیونکر پیدا کر دیا - واضح ہو کہ اس کے فلسفہ میں تخلیقی ارتقاء کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو اقبال کے فلسفہ میں "خدا" کو لیکن خدا ایک خودی ہے اور اس لئے بجا طور پر خالق خودی کہا جا سکتا ہے - اس لئے اقبال کا نظریہ برگسان کے نظریہ کے مقابلہ میں زیادہ معقول نظر آتا ہے - اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ انسانی شخصیت کی تشریح اسی صورت سے ہو سکتی ہے - جب ہم خدا یا "حقیقت الحقائق" کو بھی ایک شخص تصور کریں - اقبال کی طبیعت میں جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں - زبردست مذہبی میلان پایا جاتا ہے - اور اس لئے وہ خدا کا تصور شخصیت ہی کے رنگ میں کرتے ہیں اور یہ انداز طبع ان کے فلسفہ کے حق میں از بس مفید ہے:

اقبال نے اپنے خطبات مدارس میں بیان کیا ہے کہ خدا نے اس لئے اپنی آزادی پر بعض قیود عاید کر لی ہیں۔ تاکہ انسان کو زیادہ سے زیادہ آزادی نصیب ہو سکے۔ لیکن برگساں کا "جذبۂ تخلیق" انسان اور حیوان دونوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتا ہے۔ اور جہانتک میں سمجھتا ہوں انسان کے لئے بہت کم اختیار کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ اقبال نے جہانتک ہو سکا ہے۔ خدائی قدرت و اختیار سے انسان کو حصہ دلایا ہے اور انسانی شخصیت کو اوج ترقی پر پہونچایا ہے۔ لیکن برگساں غیر ذی شعور ارتقائے تخلیقی کے نظریہ کو فروغ دینے کی خاطر انسانی شخصیت کو بہت کچھ پست اور درماندہ کر دیتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ نیٹشے اور برگساں دونوں نے جماعت کی بجائے فرد کو مخاطب کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برگساں کے فلسفہ کی بدولت یورپ میں "تجارتی اتحاد" کی تحریک پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ براہ راست یا بلا واسطہ اس تحریک کا بانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ رہا نیٹشے تو وہ بنی نوع آدم کو بنظر حقارت دیکھتا تھا۔ اور صرف مخصوص افراد کو لائق خطاب سمجھتا تھا۔ چونکہ وہ ہر وقت فوق البشر کے تصور میں غرق رہتا تھا۔ اس لئے اسے سوسائٹی کا کبھی خیال آتا ہی نہ تھا۔ ان مفکرین کے برخلاف اقبال کی توجہ ہمیشہ افراد کامل کی ایک بڑی جماعت پر مرکوز رہتی ہے۔ اس لئے اُن کے فلسفہ کی عمرانی اہمیت بالکل واضح ہے۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس رنگ میں وہ تمام مغربی فلاسفروں سے منفرد نظر آتے ہیں۔ اُن کی شاہراہ بھی سب سے جدا ہے۔

لگے ہاتھوں اگر گوئٹے کا بھی ذکر کر دیا جائے تو خلاف محل نہ ہوگا۔ یہ شخص میرے خیال کے مطابق یورپ میں لیونارڈو کے بعد خدا کی "بہترین مخلوق" یا اس کی قوت تخلیق کا بہترین نمونہ ہو گزرا ہے اگرچہ وہ پیغمبر نہ تھا۔ لیکن اپنے اندر پیغمبرانہ صفات ضرور رکھتا تھا۔ اس کی زندگی۔ ہم آہنگی اور توازن کا ایک بہترین نمونہ تھی۔ یعنی سراپا "آرٹ" تھی۔ جس کے مطالعہ سے "فتبارک اللہ احسن الخالقین" کے معنی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

میں اس کا ذکر اس لئے بھی کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی اقبال کے فلسفہ کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ فاؤسٹ میں اس نے لکھا ہے اور کیا خوب لکھا ہے:۔

"حوادث روزگار سے متاثر نہ ہونا چاہئے۔ زندگانی کا آرٹ اسی نکتہ میں مضمر ہے"۔

پیام مشرق میں اقبال نے بھی گوئٹے کے کمالات کا نہایت فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اقبال کی طرح گوئٹے بھی اسی بات کا قائل تھا کہ بقا ذاتی کوشش سے حاصل ہوگی۔ یہ دولت یونہی بیٹھے بٹھائے کسی کو نہیں مل سکتی ۔ ع ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

آخر میں اس امر کی صراحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کہ اقبال "مادیت" کے خواہ وہ کسی رنگ میں ہو سخت دشمن ہیں۔ اور اسے انسانیت کے حق میں سم قاتل خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے تصنیفات میں اس مسلک کے مضر نتائج کھول کھول کر بیان کئے ہیں۔ اور انجام کار اس نظام کے فنا ہو جانے کے متعلق پیشگوئی بھی کی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ گزشتہ اوراق کے مطالعہ سے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ اقبال کا فلسفہ کیا ہے اور کن کن باتوں میں مغربی ارباب فکر کے خیالات سے مختلف ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اقبال کا فلسفہ تمام تر حکمائے مغرب کے خیالات سے ماخوذ ہے۔ صریحاً غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انکا یہ قول۔ اس امر کی دلیل ہے۔ کہ انہوں نے اقبال کے فلسفہ کا مطالعہ تو کیا ہے۔ مگر سمجھنے سے قاصر رہے۔

جس طرح دو تصویروں کے بعض امور میں باہم مشابہ ہونے سے ایک کو دوسری کی نقل نہیں کہہ سکتے اسی طرح اگر نیٹشے اور برگسان کے بعض خیالات کا پرتو اقبال کے فلسفہ میں نظر آتا ہے۔ تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ کہ اقبال نے اپنا فلسفہ ہی ان حضرات سے اخذ کیا ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات مدراس میں اُن تمام فلاسفہ اور حکما کی آراء و افکار پر زبردست تنقید کی ہے۔ جن سے انکا فلسفہ ماخوذ سمجھا جاتا ہے۔

نیٹشے اور برگسان دو ہی فلاسفر ایسے ہیں۔ جن کے خیالات سے اقبال کے فلسفہ میں کہیں کہیں جزوی

مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن اصول او۔ فروع دونوں کے لحاظ سے اقبال اور نیٹشے یا برگسان میں ا
نمایاں اور بین اختلافات پائے جاتے ہیں۔ کہ ان کی موجودگی میں وہی شخص اقبال پر تقلید کا الز
لگانے کی جرأت کر سکتا ہے۔ جس نے صداقت پسندی اور حقیقت پژوہی دونوں سے اپنا رشتہ
بالکل منقطع کر لیا ہو۔ اسے میں اقبال کے اس شعر پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں:

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام

اقبال

(از کاشی پریاگی)

ساحری کیشوں کی نظروں میں تو جادوگر ہے تو
میں جو کہہ سکتا تو کہہ دیتا کہ پیغمبر ہے تو
حدِ توصیف و ثنا و مدح سے برتر ہے تو
بحرِ اسلام و صفا و صدق کا گوہر ہے تو
نورِ بیضا و دمِ عیسیٰ نثارِ ہر شرر
مستتر لاکھوں سمندر ہیں وہ خاکستر ہے تو
سرمدی نغمے ہیں وقفِ لذتِ رقص و سرور
پیکر و جاں کو اک عیسوی نشتر ہے تو
میکڈوگل کا اگر ہے فخر تو گوئٹے کا ناز
فلسفہ کی وادیوں میں مشعلِ رہبر ہے تو

داغ اور حالی کی شان سرسید و اکبر کی جان
اُن میں جو اوصاف تھے اُن سب سے کچھ بڑھکر ہے تو

ملک میں ہر دل پہ سکہ ہے تری تحریر کا
نطق پرور ہے زباں ساز اور قواعد گر ہے تو

شکوہ تیرا ہے اگر میزان لب کی آبرو
تو جوابِ شکوہ میں جبریل کا ہمسر ہے تو

صاف اسرارِ خودی میں ہیں رموزِ بے خودی
خود نفیسی مشتری جس کا ہے وہ گوہر ہے تو

مہرِ علم و بخشش دل، کا سبب انوار ہیں
نور کی موجوں کا مخزن ہے مہِ انور ہے تو

ہے پیامِ شرقی تجدید اسلامی خیال
قدس کا بانگِ درا ہے جزوِ پیغمبر ہے تو

سید نفیسی صاحب حاضر کا باکمال شاعر اور سحر طراز افسانہ نگار — کانشی بریاگی الٰہ آباد

بزمِ خیال

(از محمد شرف الدین یکتا جودھپوری)

اندھیرا ہو گیا رخصت شبِ یلدائے ہجراں کا نظر آنے لگا مشرق میں چہرہ صبحِ تاباں کا
ہر اک سُو جاذبِ نظارہ ہے اک نور کا عالم گرا ہے ٹوٹ کر تکمہ تجلّی کے گریباں کا
پیامِ زندگی دیکر چمن کے سونیوالوں کو صبا نے اور ہی کچھ کر دیا عالم گلستاں کا
نہالانِ چمن جھوم اُٹھے کلیاں ہنس کر چٹکیں گُلوں کی خوشنما آنکھوں سے ہر سُو حسن نے جھانکا
اسی عالم میں میں کرتا تھا سیرِ عرصۂ ہستی کہ کچھ حوروں نے پکڑا آکے گوشہ میرے داماں کا

اُٹھا کر لے گئیں مجھ کو شہِ عالم کی مجلس میں
ضیائیں عالمِ انوار کی تھیں جلوہ گر جس میں

سُناؤں کیا وہاں میں نے انھیں آنکھوں سے کیا دیکھا ادھر نورِ خدا دیکھا اُدھر نورِ خُدا دیکھا
جنھیں روح الامیں کہتے ہیں وقفِ پاسبانی تھے سرِ محفل جھکائے سر صحابہ کو کھڑا دیکھا
خدا کی رحمتیں کچھ بے طرح اترائی پھرتی تھیں خدا کی مغفرت کو آستاں پر جبہ سا دیکھا

ہُوا اتنے میں غُل پھر آمد آمد کا فرشتوں کی ۔۔۔ اور اُن کے جھمگٹے میں ایک رندِ پارسا دیکھا

فرشتے لائے جب خوش نصیب انساں کو مجلس میں ۔۔۔ بتا دُوں کیا کہ اک نظارۂ حیرت فزا دیکھا

بظاہر تھا وہ بیگانہ مگر دل کا شناسا تھا

جسے اقبال کہتے ہیں وہی وہ مردِ یکتا تھا

یکایک وہ نظر اٹھی کہ جس میں رحمتِ باری ۔۔۔ چھپائے بیٹھی تھی دامن میں اُمّت کی گنہگاری

ہوئے جنباں وہ لعلِ لب کہ جن سے بزمِ امکاں میں ۔۔۔ تمدّن اور علم و فضل کے دریا ہوئے جاری

یہ لبہائے تبسّم ریز سے سرور نے فرمایا ۔۔۔ کہ اے طوطیِ خوشگوئے گلستانِ وفاداری

سخندانی نے تیری کر دیا حیراں زمانے کو ۔۔۔ ہوئے خاموش سب سُن سُن کے تیری نغز گفتاری

بیاں کچھ کر ذرا مجھ سے مری اُمّت کی حالت کا

کیا کچھ اُس نے چرچا میرے پیغامِ رسالت کا

جھکا کر سر ہُوا گویا وہ دربارِ رسالت میں ۔۔۔ شہنشاہِ دو عالم قومِ مُسلم ہے مُصیبت میں

زمانے نے ہمیں ایسا بلندی سے گرایا ہے ۔۔۔ کہ ہیں مصروفِ شیون رات دن قعرِ مذلت میں

اسیرِ پنجۂ نکبت رہینِ رنج ناکامی ۔۔۔ گرفتارِ نحوست ہیں پھنسے قیدِ فلاکت میں

سبب کیا ہے گھری میں یوں جو گرداب بلا کت میں
خدا جانے ہماری شان اگلی کیا ہوئی آقا

زمانے کی یہ نیرنگی ہمیں آنکھیں دکھاتی ہے
مصیبت ہی مصیبت سامنے آنکھوں کے آتی ہے

ہوا کچھ ایسی بدلی ہے مرے مولا زمانے کی
قسم کھائی ہے چرخ پیر نے ہم کو مٹانے کی

ہوائے تند کے جھونکے لئے ہیں خانہ بربادی
نہ ڈھا جائے بنا توحید کے اس کارخانے کی

ہم اپنی خستہ حالی کی شکایت کر چکے اس سے
کہ جس کے ہاتھ میں کنجی ہے ہر بگڑی بنانے کی

مگر افسوس اس حالت پہ اس کو بھی نہ رحم آیا
نہ کچھ امداد اپنی حضرت رب علا نے کی

کہیں یہ آپ بیتی کس سے اب جا کر یہ فرماؤ
کریں کس طرح جرأت داستان غم سنانے کی

کوئی یہ رنج افزا ماجرا بھی اب نہیں سنتا
ہماری اے شہ عالم خدا بھی اب نہیں سنتا

مقدر کے ستائے ہیں سیہ بختی کے مارے ہیں
ہوئے ہیں جاں بلب ہم کنج مرقد کے کنارے ہیں

یہ سب سچ ہے کہ ہم ڈوبے پڑے ہیں بحر عصیاں میں
مگر آقا تمہاری ہی شفاعت کے سہارے ہیں

غلامی کی جو نسبت ہے اسی کی لاج کچھ رکھ لو
ذرا دیکھو تو بزم غیر میں کیا کیا اشارے ہیں

خدا سے اب دعا کیجئے کہ یہ حالت بدل جائے
یہ طوفانی گھٹا جو چھا رہی ہے سر سے ٹل جائے

سنا جب قصۂ غم بحرِ رحمت جوش میں آیا
جنابِ رحمتِ عالم نے یہ ارشاد فرمایا

کہ سن اے بلبلِ نالاں خزاں آزردہ گلشن کے
تری اس داستاں نے قلبِ رحمت کو بھی تڑپایا

خدا سے شکوہ بیجا تو اے ناداں کیا تو نے
مگر سوچا کہ یہ ابرِ مصیبت تجھ پہ کیوں چھایا؟

یہ ابتر حال تیرا کیوں ہمیشہ ہوتا جاتا ہے
نظر آتی ہے کیوں پلٹی ہوئی یکسر تری کایا

یہ تیری شامتِ اعمال ہے ننگِ مسلمانی!
چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

"تغافل کیش سن غفلت نے کھویا ہے مسلماں کو
حقیقت کیا ہے تیری تو نہ سمجھا رازِ پنہاں کو

تری قوت کے آگے ہیچ ہے دنیا کی ہر قوت
بنا دیتی ہے یہ روباہ ہر شیرِ نیستاں کو

مرے قول مؤکد سے اگر واقف نہیں ہے تو
پیامِ زندگی جس نے سنایا نوعِ انساں کو

مٹا سکتی نہیں مسلم کو دنیا کی کوئی طاقت
فراہم یہ کریگا خود بخود مٹنے کے ساماں کو

بنے کام اپنے کرتوتوں سے خود چل کر بگاڑے ہیں
تجھی نے بیخبر توڑا خدا کے عہد و پیماں کو

ابھی تک وقت ہے قوم مسلماں کے سنبھلنے کا
ارادہ بھی کرے تو ہاں اگر حالت بدلنے کا

اٹھ اے معجز بیاں شاعر بہ انداز دل آرائی
تو ہے اعجاز پرور تجھ میں ہے شانِ مسیحائی

زباں سیف ہے تیرے لئے سیفِ زباں تیری
دکھا دے قوتِ گویائی کی عالم کو گیرائی

تو ساقی ہے تو پھر جامِ بقا دے قومِ مردہ کو
ابھی بیدار ہو سکتی ہے لیکر ایک انگڑائی

مسلماں کو مسلماں کر پیامِ زندگی دیکر
اٹھا دے خفتہ بختوں کو بیانگِ کارفرمائی

دکھا شانِ بلالی کو مساجد میں اذاں دیکر
تو ڈھا دے اپنی تکبیروں سے بنیادِ کلیسائی

یہیں تک بس ابھی پہونچی تھی تقریرِ شہ والا
کہ میرے کان میں کچھ دور سے بانگِ خروس آئی

"ببینیم تا چہا تعبیر دارد خواب دوشینم
طالت تا کجا دامانِ خاموشی فراچینم"

اقبالؔ

(مجاز علی لکھنوی)

رنگِ اقبال پہ میں کر چکا، اظہارِ خیال،
نظم بھی لکھنے پہ سب کرتے ہیں اصرار بہت،

یاں یہ ہے عذر، قصیدہ تو نہیں اپنا کلام !
مدح آسان ہے، تنقید ہے دشوار بہت۔

تاجِ غالبؔ کا اس اک سر کے لئے زیبا ہے !
ورنہ اس جاہ کے ملتے ہیں طلبگار بہت !

آج اُردو میں اِس اک دم سے ہے بس رنگِ ادب !
ورنہ گلزار میں آتے ہیں نظر خار بہت،

وہ مے و جام میں ساقی کی نگہ دیکھتا ہے !
چشمِ نرگس کے تو گلشن میں ہیں بیمار بہت،

دردِ ملت بھی ہے اور دیں کا پیغام بھی ہے
(۱) ڈینٹے ہند کا ہے، مظہرِ اسلام بھی ہے !

(۱) روم کا مشہور رومی شاعر ڈوانٹے [illegible] جس طرح اسلام کے [illegible] اپنے زمانہ میں مسیحیت کا بہترین مظہر اور مصلح تھا (مجازی)

پیشکش بحضور اقبال

(از عبدالرشید صاحب ملک از بنگال ڈپٹی ڈائرکٹر آف اگریکلچر)

اے کہ علم ظاہر و باطن کی ہے تفسیر تو
اور عقدہ ہائے ہستی کا ہے تو عقدہ کشا
قاف سے لے تا کماری چین سے لے تا مریکہ[1]
فلسفہ کا تیرے غوغا ہے نکات اس کے دقیق
باد زندہ تا ابد کا نقش ہو تیرا سبق
فخر کم ہے جس قدر تجھ پر کرے ہے پنج آب
آہ مسلم جس کا پرچم فخر صد املاک تھا
الجھنوں میں چند روزہ زندگی کی پھنس گیا
لم یزل جس کی صفت ہے ملتجی اس سے ملک
معجزہ پھر اک دکھا۔ حق کا ہو عالم میں عمل

[1] مریکہ مخفف ہے امریکہ کے لئے۔

عالمگیر!

(علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم کا ترجمہ)

(از جناب پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم۔اے)

نام جاری ہے زباں پر سب کی عالمگیر کا
دبدبہ ہر دل پہ ہے اس صاحبِ شمشیر کا

کون عالمگیر وہ فرزندِ دنیا و دیں
وہ کہ ترکش میں ہمارے تھا خدنگِ آخریں

وہ کہ میدانِ وغا میں دن کو گر استادہ تھا
شب کو رہینِ خرقہ و عمامہ و سجادہ تھا

ایک دن وہ صاحبِ زیبائشِ تاج و سریر
وہ کہ سلطانوں کا سلطاں تھا فقیروں کا فقیر

آخرِ شب سیر کی خاطر وہ تنہا چل دیا
جانے کس عالم میں تھا جنگل کا رستہ لے لیا

شہر میں گو نور و ظلمت میں ابھی پیکار تھی
صبح اس جنگل میں لیکن مطلعِ انوار تھی

شاہِ حق آگاہ کا سر جھک گیا بہرِ نماز
لے گیا حسنِ حقیقت کی طرف حسنِ مجاز

ناگہاں اک شیر آ نکلا شجر کی آڑ سے
چرخِ گردوں کانپ اٹھا اسکی اک چنگھاڑ سے

بوئے انساں سے انساں بن گئی خود رہنما
شیر نے اک جست کی اور پشتِ شہ پر آ پڑا

شاہِ عالمگیر نے مڑ کر نظر تک بھی نہ کی
ہاں مگر تیغِ دودم اپنی اسی دم کھینچ لی

ڈر کی گنجائش کہاں قلبِ شہِ جرار میں
شیر قالیں شیرِ بیشہ کو کیا اک وار میں

پھر اسی صورت سے جاری ہو گیا وردِ صلوٰۃ
پھر ہوئے قائم رکوع و سجدہ و التحیات

نام تو جاری زبانوں پر ہے عالمگیر کا
دل بھی ہے سینہ میں کیا اس صاحبِ شمشیر سا؟

دل ترا لبریز خوفِ حق سے ہے گر زندہ ہے
مردہ ہے تو غیر کی ہیبت سے گر لرزندہ ہے

جلوۂ حق ہو سکے جس میں وہی دل چاہیئے
ایسی لیلےٰ کے لئے ایسی ہی محمل چاہیئے

آرزوئے اقبال

(ابوالعلاء عطا چشتی (بغداد))

جلوه‌ای بخش به تاریکی غم‌خانهٔ ما
روزی اقبال بکش زحمت کاشانهٔ ما

کوته دستیم و تو خمخانهٔ عرفان بر دوش
لب ما تشنه و خالی شده پیمانهٔ ما

سوی بغداد گر آیی و شرف می‌بخشی
تو چه دانی چه شود با دل دیوانهٔ ما

دعوت شوق جسالت به فلک برساند
رقص مستانهٔ ما نعرهٔ رندانهٔ ما

بهر نظارهٔ تو دیده بصد بیتابی ست
در تمنای تو رنگ دل ما عنابی ست

تاجدار سخن ای شاه جهان معنی
روشن از جلوهٔ تو کون و مکان معنی

نام تو فلسفیان را سبب عز و وقار
ذات تو فخر همه نکته وران معنی

مصحف راز حقیقت را ز تو تفسیرے
نطق تو کاشف اسرار نهان معنی

جذبهٔ بیخودی قوم ز سحر تو گریخت
دهن نقط خودی یافت زبان معنی

بهر تسکین و قرار دل ناشاد آیی
ای خوشا روز که در بلدهٔ بغداد آیی

اِقبال!

(از جناب چوہدری جلال الدین صاحب اکبر بی۔ اے)

تلخیِ ایام سے جب تنگ آجاتا ہوں میں
اور پکارِ عمل کا حوصلہ ہوتا نہیں

جب ہجومِ یاس ہوتا ہے سکوں آموزِ دل
جب دلِ مایوس وقفِ مدعا ہوتا نہیں

جب دلِ ہنگامہ آرائے جہانِ آرزو
سوز و سازِ زندگی سے آشنا ہوتا نہیں

جب بھٹک جاتا ہوں راہِ منزلِ مقصود سے
رہنمائے شوق میرا رہنما ہوتا نہیں

شہریاری کے طلسمِ حرص کا ہوکر اسیر
شوقِ آزادی سے جب میں آشنا ہوتا نہیں

ہو کے بیخود جب کلیسائی فضاؤں میں کبھی
پیروِ دینِ متینِ مصطفیٰ ہوتا نہیں

جب سکوتِ مرگ ہوتا ہے مرے جذبات پر
زندگی کا دل میں کوئی ولولہ ہوتا نہیں

بے دلی میں جب مرے احساس مٹ جاتے ہیں سب
اور ذوق و شوق مجھ کو شعر کا ہوتا نہیں

جب حسینانِ جہاں کا بھی جمالِ جانفزو
ذوق افزائے دلِ بے مدعا ہوتا نہیں

نغمہ و صہبا و فرشِ سبزہ و سرو و سمن
کوئی بھی عیشِ جہاں کلفت رُبا ہوتا نہیں

تیرے نغمے پھونکتے ہیں مجھ میں افسونِ حیات
موجزن ہوتا ہے رگ رگ میں مری خونِ حیات

اقبال

(از عبدالحمید صاحب حمد جنڈیانوالہ ضلع امرتسر)

ڈاکٹر اقبال! اے ملکِ سخن کے شہریار
نازشِ اسلامیاں اے فلسفیِ نامدار

تو کبھی ہے صحنِ گلزارِ وطن میں نغمہ سنج
ہے کبھی ملت کی حالت پر خدا سے شکوہ سنج

ہے ترا "قومی ترانہ" بالیقیں بانگِ درا
سوئے منزل کاروانِ قوم کا ہے رہنما

تیرے شعروں نے دلوں میں جوش ایسا بھر دیا
از سرِ نو ملتِ مردہ کو زندہ کر دیا

اے مسیحِ شعر! اے بربط نوازِ زندگی!
ہر ترانہ ہے ترا نغمہ طرازِ زندگی

فلسفہ اس طرح شعریت سے ہم آہنگ ہے
جیسے کوئی فلسفی نغمہ سرائے چنگ ہے

مردہ دل کو ہیں ترے اشعار پیغامِ حیات
تشنہ کامِ آرزو کے واسطے جامِ حیات

کیوں نہ ہوں نظمیں تری درسِ کتابِ زندگی
تیرے ساغر میں ہے رومی کی شرابِ زندگی

ہوش کا شیدا کہیں مستی کا ہے طالب کہیں
تو نظیری ہے کہیں عرفی کہیں غالب کہیں

رازدانِ زندگی تو ترجمانِ زندگی
موت ہی تیری نگاہوں میں ہے جانِ زندگی

زندگی آموز ہے بیشک ترا اردو کلام　　ہجر کے مارے ہوؤں کو وصلِ دلبر کا پیام
فارسی اشعار میں لیکن طلسمِ حال و قال　　پوری آب و تاب سے روشن ہے خورشیدِ کمال
ڈالتا ہے گاہ "اسرارِ خودی" پر روشنی　　گاہ تو کرتا ہے تفسیرِ "رموزِ بے خودی"
گاہ دیتا ہے "پیامِ مشرق" اہلِ غرب کو　　تاکہ اُن کو زندگی کا فلسفہ معلوم ہو
گا کے سمجھاتا، لکھ کے گاتا ہے کبھی شعرِ "زبور"　　جس میں لہریں لے رہا ہے زندگی کا بحرِ نور
پھر کبھی اُڑ کر ستاروں میں پہنچ جاتا ہے تو　　نغمۂ "جاوید نامہ" جھوم کر گاتا ہے تو

کر سکے جو حسنِ معنی کو عیاں۔ کوئی نہیں　　ہند میں افسوس تیرا قدرداں کوئی نہیں
مولد و مسکن ترا ہوتی جو یورپ کی زمیں　　نام تیرا ہی علم افراز ہوتا ہر کہیں
گونج اُٹھتی تیرے نغموں سے فضائے آسماں　　رہبر ہوتا تری "بانگِ درا" پر کارواں
فخر ہے پنجاب کا تو، ہند کا اعزاز ہے　　عالمِ اسلام کا سرمایۂ صد ناز ہے

تو نوائے رازِ سازِ شعر پر گاتا رہے
تا قیامت پرچمِ اقبال لہراتا رہے

اِقبالؔ سے

(از مظہر انصاری بی۔اے۔ آنرز۔ دفتر نظام المشائخ دریاگنج دہلی پوسٹ بکس نمبر ۵۱)

نمبر (۱)

ینتِ محفل ہے تو زینت وہ محفل ہے تو   پیکرِ ملت میں اے اقبال مثلِ دل ہے تو
ن سکے قندیلِ تپاں روشن سرِ منزل ہے تو   اپنی کشتی کے لئے امید کا ساحل ہے تو

ڈال دی تیری نوائے آرزو نے زندگی
ملتِ مسلم رہے گی حشر تک ممنوں تری

یرے سوز و ساز نے پائی رسائی دل تلک   تیری آوازِ درا پہنچی ہر اک محفل تلک
دبتوں کو موج بنکر لایا تو ساحل تلک   راہرو کے ساتھ تھی تیری صدا منزل تلک

اس سکوت آباد میں حرفِ نوا تو بن گیا
کارواں بے حس تھا آوازِ درا تو بن گیا

جب تلک درسِ عمل تازہ ترا محفل میں ہے   جب تلک تیرا سرودِ زندگانی دل میں ہے
جب تلک تیرا نشانِ جادۂ منزل میں ہے   تیری لیلائے تمنا جب تلک محمل میں ہے

کر نہ پائے گا نہ مرگِ آرزو برہم ہمیں
مضطرب رکھے گا تیرا جذبۂ پیہم ہمیں۔

نمبر (۲)

شم دل پر تیری روشن ہیں رموزِ زندگی   دوش میں ملتی ہے تجھ کو صورتِ فردا چھپی

تیرے سینہ میں شعاعِ معرفت مستور ہے
تیرا یہ پُر نُور دل رشکِ چراغِ طور ہے!

تو جہاں میں سورہ اخلاص کی تفسیر ہے
سطوتِ فقر کی جیتی جاگتی تصویر ہے

آہ! گلزارِ ادب میں نغمہ پیرائی نہیں
یعنی تجھ تک آج اردو کی پذیرائی نہیں

تیرے نغموں کے لئے ہندوستاں بیتاب ہے
کس لئے پھر سازِ اردو تشنۂ مضراب ہے

گلشنِ اردو میں پھر سے زمزمہ پرداز ہو
محوِ سوز و ساز ہو، گرمِ نوائے راز ہو

اقبال اور اردو

(از جناب این۔ ایچ ہاشمی بی۔اے لکھنؤ یونیورسٹی)

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ تھی
"شمع یہ سودائی دلسوزئِ پروانہ تھی"

"تھی تو روشن ہر جگہ لیکن کہیں بیانہ تھی"
تھے نصیبِ محفلے مے قسمت کا افسانہ تھی

خوبیِ قسمت سے شمعِ بزمِ دنیا بن گئی
یعنی جب اقبال چمکا، یہ ستارا بن گئی

پارسی نغموں میں پوشیدہ ہے گیٹے کی صدا
اور قاآنی بنا ہے ٹیگور کا ہم نوا

فکر غالب کی ہے۔ تو بیدل کی ہے طرزِ ادا
رنگِ عرفی در شرابِ حافظی آمیختہ

مے فرنگی ڈھل رہی ہے ساغرِ شیراز میں
نغمہائے مغربی پنہاں ہیں ہندی ساز میں

ہستیِ اقبال ہے اردو کے حق میں بے بہا
زمزمہ سنجی سے ان کی شور ہے ہر سو بپا

عرش تک پہونچا ہے ان کی شاعری کا غلغلہ[1]
"ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا"

ہستیِ اقبال سے اردو کی دنیا بن گئی
یعنی جب اقبال چمکا، یہ ستارا بن گئی

[1] میرے کے آواز مری تا بفلک جا پہونچی" کی طرف اشارہ ہے "Inverted Comma" میں خود اقبال کے اشعار ہیں۔

اقبال کا ظریفانہ کلام

(از سید فریدہ جعفری - مچھلی شہری)

علامہ اقبال کا ظریفانہ کلام "اکبری اقبال" جس پر مصور فطرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے دیباچہ لکھا ہے جسے وہ تمہید قرار دیتے ہیں اور یہ شاہکار اس چھوٹی سی کتاب کی زینت ہے۔ وہ کہتے ہیں: "میں اقبال کو پیکر خاک نہیں سمجھتا اور اُن کے پتلے کو آدم زاد نہیں جانتا ممکن ہے کہ وہ بشر ہوں مگر اُن کی بشریت فقط ان کے بیوی بچوں یا اُن کے لئے مبارک ہو جو ان کو گوہ اچھا موچھوں والا عقلمند پروفیسر و بیرسٹر کہتے ہیں ———— وہ ازل سے جوان ہیں اور حیاتِ ابدی کے نشان ہیں۔ ہندوستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو مکروہ جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا ہوں جو ہند کے کسی انسان میں نہیں۔ برسات میں مکھیاں اور پروانے دونوں پیدا ہوتے اور دونوں جاندار کہلاتے ہیں مگر ایک آدمی کو ستاتا ہے اور مگس بے حیا کا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے منہ پر قربان ہو جاتا ہے اور عبرت ڈھونڈھنے والوں کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر رلاتا ہے اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو اَن دیکھی شمع کا دیوانہ ہے، مکھیاں اس کے اشعار کو مٹھاس سمجھ کر چاٹتی ہیں اور پروانے شعلہ سمجھ کر قربان ہونے آتے ہیں۔" خواجہ صاحب کی تمہید کے بعد نظم شروع ہوتی ہے جو گویا پھولوں کا ایک گلدستہ ہے۔ ایک مصرع میں موجِ تبسم ہے تو دوسرے میں بحرِ تبسم۔ ایک میں روحِ لطافت ہے تو دوسرے میں روحِ ظرافت ایک میں روحِ فصاحت ہے تو دوسرے میں روحِ بلاغت۔ ایک ادبِ لطیف کی جان ہے تو دوسرا مشرق کا ایمان ایک سے قوم کے فلاح تو دوسرے سے روشِ مغربی پر تنقید۔ جنہیں سے بعض اشعار نیرنگِ خیال کا مصور بصورتِ کارٹون پیش کرتا ہے:۔

کارٹون صفحہ نمبر ۴۰۲ پر ملاحظہ فرمایئے

جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے تجدید کی آنکھ پر عریاں ہیں تیری شاہراہیں زیست کی

گامزن ہے جس طرف تو اپنی منزل ہے یہی

قول ہے جو کچھ ترا جینے کا حاصل ہے یہی

تیری ایلائے تصور ڈھونڈتی ہے وہ جگر جس کے گوشوں میں مکیں ہو آرزو بن کر اثر

جو بہا دے خود کو خوں کر کے بہ شکل اشک تر جس کی تابش خیرہ کر دے اہل عالم کی نظر

جو بنے بن کر بنے مٹ کر بنے تابندہ تر

زندگی ہو جس کے دم سے زندہ تر پایندہ تر

نمبر (۱۳)

آرزو کو تو نے سکھلائی ہیں وہ جولانیاں فکر کو ملتا نہیں تیرے تصور کا نشاں

ہے نہیں رہوار سے پامال نیرنگ جہاں خاک سے لے کر تری پرواز ہے تا آسماں

دہر کا ہنگامہ تجھ کو روک سکتا ہی نہیں

تو کسی دستور کا پابند ہوتا ہی نہیں

ہاں مگر شادابی رفتہ کا دلدادہ ہے تو گلشن ماضی میں ہے گلہائے انسانی کی بو

عظمت رفتہ میں ملتا ہے تجھے شوق نمو مایہ دار زندگی ہے تجھ کو پھولوں کا سبو

ہے ترے سر میں ابھی سودائے شب باقی وہی

تیرا بس ہو گر تو محفل ہو وہی ساقی وہی

نمبر (۱۴)

فخر ہے ہم کو تری اس کاوش ادراک پر جس نے گل بوٹے تصور کے کھلائے خاک پر

جرأتیں قرباں ہیں تیری ہمت بیباک پر آنکھ تاروں کی پھڑکتی ہے کسی کی دھاک پر

دست شکوہ تیرا پہنچا دامن یزداں تلک

اُن کو یہ ڈر ہے پہنچ جائے نہ اک دن یاں تلک

سروری ہے ملتِ اسلام میں خدمتگری
فکر میں اوروں کے گھلنا ہے ہماری زندگی
بادشاہی سے گراں تر ہے ہماری چاکری
ہم بناتے ہیں مٹا کر خود کو دنیا میں نئی
خدمتِ ملت سے تو مخدومِ ملت بن گیا
داستاں میں اپنی ہوگا نام تابندہ ترا

نمبر (۵)

آج پھر ہنگامہ ہائے زندگی ہیں بیقرار
اڑ رہے ہیں چار سو آفات کے رنگیں شرار
آج پھر ہے جوشِ غم سے سینۂ مسلم فگار
چشمِ دل وا ہے پئے لذت کشیِ انتظار
پھر کوئی اُٹھے گا دینے کو ہمیں درسِ اُمید؟
پھر کوئی اقبال آئے گا لئے حرفِ نوید؟

اقبال

(از سید دلبر حسن صاحب جستجو انبالوی متعلم بی اے۔ اسلامیہ کالج لاہور)

اے کہ تو پیکر نگارِ فطرتِ معصوم ہے
تیری پیشانی پہ سرِّ زندگی مرقوم ہے
تیرے ہی دم سے فروزاں ہے چراغِ قومیت
ہے پھلا پھولا ترے فیضان سے باغِ قومیت
افتخارِ ایشیا اصلاً، نازشِ ہندوستاں!!
تو ہے اس بیچارگی میں دولتِ اسلامیاں
سوزِ ملت تیری رگ رگ میں تپش اندوز ہے
تیری ہستی ساز ہے اور تو سراپا سوز ہے
تیرا ہر تارِ نفس گرمِ ستیزِ زندگی
تیری ہر آہِ رسا طوفان خیزِ زندگی
منبعِ علم و عمل، کانِ صفا بحرِ وفا
دشت پیمائے حقیقت، مرشدِ راہِ ہدیٰ

تیرے سینہ میں شعاعِ معرفت مستور ہے — تیرا یہ پُر نور دل رشکِ چراغِ طور ہے!
تو جہاں میں سورۂ اخلاص کی تفسیر ہے — سطوتِ فقر کی جیتی جاگتی تصویر ہے
آہ! گلزارِ ادب میں نغمہ پیرائی نہیں — یعنی تجھ تک آج اردو کی پذیرائی نہیں
تیرے نغموں کے لئے ہندوستاں بیتاب ہے — کس لئے پھر سازِ اردو تشنۂ مضراب ہے

گلشنِ اردو میں پھر سے زمزمہ پرداز ہو
محوِ سوز و ساز ہو، گرمِ نوائے راز ہو

اقبال اور اردو

(از جناب این۔ ایچ ہاشمی بی۔ اے لکھنؤ یونیورسٹی)

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ تھی — "شمع یہ سودائی دلسوزیِ پروانہ تھی"
"تھی تو روشن ہر جگہ لیکن کہیں بیانہ تھی — تے نصیبِ محفلے بے قسمت کاشانہ تھی"

خوبیِ قسمت سے شمعِ بزمِ دنیا بن گئی
یعنی جب اقبال چمکا، یہ ستارا بن گئی

Goethe کا

Heine نے

پارسی نغموں میں پوشیدہ ہے گیٹے کی صدا — اور قاآنی بنا ہے ہائینے کا ہم نوا
فکر غالب کی ہے۔ تو بیدل کی ہے طرزِ ادا — رنگِ عرفی در شرابِ حافظی آمیختہ
مے فرنگی ڈھل رہی ہے ساغرِ شیراز میں — نغمہائے مغربی پنہاں ہیں ہندی ساز میں
ہستیِ اقبال ہے اردو کے حق میں بے بہا — زمزمہ سنجی سے ان کی شور ہے ہر سو بپا
عرش تک پہونچا ہے ان کی شاعری کا غلغلہ — "ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا"
ہستیِ اقبال سے اردو کی دنیا بن گئی — یعنی جب اقبال چمکا، یہ ستارا بن گئی

ؔ "اُفق کے آواز مری تا بفلک جا پہونچی" کی طرف اشارہ ہے "Inverted Comma" میں خود اقبال کے اشعار ہیں۔

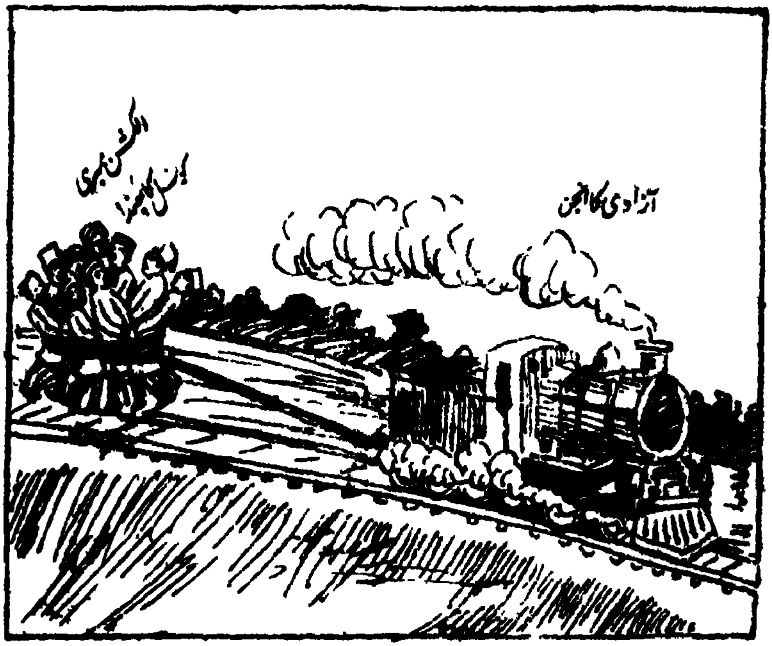
اقبال کا ظریفانہ کلام

(از سید ف۔ سید جعفری۔ مچھلی شہری)

علامہ اقبال کا ظریفانہ کلام "اکبری اقبال" جس پر مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے دیباچہ لکھا ہے جسے وہ تمہید قرار دیتے ہیں اور یہ شاہکار اس چھوٹی سی کتاب کی زینت ہے۔ وہ کہتے ہیں: "میں اقبال کو پیکرِ خاک نہیں سمجھتا اور اُن کے پتلے کو آدم زاد نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ وہ بشر ہوں مگر اُن کی بشریت فقط ان کے بیوی بچوں یا اُن کے لئے مبارک ہو جو ان کو گورا چٹا مونچھوں والا عقلمند پروفیسر و بیرسٹر کہتے ہیں ـــــ وہ ازل سے جوان ہیں اور حیاتِ ابدی کے نشان ہیں۔ ہندوستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو مکروہ جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا ہوں جو ہند کے کسی انسان میں نہیں۔ برسات میں مکھیاں اور پروانے دونوں پیدا ہوتے اور دونوں جاندار کہلاتے ہیں مگر ایک آدمی کو ستاتا ہے اور "مگس بےحیا" کا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے رُخ پر قربان ہو جاتا ہے اور عبرت ڈھونڈنے والوں کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر رُلاتا ہے۔ اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو اَن دیکھی شمع کا دیوانہ ہے، مکھیاں اس کے اشعار کو مٹھاس سمجھ کر چاٹتی ہیں اور پروانے شعلہ سمجھ کر قربان ہونے آتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی تمہید کے بعد نظم شروع ہوتی ہے جو گویا پھولوں کا ایک گلدستہ ہے۔ ایک مصرع میں موجِ تبسم ہے تو دوسرے میں بحرِ تبسم۔ ایک میں روحِ لطافت ہے تو دوسرے میں روحِ ظرافت۔ ایک میں روحِ فصاحت ہے تو دوسرے میں روحِ بلاغت۔ ایک ادبِ لطیف کی جان ہے تو دوسرا مشرق کا ایمان۔ ایک سے قوم کے فلاح تو دوسرے سے روشِ مغربی پر تنقید۔ جنہیں سے بعض اشعار نیرنگِ خیال کا مصور بصورتِ کارٹون پیش کرتا ہے:-

کارٹون صفحہ نمبر ۴۰۲ پر ملاحظہ فرمائیے

آزادی کا انجن



اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت — بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ — نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے



لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی / ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ



روشِ مغربی ہے مدِّ نظر | وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟ | پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ



کالج میں مارڈننگ

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں
پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مارڈننگ



ہندوستانی فقط خریدار

بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط
آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ



کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور
اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ



تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ؟
دفعِ مرض کے واسطے پِل پیش کیجیے!
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے!
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بِل پیش کیجیے!"



وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے
مہذب! تو اے عاشق! قدم باہر نہ دھر حد سے
نہ جرأت ہے نہ خنجر ہے تو قصد خودکشی کیسا؟
یہ مانا دردِ ناکامی گیا تیرا گزر حد سے



کہا میں نے کہ اے جانِ جہاں کچھ نقد دلوا دو
کرایہ پہ منگاؤں گا کوئی افغان سرحد سے

تصویرِ خیالی

احسان بن دانش مصنف حدیثِ ادب

سرِ چرخِ بریں اک رت جگا تھا۔ تھی ہر سو وجد کُن بادِ شمالی
چراغوں کی جگہ روشن تھے تارے۔ بچھی تھی چاند کی سیمیں اُجالی
ترنم ریز تھے حوروں کے بربط۔ جلو میں بلنشیں غلماں دفالی
فضائیں تھیں لبالب مستیوں سے۔ برستا تھا سرورِ لازوالی
نشاط انگیز نغمے چھا رہے تھے۔ تھا ہر اک شے پہ حسنِ لاابالی
نظر شیلے کی گوئٹے کا تجسس۔ عمر خیام کی بیخود خیالی
نظیری کا طلسماتِ تغزل۔ طوسی و قند کی شیریں مقالی
بیانِ میر۔ ٹینیسن کا انداز۔ خیالِ مومن و تعلیمِ حالی
رموزِ حافظ شیراز و حسان۔ اسد اللہ خاں کا فکرِ عالی
نکاتِ درسِ سعدی، طرزِ بیدل۔ امیر و داغ کی نازک خیالی
مہیا سب تھا سامانِ تجمل۔ تخیل سے پرے تھی پائمالی
مجسم تھے شباب انگیز جلوے۔ مکمل تھی بہاروں کی بحالی
غرض، اس بزمِ رقص و شاعری کا پڑا سایہ جو زیرِ عرشِ عالی
ندا آئی، یہیں مسدود ہو جا! وہ پرتو بن گیا بشکلِ ہلالی
نمایاں جس کے خم سے شوقِ سجدہ بخوشی مظہرِ آشفتہ حالی
پھر اس میں روح پھونکی باصد انداز۔ ودیعت کر دیا حسنِ خیالی

جسے احسان سب کہتے ہیں اقبال
یہ ہے اس کی سرشتِ بے مثالی

احسان

علامہ سر اقبال سے

(از جناب شیخ عبدالحمید صاحب شوق بی اے آنرز ہیڈ ماسٹر احمد پیٹھ دکن)

اے کہ تیرے نام کا عالم میں اک آوازہ ہے — اے کہ تیری اک نوا سے عہدِ ماضی تازہ ہے
اے کہ تیرا ہر سخن اسلام کا شیرازہ ہے — تیرا ہر نکتہ رخِ ہندوستاں کا غازہ ہے
تو بھلا اردو سے اب کیوں ہو گیا بیزار ہے؟ — سرد تو نے کر دیا اردو کا کیوں بازار ہے؟
تو زمینِ ہند میں سعدی کا ہم آواز ہے، — تو غنی کا ہم سخن ہے، بلبلِ شیراز ہے
صائب و عرفی کو تجھ پر آج فخر و ناز ہے — مثنوی تیری بھی رومی کا سا اک اعجاز ہے
گیسوئے اردو مگر منت پذیرِ شانہ ہے — شمع یہ سودائیِ دلسوزیِ پروانہ ہے
غرب کو تو نے پیامِ مشرق سر تا سر دیا — اور عجم کو بھی زبورِ زمزمہ پرور دیا
بیخودی کا اور خودی کا راز بھی حل کر دیا — اور مئے عرفاں سے جامِ ایشیا بھی بھر دیا
مسلمِ ہندی مگر پھر آج تشنہ کام ہے — وقف اوروں کے لئے تیرا بھلا کیوں جام ہے
محفلِ ہندوستاں سے فارسی داں اٹھ گئے — اٹھ گئے سارے گرامی سے غزلخواں اٹھ گئے
اٹھ گیا آزاد اور اس کے سخنداں اٹھ گئے — غالب و بیدل سے خوش گفتار انساں اٹھ گئے
فارسی سے سرزمینِ ہند اب بیگانہ ہے — شمعِ اردو کا بنا ہر ایک اب پروانہ ہے
بد مذاقی سے غزل ہے اپنی دنیا میں ذلیل — اور کہلاتا ہے ہم میں ہر قصیدہ گورِ ذیل
نیچرل گو آپ ہے اپنی خرابی کی دلیل — کچھ نکلنے کی نہیں قعرِ مذلت سے سبیل
ہاں مگر تیرے قلم میں جوہرِ اکسیر ہے — اک تری بانگِ درا صد نعرۂ تکبیر ہے

۱ حافظ شیراز ۲ مثنوی اسرار و رموز ۳ خود حضرت اقبال کا شعر غالب کے متعلق بہ تصرف خفیف۔
۴ پیام مشرق ۵ زبور عجم ۶ رموز بیخودی ۷ اسرار خودی ۸ فلسفۂ ایران کے متعلق انگریزی تصنیف کی طرف اشارہ ہے
۹ مولوی غلام قادر گرامی ہوشیارپوری ۱۰ محمد حسین آزاد مرحوم کی تصنیف سخندانِ پارس ۱۱ یعنی اردو کلیات اقبال